کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا
دلچسپ معلوماتی اور تجزیاتی سفرنامہ

www.Inzaar.org

www.Inzaar.pk

MAKKAH

MADINA

SINGAPORE

THAILAND

MALAYSIA

AMERICA

SRILANKA

CANADA

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free. www.inzaar.org ,www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook
Abu Yahya's Official Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar
Inzaar Official Page: www.facebook.com/inzaartheorg

Whatsapp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from Whatsapp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

Join us on Youtube @ youtube.com/inzaar-global

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to info@inzaar.org and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD
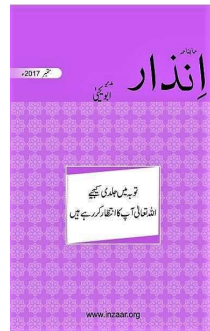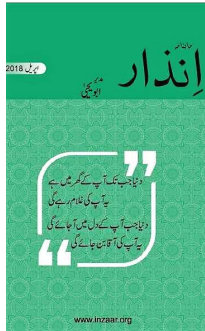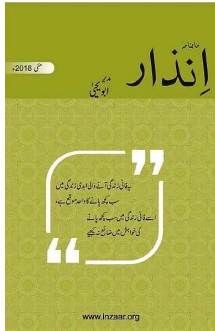
ماہنامہ انذار

مدیر: ابویحییٰ

ماہنامہ انذار ایک دعوتی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کے لیے ان نمبروں پر رابطہ کیجیے۔

0345-8206011 or 0332-3051201

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے
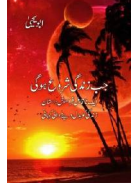
قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی
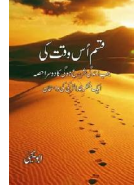
آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ
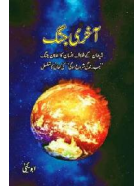
خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں
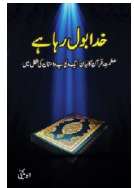
پورا سیٹ منگوانے پر خصوصی رعایت

گھر بیٹھے کتب حاصل کرنے کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کیجیے

0332-3051201 , 0345-8206011

www.inzaar.pk

مالی تعاون

اللہ تعالیٰ کے پیغام (ایمان و اخلاق، تعمیرِ شخصیت اور فلاحِ آخرت) کو پھیلانے میں انذار کا ساتھ دیجیے۔

ہمارا مالی طور پر ساتھ دینے کے لیے درج ذیل اکاؤنٹ میں عطیات جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

For Local Transaction

Title of Account: Inzaar Educational and Charitable Trust

Address: P.O.BOX.7285 Karachi.

Bank Name: United Bank Limited

Branch Address: UBL Vault Branch, Abdullah Haroon Road, Saddar, Karachi.

Account Number: 0080248866323

Branch Code: 0080

For Foreign Transaction

IBAN: PK32 UNIL 0109 0002 4886 6323

SWIFT CODE: UNILPKKA

عطیات جمع کرنے کے بعد

0092-345-8206011 یا info@inzaar.org یا info@inzaar.pk پر ہمیں مطلع کریں تاکہ اس کی رسید آپ کو بھیجی جا سکے۔

رضاکارانہ تعاون

انذار کے لئے رضاکارانہ تعاون فراہم کرنے کے لئے براہ مہربانی ذیل میں درج ای میل ایڈریس پر ای میل بھیجیں۔ info@inzaar.org , info@inzaar.pk

اپنی پیاری امی کی اُس بے انتہا شفقت کے نام جس کے لمس نے مجھے
کبھی بھی، کہیں بھی تنہا نہیں چھوڑا۔

رت جگے کاٹ کے جس نے مجھے بخشی ہے حیات
اس کا چہرہ مری راتوں کے اندھیروں کا چراغ
(پروین سلطانہ حناؔ)

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھول آنکھ زمیں دیکھ

''کھول آنکھ زمیں دیکھ''، میرے دو سفرناموں کا مجموعہ ہے۔ پہلا سفرنامہ اس وقت لکھا گیا تھا جب میں کینیڈا کی شہریت ترک کر کے سن 2001 میں پاکستان آیا تھا۔ کینیڈا کے اس سفر میں میں امریکہ، سعودی عرب اور سری لنکا بھی گیا تھا۔ دوسرا سفرنامہ سن 2008 میں جنوب مشرقی ایشیا کے تین ملکوں ملائیشیا، سنگاپور اور تھائی لینڈ کے سفر کے موقع پر لکھا گیا۔ یوں مجموعی طور پر اس سفرنامے میں سات ملکوں کے سفر کے احوال شامل ہیں۔

میں نے ان تمام اسفار میں ان ممالک کے قابل دید مقامات کو ایک سیاح کی نظر سے اور وہاں کے نظام زندگی اور تہذیب کو ایک طالب علم کے طور پر دیکھا۔ ہر خوبی کی بلا تعصب تعریف کی اور ہر قابل تنقید چیز کو نشانہ بنایا۔ ہر جگہ ایک دردمند دل کے ساتھ اپنی قوم اور ملت سے اغیار کا موازنہ بھی کیا۔ ساتھ میں مغربی فکر و تہذیب کی کمزوریوں اور دین اسلام کی فکری قوت کو بھی ہر مقام پر نمایاں کیا۔

میں طبعاً ایک داعی ہوں اور بحیثیت داعی یہ چاہتا ہوں کہ ایک عام شخص تک میرے افکار پہنچیں۔ یہی سبب ہے کہ میرے قلم نے ابلاغ کے لیے سفرنامے کا وہ قالب اختیار کیا جو عام طور

پر قارئین بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔تاہم اس میں جگہ جگہ وہ سب کچھ ہے جسے میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

میری زندگی کا مقصد ایمان واخلاق کی دعوت کو زندہ کرنا ہے۔ساتھ میں میری خواہش ہے کہ میری قوم دنیا کی ایک ترقی یافتہ قوم بنے۔قومی ترقی اور تعمیر کا یہ کام تب ہی ہوگا جب ہم حقیقت پسند بنیں گے۔اعلیٰ اخلاقی اقدار کی پیروی ہماری پہچان بن جائے گی۔ہم کرپٹ لوگوں کے بجائے دیانت دار اور باشعور لوگوں کو اپنا لیڈر منتخب کریں گے۔ہم متعصب،منفی اور جذباتی انداز فکر رکھنے والی فکری قیادت کے بجائے مثبت اور معقول لوگوں کی بات سنیں گے۔

میں نے اس سفرنامے میں دوسری اقوام کے پس منظر میں اپنے لوگوں کی کچھ ایسی ہی چیزوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ حقیر کوشش انشاءاللہ قوم میں ایک مثبت ذہن اور سوچ کے فروغ کا ذریعہ بنے گی۔

ابو یحییٰ

شب جمعہ

13 نومبر، 2014

کینیڈا براستہ سری لنکا

کہاں لے جائے گا یہ شوقِ انفرادیت

آج کل لوگوں کو نت نئے اور منفرد نام رکھنے کا شوق بلکہ خبط ہو گیا ہے۔ یہ شوق اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اگر کوئی اپنے بچے کا نام پرانے ناموں میں سے رکھتا ہے تو شبہ ہوتا ہے کہ اس نے یہ نام اِس کے عدمِ استعمال کی بنا پر رکھا ہے۔ نام پرانا ہے تو کیا ہوا منفرد تو ہے۔ نئے نام رکھنے کے سلسلے میں بعض اوقات لطیفے بھی پیش آ جاتے ہیں۔ مثلاً کسی کے بارے میں سنا کہ انہوں نے اپنی دخترِ نیک اختر کا نام ''فارہ'' رکھا۔ نام بلاشبہ نیا، خوبصورت اور مختصر ہے مگر بدقسمتی سے اس کے معنی چوہیا کے ہوتے ہیں۔

یہ ساری تمہید میں نے ان خاتون کی بنا پر باندھی ہے جو ایئرپورٹ کے ویٹنگ لاؤنج میں اپنے بچے کے ہمراہ موجود تھیں۔ وہ خاتون اپنے بچے کو مومن کے نام سے پکار رہی تھیں۔ مجھے نام اور اس کی معنویت پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس سے تو ان کے جذبۂ ایمانی کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر وہ مسلم، پاکستانی خاتون جو غالباً اب مستقل طور پر امریکا یا کینیڈا میں مقیم تھیں، اپنے لباس کے اعتبار سے کسی غیر مومن کی ماں لگ رہی تھیں۔ ایمان کا ایسے لباس سے کوئی ملاپ نہیں۔ مومن خواتین کا ڈریس کوڈ (Dress Code) تو مومنوں کے رب نے، اصول کی حد تک، خود طے کر دیا ہے۔ جسے دیکھنا ہو سورۃ النور میں دیکھ لے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایسی ہی ایک خاتون سے امریکا جاتے ہوئے واسطہ پڑا۔ وہ اپنی بچی کے ہمراہ کینیڈا سے امریکا جارہی تھیں۔ انہوں نے جینز کی پتلون کے ساتھ ایک بنیان پہن رکھی تھی۔ لباس کو چھوڑ کر وہ ایک مشرقی خاتون معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اپنی بچی سے بہت شستہ اردو میں گفتگو کررہی تھیں اور جب کچھ عیسائی ہمسفروں سے میری معرکہ آرائی ہوئی (جس کی تفصیل آپ سفرِ امریکا میں ملاحظہ فرمائیں گے) تو اسے انہوں نے بڑی توجہ سے سنا۔ لیکن ان کی مذہب پسندی کا اصل اندازہ ان کی بچی کے نام سے ہوتا تھا جو قرآن سے لیا گیا تھا۔ اپنی بچی کو وہ ''نحل'' کے نام سے پکار رہی تھیں۔ جو لوگ نہیں جانتے ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ نحل عربی زبان میں شہد کی مکھی کو کہتے ہیں۔

جہاز اور اونٹ

لاؤنج میں بیٹھ کر میں لوگوں کو جہاز کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں، اپنی دانست میں ڈالر بچانے کے لیے، کئی دفعہ گھر پر فون کر کے بات کی۔ کیونکہ جو کال ابھی 5 روپے میں ہورہی تھی اگلے دن سے 5 ڈالر میں بھی نہیں ہونی تھی۔ جب لوگوں کا رش ختم ہوگیا اور فائنل کال دے دی گئی تو آخری چیکنگ سے گزر کر میں بھی جہاز میں داخل ہوگیا۔ میری اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اگلے 24 گھنٹے جہاز کے پیٹ میں گزارنے تھے۔ جہاز کا سفر اگر مختصر ہو تو خوشگوار ہوتا ہے۔ لیکن یہ سفر اگر چند گھنٹوں سے بڑھ جائے اور سفر بھی پی آئی اے سے کیا جارہا ہو تو بہت تکلیف دہ ہوجاتا ہے۔ تاہم میں نے اس مشکل سے نپٹنے کا ایک راستہ یہ نکالا کہ خود کو تصور میں، ہزاروں میل کا یہ سفر اونٹ پر کرتے ہوئے دیکھا۔ ایسا کرنے کے بعد بے اختیار خدا کی اس عظیم نعمت کا احساس ہوا جو جہاز کی شکل میں میرے سامنے تھی۔ اگر آپ میرے اس تجربے کی معنویت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ذرا ساحل سمندر پر جا کر صرف آدھے گھنٹے تک دوڑتے اونٹ کی

سواری کرلیجیے۔ آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ ماضی میں لوگ جب اس چولیں ہلا دینے والے تجربے سے گزرتے ہوں گے تو ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ جدید سائنسی ترقی کے ذریعے سے خدا نے انسانوں کو کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے مگر انسان شکر گزاری کے بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔

روانگی

جہاز میں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی مگر آغازِ سفر کا کوئی نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔ کافی دیر بعد پائلٹ نے اعلان کیا کہ یہ تاخیر کارگو لوڈنگ کی بنا پر پیش آرہی ہے۔ اس جملے کا مطلب بظاہر یہ تھا کہ جہاز والوں کو اچانک معلوم ہوا کہ جہاز پر سامان بھی لوڈ ہونا ہے۔ آخر خدا خدا کرکے جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا۔ اتنے طویل سفر میں تاخیر اور وہ بھی جہاز میں بٹھا کر ایک بڑی بھیانک سزا ہے۔ میں اسی طوالت سے بچنے کے لیے سب سے بعد میں اندر داخل ہوا تھا مگر شاید جہاز والے میری اس ''سہل پسندی'' پر زیادہ خوش نہیں تھے اور انہوں نے مجھ سے حساب چکا لیا۔

جہاز کے حرکت میں آنے کے ساتھ ہی قاری وحید ظفر قاسمی کی خوبصورت آواز میں دعا سنائی گئی۔ بہت بہتر ہوتا کہ اس کا ترجمہ بھی سنا دیا جاتا کیونکہ جہاز میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جن کے شعور نے اس دعا سے کچھ حاصل کیا ہوگا۔ جب شعور ہی نے کچھ حاصل نہ کیا تو اس دعا کا کیا فائدہ؟ دعا مانگتے وقت آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ کیا مانگ رہا ہے تو یہ بات ایک لطیفے سے کم نہیں ہے۔ جہاز میں صرف سواری پر بیٹھنے کی قرآنی دعا سنائی گئی تھی۔ تاہم میں نے ذاتی طور پر وہ تمام دعائیں پڑھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آغازِ سفر کے وقت منقول ہیں۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں غیر معمولی تاثیر کی حامل ہیں۔ ان دعاؤں کی

اس قدر گہری تاثیر کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہ دعائیں بالفظ ہم تک پہنچی ہیں جبکہ دیگر احادیث میں اکثر صرف بات کے معنی منتقل کیے گئے ہیں۔یعنی یہ دعائیں ٹھیک انہی الفاظ پر مشتمل ہیں جو عرب وعجم کے سب سے فصیح انسان اور خدا کے سب سے بڑے عارف جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے۔ان میں عبدیت، توکل، یقین، ایمان اور معرفت کی جو کیفیات نظر آتی ہیں ان کا حقیقی اندازہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عربی زبان سے واقف ہوں مگر اِن کا ترجمہ سنانا بھی یقیناً بے حد مفید ثابت ہوگا۔

مانچسٹر میں

جہاز اڑنے کے ساتھ ہی میں نے واش روم کا رخ کیا۔میرا مشورہ ہے کہ اگر آپ کو ضرورت نہیں تب بھی ضرورت پیدا کر کے شروع ہی میں باتھ روم چلے جایا کریں۔ وگرنہ تھوڑی دیر میں وہ اس قدر متعفن ہو جاتا ہے کہ وہاں جانا ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ جہاز میں جانے سے قبل ویٹنگ لاؤنج کے صاف ستھرے اور کشادہ واش روم سے فارغ ہو کر آیا جائے۔

ہمارا جہاز اسلام آباد رکا جہاں مزید مسافر سوار ہوئے یہاں تک کہ جہاز بالکل بھر گیا۔ میری سمجھ میں یہ طریقہ نہیں آتا کہ کراچی سے جہاز اسلام آباد اور لاہور کیوں لے جایا جاتا ہے جبکہ جس سمت میں ہم جارہے ہیں اس طرف کراچی بعد میں پڑتا ہے۔ چند ماہ قبل جدہ سے آتے وقت بھی ان لوگوں نے یہی کیا تھا کہ ساڑھے تین گھنٹے میں کراچی آنے والی فلائٹ کو پانچ گھنٹے میں پہلے اسلام آباد لیکر گئے اور پھر واپس کراچی لائے۔خدا جانے اس میں کیا مصلحت ہے۔

اسلام آباد میں ایک دفعہ پھر جہاز کافی دیر تک کھڑا رہا۔آخر کار رات دو بجے جہاز روانہ ہوا۔مجھے جہاز میں نیند نہیں آتی۔اس کے توڑ کے لیے میں نیند کی گولی جیب میں رکھ کر لایا تھا۔

اسے لینے کے بعد چند گھنٹے کی کچی پکی نیند مل گئی۔ ہمارا جہاز نو گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد برطانیہ کے شہر مانچسٹر میں اترا۔ یہاں صبح سات بجے کا وقت تھا۔ ہمیں ٹرانزٹ لاؤنج میں جانے کی اجازت مل گئی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ٹانگیں سیدھی کرنے کا موقع مل گیا جو 13 گھنٹے سے بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں۔ چنانچہ میں لاؤنج میں ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے وہاں گھومتا رہا۔

یہ ایک وسیع ہال تھا جس میں بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ان میں ہر قسم کی اشیا بکثرت دستیاب تھیں۔ تاہم خریداری کرنے والے کم تھے جس کا سبب غالباً زیادہ قیمت تھی۔ ٹیلیفون بوتھ تھے جن سے دنیا بھر میں فون کیا جاسکتا تھا۔ صاف ستھرے واش رومز تھے۔ اس وقت درجۂ حرارت چھ ڈگری تھا مگر پھر بھی اندر اے سی چل رہا تھا۔ بیشتر لوگوں نے جیکٹس پہن رکھی تھیں۔ یہاں آ کر مغربی تہذیب کے اس پہلو کا ساتھ شروع ہوا جس سے آنے والے دنوں میں کہیں بھی پناہ نہیں مل سکی۔ یعنی خواتین کی کم لباسی۔ گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے اکثر دکانوں پر خواتین کی تقریباً عریاں تصویریں، اشتہار کے نام پر، کثرت سے آویزاں کی گئی تھیں۔

یہ قصہ ہے جب کا......

مانچسٹر سے روانگی پر پائلٹ نے اعلان کیا کہ جہاز 6 گھنٹے میں نیویارک پہنچے گا۔ رات کا سفر تو جیسے تیسے نیند کی گولی نے کٹوا دیا اور میں نیند کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا رہا تھا۔ مگر میں نیند کی گولی دوبارہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب دن میں کیا کروں۔ چنانچہ اس دفعہ میں نے ماضی کا دروازہ کھول کر یادوں کی وادی میں بھٹکنا شروع کر دیا۔ میرے سفر کی یہ داستان اس وقت شروع ہوئی جب میں اس اسلامک اسٹڈیز اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں ماسٹرز کا امتحان دیکر فارغ ہوا تھا۔ اس دوران میں عمرے کے لیے سعودی عرب گیا تو وہاں جا کر پہلی دفعہ لوگوں میں کینیڈا جانے کا رجحان دیکھا۔ تاہم میں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ مجھ پر اس زمانے میں

ملک وقوم کی خدمت کا بھوت سوار تھا۔حتیٰ کہ اُسی سفر میں مجھے ایک اچھی جاب کی پیشکش بھی ہوگئی لیکن میں وہ بھی چھوڑ کر آ گیا۔ بعد میں یہ بھوت قوم نے خود ہی جوتے مار مار کر اتار دیا۔اب میں اس کی تفصیل کیا بیان کروں۔اپنے زخم کریدنا کوئی پرلطف کام نہیں اس لیے اس ذکر کو جانے ہی دیں تو بہتر ہے۔قصہ مختصر یہ کہ عمرے سے واپسی کے بعد پے در پے ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ میں نے ملک،قوم اوران کی خدمت تینوں پرلعنت بھیجی اور اپنے بڑے بھائی رضوان کے کہنے پر جنہیں اسی وقت امیگریشن ملی تھی،کینیڈا کی امیگریشن کا فارم بھر دیا۔انھوں نے کینیڈا جانا تھا نہ گئے لیکن میرے سفر کا سبب بن گئے۔

قوم اور نبی

کینیڈا کی امیگریشن کے لیے کینیڈا سے باہر کسی بھی ملک میں کینیڈین ایمبسی میں درخواست دی جاسکتی ہے۔میں نے اپنی درخواست سری لنکا بھیجی۔مگراس زمانے میں وہاں کافی رش ہوگیا تھا۔لہٰذا میرا انٹرویو جو نو ماہ میں متوقع تھا غیر معینہ عرصے کے لیے آگے چلا گیا۔ مجھے اس دوران اپنے لوگوں کی پست کرداری، بداخلاقی، مفاد پرستی،تعصب، منافقت اور بے ایمانی کے اتنے پہلوؤں سے واسطہ پڑ چکا تھا کہ میرا ایک لمحے کے لیے بھی پاکستان میں رکنا مشکل ہوگیا۔ چنانچہ جیسے ہی پہلا موقع ملا، میں ملازمت کے لیے سعودی عرب چلا گیا۔

آج جب ان واقعات پر کئی برس گزر گئے ہیں اور انسانوں کے ہاتھوں لگائے ہوئے زخم خدانے اپنے مرہمِ عنایت سے مندمل کر دیے ہیں مجھے اپنی قوم پر غصہ نہیں افسوس ہوتا ہے۔ مجھے اللہ کریم نے اپنے پڑوس میں کئی سال رکھا۔وہاں خدا کی عنایتوں کے درمیان، مکے اور مدینے کی گلیوں میں، ایک بہت بڑی بات میں نے سیکھی۔وہ یہ کہ نبیوں کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ قوم کی دی ہوئی تکلیفوں پر انہیں بددعائیں دیں یا انہیں برا بھلا کہیں۔ وہ دن میں ان کی ہدایت کے لیے

کوشاں رہتے ہیں اور رات میں ان کے لیے اپنے رب کے حضور بخشش کی درخواست کرتے ہیں۔ وہ ہر تکلیف کے جواب میں بس اتنا کہتے ہیں ''جو اذیت تم ہمیں دے رہے ہو ہم اس پر صبر کریں گے''، (ابراہیم 12:14)۔

سری لنکا کا سفر

سعودی عرب جا کر میں بھول ہی گیا کہ میں نے کینیڈین امیگریشن کے لیے اپلائی کر رکھا ہے۔ تاہم تقریباً ڈھائی سال بعد میرے انٹرویو کی کال آ گئی۔ میں نے براستہ کراچی سری لنکا جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ کراچی میں مجھے میڈیکل کرانا تھا۔ میں جنوری کے سرد مہینے میں کراچی پہنچا اور میڈیکل کروا کے دو دن بعد سری لنکا کے لیے روانہ ہوا۔

پی آئی اے سے میرا فلائٹ شیڈول کچھ اس طرح تھا کہ انٹرویو سے قبل میرے پاس پانچ دن بالکل فارغ تھے اور چھٹے دن انٹرویو تھا۔ اسی رات بارہ بجے واپسی کی فلائٹ تھی۔ میں نے ان پانچ دنوں کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے بڑے بھائی رضوان کا انٹرویو بھی یہیں ہوا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ان کی شادی ہوئی تھی اور انھوں نے انٹرویو کے اس سفر کو ہنی مون کا سفر بھی بنا دیا تھا۔ بندے کو شادی کے ابتدائی دنوں میں ویسے بھی ہر چیز اچھی لگتی ہے حتیٰ کہ بیوی بھی۔ لہٰذا واپسی پر انھوں نے سری لنکا کے فطری حسن کی بے حد تعریف کی تھی۔ جسے سن کر مجھے بھی اسے دیکھنے کا بہت اشتیاق ہو گیا تھا۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانے میں جدہ آفس کا میرا ایک سری لنکن کولیگ ناصر چھٹیوں پر وہاں آیا ہوا تھا۔ اس کی رہائش کینڈی کے پرفضا شہر میں تھی۔ اس نے میرے لیے پہلے سے ایک گاڑی اور گائڈ بک کر رکھے تھے۔ گائڈ کا نام رازق تھا اور ہمیں اس سے کینڈی کے شہر میں ملنا تھا۔ تاہم ناصر مجھے ایئر پورٹ پر لینے کے لیے کینڈی سے کولمبو آیا تھا۔

سری لنکا کا ''ناک نقشہ''

اگر آپ دنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو بحرِ ہند میں، بھارت کے جنوب میں اس سے بالکل متصل، سری لنکا ایک ناشپاتی نما چھوٹے سے جزیرے کی شکل میں نظر آئے گا۔ سری لنکا پاکستان سے قریب ہے، جہاز کا کرایہ کم ہے اور پاکستانیوں کے لیے ویزا نہیں ہے (افسوس کہ اب یہاں بھی ویزے کی شرط لگ گئی ہے)، اس لیے ایک زمانے میں کینیڈین امیگریشن کا انٹرویو دینے والوں کے لیے یہ آئیڈیل جگہ تھی۔ مگر بعد میں رش کی بنا لوگوں نے یہاں اپلائی کرنا چھوڑ دیا۔ تاہم گھومنے پھرنے اور ہنی مون منانے والوں کے لیے یہ آج بھی ایک بے حد پر کشش جگہ ہے۔ ایک زمانے میں پاکستانی فلمساز بھی اپنی فلموں کی شوٹنگ کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا جزیرہ فطرت کے حسن کا شاہکار ہے۔ دنیا میں کم ہی جگہیں ایسی ہوں گی جہاں حسنِ فطرت اتنے چھوٹے علاقے میں اس قدر مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہو۔

انتہائی طویل اور خوبصورت بیچز (Beaches) جہاں ایک طرف تاحد نظر بحرِ ہند کا نیلگوں پانی ہے اور دوسری طرف میلوں پھیلا ہوا ریتلا ساحل جو ناریل اور پام کے بلند و بالا درختوں سے پٹا ہوا ہے۔ سطحِ سمندر سے ہزاروں فٹ بلند فلک بوس پہاڑ ہیں جہاں تپتی ہوئی گرمیوں کی دوپہر بھی خنک ہو جاتی ہے۔ بڑی بڑی حسین جھیلیں ہیں جن کا خاموش اور پر سکون پانی اور ارد گرد کا سر سبز ماحول انسان کے ذہن کو تراوٹ اور آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتا ہے۔ وسیع اور گھنے جنگلات اور ان میں پائی جانے والی جنگلی حیات جو سیاح کو فطرت سے ہمہ وقت قریب رکھتی ہے۔ بارشوں کی کثرت کی بنا پر نمودار ہونے والی ہریالی جو ہر جگہ آپ کے ساتھ ساتھ جائے گی۔ پھر ان سب کے ساتھ بدھ مت کی قدیم ثقافت اور آثار کی شکل میں سفرِ سیاحت کی ایک بہت بڑی کشش بھی یہاں موجود ہے۔

میرے ذہن پر انٹرویو کا خوف تھا اور نہ اس کی تیاری کی فکر۔ لہٰذا میں نے یہ پورا عرصہ گھومتے گھماتے گزارا۔ پانچ دنوں میں تقریباً تمام اہم اور قابلِ دید مقامات دیکھ لیے۔ اپنی گاڑی اور گائڈ ساتھ تھے اس لیے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ ہم نے سفر کا آغاز کولمبو سے کیا۔ پھر کینڈی کو مرکز بنا کر اردگرد کے تمام اہم مقامات کو دیکھا۔ جن میں یہاں واقع دنیا کا سب سے بڑا نباتاتی گارڈن (Botanical Garden)، وکٹوریہ ڈیم، اور ہنا فالز قابلِ ذکر ہیں۔ ان جگہوں پر گھومتے ہوئے بار بار ''وہ باغ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی'' کے قرآنی الفاظ ذہن میں گونجتے رہے۔ دراصل یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے جہاں بارشوں کی کثرت نے نہ صرف پورے علاقے کو وسیع وعریض باغ میں تبدیل کر دیا ہے بلکہ پہاڑوں کے دامن میں جگہ جگہ جھیلیں، دریا اور نہریں بھی رواں کر دی ہیں۔

ہماری اگلی منزل سِگریا کا حسین مقام تھا جسے میں اپنے سفر کا حاصل سمجھتا ہوں۔ یہ کئی سو میٹر بلند ایک پہاڑ ہے جس کے چاروں طرف گھنا جنگل ہے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک قدیم شہر کے کچھ آثار ہیں۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے بارش ہو رہی تھی۔ پہاڑ کے دامن تک پہنچنے کے لیے جنگل سے ایک راستہ نکلتا ہے جو کئی کلو میٹر لمبا ہے۔ ہم نے گاڑی پارک کی اور اس راستے پر دو تین گھنٹے پیدل چل کر پہاڑ کے دامن تک پہنچے۔ اوپر چڑھنے کے لیے پہاڑ کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ یہ بہت بلند چڑھائی تھی مگر ہم جوش میں ان پر چڑھتے چلے گئے اور آخر کار چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہاں ایک قدیم قلعے کے کھنڈرات تھے جو پانچویں صدی عیسوی میں کسی بدھ حکمران نے تعمیر کروایا تھا۔ اردگرد کا منظر اس قدر خوبصورت تھا کہ حد نہیں۔ چاروں طرف میلوں تک پھیلا ہوا جنگل، ابر آلود موسم اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے ایسا تاثر پیدا کیا کہ گھنٹوں پیدل چلنے اور اس بلند

پہاڑ پر چڑھنے کی مشقت لمحوں میں کافور ہوگئی۔ اونچائی سے نیچے جنگل میں چلتے ہوئے ہاتھی بالکل بچوں کے کھلونے لگ رہے تھے۔ اتنی بلندی کی وجہ سے دور دور تک کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں کچھ یورپین سیاح بھی آئے ہوئے تھے اور ''اپنے طریقے'' سے اس دلکش ماحول کو انجوئے کر رہے تھے۔ ہم کافی دیر تک وہاں رہنے کے بعد واپس ہوئے۔

سِگر یا کے راستے میں ایک بدھ مندر جانا ہوا جس میں بدھا کی مورتیوں کے علاوہ جنت اور جہنم بھی بنائی گئی تھیں۔ ان میں داخلے کی فیس تھی جس پر میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جنت کی فیس کی بات تو ٹھیک ہے یہ جہنم کی داخلہ فیس کس بات کی مانگ رہے ہیں۔ بہرحال فیس دیکر ہم اندر داخل ہوئے۔ جہنم میں مختلف گناہوں مثلاً زنا وغیرہ کی سزا، مجسمہ سازی کے ذریعے دکھائی گئی تھی اور کافی متاثر کن تھی۔ البتہ جنت بالکل بے رونق تھی۔ وہاں حور تھی نہ قصور، شراب تھی نہ ان کو پیش کرنے والے غلمان۔ بس دو چار بیل بوٹے لگے ہوئے تھے۔ اس روز ہمیں پتا چلا کہ بدھ مت کے پیروکاروں کے کم ہونے کا ایک سبب ان کی جنت کا اتنا بے رونق ہونا ہے۔ ویسے قارئین کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ بدھ مت کے پیروکار خدا کو نہیں مانتے۔ یہ لوگ گوتم بدھ ہی سے کام چلاتے ہیں۔ اور گوتم بدھ، اپنی وفات کے بعد، ایسی جنت بھی بنالیں تو بڑی بات ہے۔ بہرحال ہمارا دل اس جنت میں نہ لگا اس لیے وہاں سے فوراً باہر آ گئے۔

ہماری اگلی منزل انورادھا پورا کا شہر تھا جو بدھ مت کے ماننے والوں کا سب سے مقدس مقام ہے اور شمال کی سمت آخری پرامن علاقہ ہے۔ یہاں، روایات کے مطابق، اس درخت کی شاخ سے لگایا گیا درخت ہے جس کے نیچے گوتم بدھ کو جو اپنی بیگم یشودھرا اور کپل وستو ریاست کے تخت وتاج سب کو چھوڑ آئے تھے، نروان ملا تھا۔ یہ درخت ایک بڑے مندر کے احاطے میں تھا اور کافی بڑا تھا۔ زائرین انتہائی عقیدت سے وہاں آتے اور پارکنگ سے مندر تک کا طویل راستہ

ننگے پاؤں طے کرتے۔ ہم کچھ دیر رکنے کے بعد وہاں سے لوٹ آئے۔ راستے میں سری لنکا کی سب سے بڑی جھیل بھی پڑی مگر یہاں ہونے والی انتہائی تیز بارش اور طوفانی ہوا نے ماحول کو خاصا دہشتناک بنا دیا تھا۔ اس لیے ہم تھوڑی دیر رک کر آگے بڑھ گئے۔

اب ہم نے سری لنکا کے سب سے مشہور تفریحی مقام نواریلیا کا رخ کیا۔ یہ ایک ہل اسٹیشن ہے۔ جہاں پہاڑوں پر بل کھاتی ہوئی سڑک ہمیں غیر محسوس طریقے سے اونچائی پر لے گئی۔ اس سڑک کے ایک طرف پہاڑ تھا اور دوسری طرف اتنی گہری کھائی کہ انسان نیچے دیکھے تو چکر آ جائے۔ یہ کافی خوبصورت جگہ تھی البتہ یہاں موسم بہت ٹھنڈا تھا۔ تاہم اس وقت تک میں اس طرح کے سبزے اور پہاڑوں کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ یہاں آ کر کوئی گہرا تاثر پیدا نہ ہوا۔ یہاں سے مشہور آدم ہائٹ کو راستہ جاتا ہے۔ یہ ایک بلند پہاڑ ہے جہاں مشہور ہے کہ حضرت آدم کے قدموں کے نشان ہیں۔ اسی طرح سری لنکا اور ہندوستان کے درمیان حائل سمندر میں خشکی کے قطعات ہیں جنھیں ہندی دیو مالا کے مطابق راما سیتو یعنی رام کا پل اور مسیحی روایت کے مطابق آدم کا پل (Adam Bridge) کا نام دیا جاتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ حضرت آدم اسی پل کو عبور کر کے یہاں پہنچے اور اللہ کے حضور توبہ کی۔ ظاہر ہے کہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں۔ مگر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ جس جگہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو رکھا وہ جگہ سری لنکا ہو۔ بلاشبہ یہ جگہ جنت کے نقشے پر پوری اترتی ہے۔

میرا انٹرویو قریب آ گیا تھا اس لیے ہم نے کولمبو کا رخ کیا۔ مگر کینڈی کے پہاڑی علاقے کے بجائے اس دفعہ ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ چلنے والے راستے کا انتخاب کیا۔ راستے میں پہاڑ سے اترتے وقت ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہم ایک جگہ گاڑی دھلوانے کے لیے رکے۔ یہاں ایک خوبصورت آبشار بہہ رہی تھی۔ ناصر اور میں نے اس کے نیچے کھڑے ہو کر تصویر

بنوائی۔ یہاں سنہالی زبان میں کچھ لکھا تھا جو ناصر نہ پڑھ سکا۔اس کی زبان تامل تھی۔ بعد میں رازق نے آ کر بتایا کہ یہاں لکھا ہے کہ اس جگہ 28 افراد وہی کچھ کرتے ہوئے ڈوب کر مر چکے ہیں جو آپ کر رہے تھے۔

ہم ساحل کے ساتھ ساتھ کولمبو کی طرف چلتے گئے۔کئی جگہ سمندر کے کنارے رک کر سری لنکا کے طویل وحسین ساحل کا منظر دیکھا۔ایک جگہ بہت غیر معمولی تھی جسے (Blow Hole) کہا جاتا ہے۔اس جگہ سمندر سے متصل ایک پہاڑ ہے جس میں غالباً کسی زلزلے کی بنا پر ایک شگاف بن گیا ہے جو پہاڑ کے کافی اندر تک چلا گیا ہے۔ جب لہریں آتی ہیں تو سمندری پانی یہاں سے اندر چلا جاتا ہے اور اندر جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ اندر پانی کا دباؤ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ یہ پانی پوری قوت سے واپس لوٹتا ہے۔ جبکہ سامنے سے بھی تیز لہریں آ رہی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں پانی پوری طاقت سے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں پانی اس شگاف سے ایک فوارے کی طرح کافی بلندی تک اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ یہ قدرتی فوارہ بلاشبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

کولمبو پہنچنے سے قبل گال شہر آیا جہاں کا قلعہ کافی مشہور ہے مگر چونکہ کولمبو وقت پر پہنچنا تھا اس لیے اسے دیکھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ساحلی سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم رات کے وقت کولمبو پہنچے۔ یہاں پہنچ کر میں نے ایک کمرہ کرایہ پر لیا جبکہ رات کا کھانا ہم نے ایک پاکستانی ریسٹورنٹ میں کھایا۔ میں نے رازق اور ناصر دونوں کا بہت شکریہ ادا کیا۔ان دونوں کے ساتھ ہونے سے نہ صرف سفر بہت آسان اور پرلطف رہا بلکہ ایک غیر مسلم ملک میں حلال کھانے تلاش کرنے کے مسئلے سے بھی دوچار نہیں ہوا کیونکہ رازق ہر جگہ حلال کھانے والے ریسٹورنٹ سے واقف تھا۔مزید یہ کہ مقامی لوگ ٹورسٹ کو دیکھ کر جس طرح ہر چیز مہنگی بیچتے ہیں اس سے بھی

میں، انکے ساتھ کی وجہ سے، محفوظ رہا۔ ہمارے پانچ روزہ ساتھ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ میں ناصر سے اردو میں، وہ رازق سے تامل زبان میں اور رازق مجھ سے انگریزی میں بات کرتا تھا۔ کھانے کے بعد میں ہوٹل آ گیا جبکہ ناصر اور رازق واپس کینڈی لوٹ گئے۔

انٹرویو

کینیڈین امیگریشن حاصل کرنے کے لیے اس زمانے میں ستر پوائنٹس کی ضرورت ہوتی تھی۔ جبکہ میرے پوائنٹس 90 کے قریب تھے۔ پہلے اتنے پوائنٹس پر انٹرویو سے استثنا مل جایا کرتا تھا۔ مگر جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ پاکستان میں ہر چیز جعلی بنائی جا سکتی ہے تو انہوں نے ہر امیدوار کو انٹرویو کے لیے بلانا شروع کر دیا۔ ہوٹل میں سوتے سوتے مجھے دو بج گئے۔ اگلے دن صبح دس بجے انٹرویو تھا۔ میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ مجھے انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا جہاں دیگر کئی پاکستانی بھی ٹینشن کی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دعا اور وظیفے میں مشغول تھے اور کچھ کتابوں کے ذریعے آخری وقت میں بھی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ میرا نمبر آیا تو ایک خاتون مجھے اپنے ساتھ اوپر لے گئیں۔ وہاں میرے کاغذات چیک کیے گئے۔ پھر ایک گورا باہر آیا اور ہاتھ ملا کر مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس نے چند سوالات میرے کام سے متعلق کیے جن کے جوابات میرے لیے مسئلہ نہ تھے۔ پھر مجھے ویزا ملنے کی نوید سنا کر گڈ بائی کہہ دیا۔

مجھے اس کامیابی پر کوئی خوشی یا (Excitement) تو نہ تھی مگر ویزا آفیسر کا رویہ مجھے پسند آیا تھا۔ بالخصوص اپنے کمرے سے باہر آ کر جس طرح اس نے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا تھا وہ اعلیٰ اخلاق کا بڑا عمدہ مظاہرہ تھا۔ اس سے قبل رضوان بھائی کے انٹرویو میں یہ مسئلہ ہو گیا تھا کہ ان کے انٹرویو کی تاریخ تبدیل کر دی گئی مگر جس خط کے ذریعے اس کی اطلاع دی گئی تھی وہ انہیں نہیں مل سکا۔ وہ پرانی تاریخ ہی پر انٹرویو دینے آ گئے۔ تاہم ان کی بات سن کر ویزا آفیسر جو اس روز

چھٹی پر تھا اپنی رہائش گاہ سے آیا اور ان کا انٹرویو کرلیا۔ جبکہ پاکستانی سفارتخانے والے اپنے ملک کے شہریوں سے جو سلوک کرتے ہیں وہ ملک سے باہر رہنے والے خوب جانتے ہیں۔مگر یہاں بھی اور پھر آنے والے ان تمام لمحوں میں جب کبھی میرا واسطہ ان لوگوں سے پڑا میں نے انہیں اپنے کام سے مخلص، اسے خوش دلی اور خوش اخلاقی سے ادا کرنے والا اور لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والا پایا۔ یہ صفات کبھی ہماری میراث تھیں مگر اب ہمارے پاس صرف اپنے ماضی پر فخر بچا ہے، ماضی کی روایات نہیں رہیں۔

نیویارک میں

ماضی کی ورق گردانی کرتے ہوئے نیویارک تک کا سفر کٹ گیا۔ ہمارا جہاز مقامی وقت کے حساب سے صبح 10 بجے نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر اترا۔راستے میں پی آئی اے نے ایک آدھ کارٹون، ڈرامے اور فلم کے سوا کچھ نہ دکھایا۔جن میں سے کوئی بھی پورا نہ چلا اور نہ لوگوں نے انہیں دیکھا کیونکہ کسی کے کان پر بھی ہیڈفون نہیں لگا ہوا تھا۔میری دلچسپی کی چیزیں تو وہ اعداد وشمار ہوتے ہیں جو جہاز کی رفتار، روٹ، بلندی اور وقت کے متعلق دنیا بھر کی ایئر لائنز میں، دورانِ سفر، نشر کیے جاتے ہیں۔تاہم یہاں ان کا ذکر ہی نہیں تھا۔

مانچسٹر کے برعکس یہاں کے ٹرانزٹ لاؤنج میں ٹورنٹو جانے والے مسافروں کو اترنے کی اجازت نہ تھی۔لہٰذا صرف نیویارک میں اترنے والے مسافر جہاز سے باہر گئے۔جن کے جانے کے بعد بھی جہاز کی اکثر نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زیادہ تر لوگ کینیڈا جارہے تھے۔ بلکہ کینیڈا جا کر معلوم ہوا کہ پی آئی اے ٹورنٹو کے لیے براہِ راست پروازیں چلا رہی ہے۔امید ہے کہ جلد ہی کینیڈا دبئی کی جگہ لے لے گا۔

آنے والے دنوں میں نیویارک میں بڑا اچھا وقت گزرا جس کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا

مگراس وقت جہاز سے صرف اتنا ہی دکھائی دیا کہ ہم بحرِ اوقیانوس کو عبور کر کے ساحل کے ساتھ واقع ایئر پورٹ پر اتر گئے۔ درجہ حرارت 8 ڈگری سنٹی گریڈ تھا۔ باہر گھرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کچھ ایسا ہی سماں ٹورنٹو میں بھی متوقع تھا کیونکہ آتے وقت انٹرنیٹ پر یہی پیش گوئی پڑھ کر چلا تھا۔ اس دوران میں کھانا سپلائی کرنے والی گاڑی جہاز سے آ کر لگی اور اس کے لیے دروازہ کھولا گیا تو اندازہ ہوا کہ باہر خاصی ٹھنڈ ہے۔ یہ خدا کی عجیب قدرت ہے کہ زمین کے دوسرے حصے میں تیز گرمی پڑ رہی ہے اور یہاں ٹھنڈ، وہاں رات ہے اور یہاں دن۔ مجھے بے اختیار اقبال کا شعر یاد آ گیا جو حسنِ تشبیہ اور صنعتِ تضاد کا شاہکار ہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

جادو والے واش رومز

ابتدائی طور پر جہاز کے عملے کی طرف سے یہی اعلان کیا گیا تھا کہ ٹرانزٹ مسافر جہاز میں بیٹھے رہیں گے۔ تاہم تھوڑی دیر میں اعلان کیا گیا کہ ٹورنٹو جانے والے مسافر ٹرانزٹ لاؤنج میں جا سکتے ہیں۔

نیویارک میں مانچسٹر کے برعکس تلاشی کے عمل سے نہیں گزرنا پڑا۔ ہم جس جگہ اترے وہاں مانچسٹر جیسی دکانیں تھیں نہ اور لوگ تھے۔ صرف ہمارے جہاز کے مسافر تھے۔ وہاں موجود ایک ٹیلیفون بوتھ کے ذریعے سے، ایک صاحب سے سکہ مستعار لیکر، میں نے نیویارک میں مقیم اپنی بہن کو اطلاع دی کہ میں نیویارک خیر و عافیت کے ساتھ پہنچ گیا ہوں۔ پھر میں جادو والے واش روم گیا۔ جادو سے مراد یہ ہے کہ وہاں نلوں میں ٹونٹی نہیں تھی۔ بلکہ نل کے نیچے ہاتھ کرتے ہی خود بخود انتہائی مناسب گرم پانی آنے لگا۔ ٹوائلٹ بالکل صاف ستھرے تھے۔ جن سے فراغت کے

بعد خود بخود پانی فلش ہوکر اسے صاف کردیتا تھا۔ آنے والے دنوں میں یہ جادو والے واش رومز اکثر پبلک مقامات پر دیکھے۔ تاہم یہ جادوٹونے کی باتیں ہیں جو کافروں کو ہی زیب دیتی ہیں۔ ہم مسلمانوں کو ان سے ''پرہیز'' کرنا چاہیے۔ اور اس میں کیا شک ہے کہ ہم اس قسم کے ''جادوٹونے'' سے پرہیز کرتے ہی ہیں۔

نظریۂ اضافت

نیویارک سے جہاز حسبِ دستور گھنٹے بھر کی تاخیر سے روانہ ہوا مگر اب اس کی عادت ہوچکی تھی۔ ٹورنٹو پہنچے تو ایئرپورٹ میں ہیٹر چل رہا تھا اور محسوس ہی نہیں ہوا تھا کہ میں برفستان میں آ گیا ہوں۔ مگر باہر نکلا تو ٹھنڈی اور تیز ہوا نے ریفریجریٹر کا سا سماں پیدا کردیا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو، براؤن سوٹ کی مناسبت سے، چاکلیٹ آئسکریم سمجھنے لگا۔ میں نے اس خیال سے دستی سامان میں کوئی گرم کپڑا نہیں رکھا تھا کہ اول تو ٹمپریچر پانچ چھ ڈگری ہوگا جو زیادہ نہیں تھا، اور دوسرے ایئرپورٹ سے نکلتے ہی گاڑی کے ہیٹر میں بیٹھنا ہوگا۔ مگر سوئے اتفاق کہ میرے میزبان کی گاڑی پارکنگ سے باہر لاتے ہوئے ٹریفک میں پھنس گئی۔ میں پندرہ منٹ تک باہر یخ بستہ ہوا میں کھڑا ہوکر ان کا انتظار کرتا رہا۔ اندر اس لیے نہیں جاسکتا تھا کہ اگر وہ آ گئے تو دروازے کے سامنے مجھے نہ پاکر پریشان ہوں گے۔

اس وقت میں نے نظریۂ اضافت کا ایک نیا اطلاق دیکھا جو بعد میں بھی مسلسل دیکھتا رہا۔ نظریۂ اضافت کے مطابق ہر شے مطلق طور پر نہیں بلکہ کسی دوسری چیز کے اعتبار سے حرکت یا سکون کی حالت میں ہوتی ہے۔ مثلاً چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھے لوگ ایک دوسرے کے اعتبار سے ساکن لیکن باہر کھڑے ہوئے لوگوں کے اعتبار سے حرکت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت ٹورنٹو ایئرپورٹ کے باہر کھڑے ہوکر میں نے یہ دیکھا کہ سردی لگنا بھی اضافی عمل ہے۔ کیونکہ جس سرد ہوا

نے مجھے کاٹ کر رکھ دیا تھا اس میں بعض روسی خواتین، بنیان اور منی اسکرٹ پہنے، ہنس ہنس کر منہ سے بھاپ کے گولے نکال رہی تھیں۔ سائبیریا کے ان پڑوسیوں کے لیے ماہِ اپریل کی ابتدا کا یہ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ کینیڈا آنے کے بعد یہ تجربہ مجھے بار بار ہوا کہ جب میں لوگوں سے ٹھنڈ کا رونا روتا تو جواب ملتا کہ ٹھنڈ تو ختم ہوگئی۔ بات یہ تھی کہ تیس ڈگری اور منفی تیس ڈگری سے آنے والوں میں سے کوئی بھی غلط نہ تھا بشرطیکہ نظریۂ اضافت کی روشنی میں اس اختلاف کی وضاحت کی جائے۔

کینیڈا میں ابتدائی ایام

ڈوریاں ہلانے والا

کینیڈا آنے سے پہلے لوگ مجھ سے اکثر پوچھتے تھے کہ آیا کینیڈا میں میرا کوئی جاننے والا ہے؟ میں جواب دیتا کہ ہاں ایک ہے۔ بعض لوگ اگلا سوال بھی کردیتے کہ وہ کون ہے اور کیا کرتا ہے؟ میں کہتا کہ جاننے والے کا نام اللہ ہے اور وہ اتنے سارے کام کرتا ہے کہ گنوائے نہیں جاسکتے۔ تاہم انسانوں کے حوالے سے وہ غیب کے پردے میں بیٹھا اسباب کی ڈوریاں ہلاتا رہتا ہے۔

لوگ جس پس منظر میں سوال کرتے وہ اپنی جگہ بالکل درست تھا۔ ایک اجنبی شہر میں، جہاں انسان پہلی دفعہ قدم رکھ رہا ہو، اگر کوئی جاننے والا نہ ہو تو نووارد کو کسی بھی مشکل مرحلے اور مسئلے کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لیکن میرے ''ایک'' ہی جاننے والے نے ہر مرحلے پر دوسرے جاننے والے پیدا کردیے اور وہ سارے انتظامات کرادیے جن کی مجھے کسی بھی موقع پر ضرورت پڑی۔

بلاشبہ یہ اسباب کی دنیا ہے۔ اس میں کامیابی کی شرط منصوبہ بندی اور منظّم عمل ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسباب پیدا کرنے والی ذات وہی ہے۔ انسان کو اپنا اولین اعتماد اسی پر رکھنا چاہیے۔ وہ سب کچھ کے بغیر سب کچھ کرسکتا ہے اور سب مل بھی جائیں تو اس کے بغیر کچھ نہیں

کر سکتے۔ اس بات کو جان لینے کے بعد انسان جو عمل کرے گا وہ دنیا اور آخرت دونوں میں غیر معمولی نتائج پیدا کرے گا۔

میرے میزبان

میری رہائش کا انتظام میرے ایک قریبی دوست نے ٹورنٹو میں مقیم اپنے ایک دوست کے ساتھ کرا دیا تھا۔ کینیڈا میں عموماً جو شخص سیٹ ہو جاتا ہے وہ اپنا گھر لے لیتا ہے اور ساتھ میں کسی دوسرے کو بھی رکھ لیتا ہے تاکہ کرائے کا بوجھ کم ہو سکے۔ چنانچہ میرا قیام بھی ایک ایسی جگہ ہوا۔ صاحب البیت کا نام کامران تھا۔ دوستانہ طبیعت کے باعث ان کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ مجھ سے قبل بھی کئی لوگ ان کے گھر میں مقیم رہ چکے تھے۔ مجھے اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوا جو مختلف لوگوں کے نام ان کے پتے پر آتے رہتے۔ ان کے ساتھ مقیم دوسرے صاحب ارشد خطیب تھے۔ ان کا سابقہ تعلق ممبئی سے تھا۔ اس ''سابقہ'' میں ان کی خواہش کا اتنا دخل نہیں جتنا انڈین حکومت کا ہے، جو اپنے ملک کے ساتھ کسی دوسرے ملک کی شہریت کی اجازت نہیں دیتی۔

یہ دونوں لڑکے بہت اچھے مزاج کے تھے۔ میری ان سے اچھی دوستی ہوگئی اور بعد میں دوسری جگہ شفٹ ہونے کے باوجود میں ان سے مسلسل رابطے میں رہا۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ برسوں مغرب میں مقیم رہنے کے باوجود نماز کے پابند تھے۔ بالخصوص ارشد کافی دیندار اور دوسروں کے کام آنے والے تھے۔ انہیں نہ صرف خدمتِ دین کا بہت ذوق تھا بلکہ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک روز مجھ سے کہنے لگے کہ وہ پاکستان کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ایک اسلامی ملک میں رہ کر دین کی خدمت کر سکیں۔ اس لیے میں انہیں پاکستانی شہریت حاصل کرنے کا طریقِ کار معلوم کر کے بتاؤں۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

میں جمعہ چھ اپریل کو ٹورنٹو پہنچا تھا۔ اگلی شام ارشد مجھے لے کر گھر سے نکلے۔ موسم ٹھنڈا اور ابر آلود تھا۔ مجھے گاڑی میں بیٹھ کر بھی کافی ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ ارشد نے گاڑی کا ہیٹر آن کیا تو صورتحال کچھ بہتر ہوگئی۔ ہماری منزل مسی ساگا کا شہر تھا جو ٹورنٹو سے متصل ہے۔ میں چوتھے باب میں ٹورنٹو کا جغرافیہ بیان کروں گا تو پھر ان تمام جگہوں کی تفصیلات بھی زیرِ بحث آئیں گی۔ ہمیں ایک بزرگ کے پاس جانا تھا۔ یہ بزرگ جالندھر میں پیدا ہوئے اور آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔ ان کی عمر ماشاءاللہ 97 سال ہے اور اس عمر میں بھی چاق و چوبند ہیں۔ وہ ایک اپارٹمنٹ میں تنہا رہتے اور اپنا سارا کام خود کرتے ہیں۔ انہوں نے دینی کتب اور آڈیو وڈیو کیسٹوں کی ایک لائبریری بنا رکھی ہے جس میں پاکستان، انڈیا، امریکا، کینیڈا اور دیگر مسلم ممالک سے تعلق رکھنے والے مسلم اسکالرز کی تقاریر و تصانیف موجود ہیں۔ ارشد ان سے وڈیو کیسٹ، کچھ پیسے دے کر، ریکارڈ کراتے اور دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرتے۔

ارشد اور کامران دونوں نے اپنے بارے میں یہی بتایا کہ وہ پس منظر کے اعتبار سے کوئی خاص دینی رجحان نہیں رکھتے تھے مگر یہاں آنے کے بعد آہستہ آہستہ دین کی طرف حسبِ استعداد ان کا رجحان ہوگیا۔ میں نے اپنے قیام کے دوران اسی طرح کے اور لوگوں کو بھی دیکھا جن کا پہلے دین سے اتنا تعلق نہ تھا۔ مگر یہاں آنے کے بعد جب براہِ راست مغربی تہذیب سے واسطہ پڑا تو کم از کم نماز روزے کی حد تک دیندار ضرور ہوگئے۔

پڑے جب بیمار......

آنے کے تیسرے دن اتوار کو موسم بڑا شاندار تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ میں علاقے کا سروے کرنے کے لیے پیدل گھر سے باہر نکل گیا۔ موسم اس قدر معتدل تھا کہ سردی کا کوئی اثر محسوس ہوتا تھا اور نہ اس سے بچاؤ کے لیے کچھ پہن رکھا تھا۔ گھنٹہ بھر مزے سے

گھومتا رہا۔ واپس آیا تو بابر گھر پر آ گئے۔ بابر بہن کی سسرال کی طرف سے رشتے دار ہیں۔ لیکن ان سے پہلی ملاقات ٹورنٹو آنے کے بعد ہی ہوئی۔ دورانِ قیام انہوں نے بھی میرے ساتھ بڑا تعاون کیا۔ اس روز وہ مجھے یہاں کا ٹرانسپورٹ سسٹم سمجھانے کے لیے آئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ان کے گھر کی طرف چلا گیا۔ شام کے ڈھلتے ہوئے سائے کے ساتھ ساتھ ہوا میں، بقول ہمارے شاعرِ مشرق، شمشیر کی سی تیزی آتی گئی۔ مگر میرے پاس کوئی ڈھال نہ تھی۔ رات میں ونڈ چل منفی تک جا پہنچی۔ اس وقت تو میں جیسے تیسے اسے جھیل گیا اور گھر پہنچ کر بستر میں دبک گیا، مگر اگلی صبح معلوم ہوا کہ سرد ہوا اپنا کام دکھا چکی ہے۔ سو کر اٹھا تو جسم میں شدید درد، بخار اور گلے میں بہت تکلیف تھی۔

یہ میرے آنے کے بعد پہلا ورکنگ ڈے تھا جس میں مجھے اپنی کاغذی کارروائی مکمل کرنا تھی۔ مگر طبیعت بتدریج خراب ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بستر سے اٹھنے کی ہمت بھی ختم ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا ہفتہ بیماری میں ضائع ہوگیا اور میں گھر کے اندر ہیٹر کی پناہ میں بیٹھا رہا۔

ونڈ چل

قید و نظر بندی جیسے الفاظ اس سے قبل میں نے صرف اخباروں میں پڑھے تھے۔ مگر اب ایک ہفتے مجھے خود اس تجربے سے گزرنا پڑا۔ ہر چند کہ موسمِ بہار کی آمد آمد تھی مگر میرے اعتبار سے ابھی تک شدید جاڑا چل رہا تھا۔ ہوا اتنی ٹھنڈی اور تیز چلتی تھی کہ عملاً میرے لیے، اس بیماری کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا آسان نہ تھا۔ اس ہفتے موسم بھی سرد ہوگیا جو میری آمد سے ذرا قبل ہونے والی موسم سرما کی آخری برفباری کے بعد کچھ بہتر ہوا تھا۔ اس دوران میں درجۂ حرارت اکثر منفی میں رہا اور بعض اوقات منفی آٹھ تک بھی جا پہنچا۔ گھر کے ہیٹر میں بیٹھے بیٹھے آسمان پر چمکتے سورج کو دیکھتا تو لگتا کہ باہر بہت خوشگوار موسم ہے۔ مگر جونہی کھڑکی کا پٹ کھولتا

تو پتا چلتا کہ سورج ہمارے جیسے نو واردوں کو بے وقوف بنانے کے لیے نکلا ہوا ہے اور ونڈ چل کے باعث صرف روشنی سپلائی کر رہا ہے حرارت نہیں۔ میں نے تو یہ سردی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ رہی سہی کسر بیماری نے پوری کر دی جس کے بعد میں خود پر نظر بندی کی پابندی لگانے پر مجبور ہو گیا اور پورے ہفتے سوائے نمازِ جمعہ پڑھنے کے لیے، گھر سے باہر نہیں نکلا۔

میں بار بار ونڈ چل کا لفظ استعمال کر رہا ہوں مناسب ہو گا کہ اس کی وضاحت بھی ہو جائے کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ ونڈ چل دراصل اس ٹھنڈ کو کہتے ہیں جو عام ٹمپریچر کے ساتھ سرد ہوا کے چلنے سے اضافی طور پر محسوس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ملک میں سردی کے مہینوں میں جب کبھی سائبیریا کی ٹھنڈی ہوا، براستہ افغانستان، آتی ہے تو موسم غیر معمولی طور پر سرد ہو جاتا ہے۔ کراچی شہر میں یہ ہوا دو چار دن کے لیے کوئٹہ سے آتی ہے اور جب آتی ہے تو اہلِ کراچی لحافوں میں دبک جاتے ہیں اور کوئٹہ کی سردی کا بدلہ معصوم مونگ پھلی سے لیتے ہیں۔ بازاروں، دفتروں اور تعلیمی اداروں میں حاضری کم ہو جاتی ہے، البتہ لنڈا بازار میں رش بڑھ جاتا ہے۔

ہم لوگوں سے جو سرد ہوا دو دن برداشت نہیں ہوتی وہ کینیڈا میں، گرمیوں کے چند دن چھوڑ کر، مستقل ڈیرے ڈالے رکھتی ہے۔ کیونکہ یہ علاقہ قطبِ شمالی سے متصل ہے۔ اس لیے جب کبھی آپ بالخصوص موسم سرما میں، یہاں کا ٹمپریچر دیکھیں گے، تو عام درجۂ حرارت کے ساتھ ونڈ چل ٹمپریچر بھی لکھا ہوا ملے گا۔ یہ بالعموم عام ٹمپریچر سے پانچ تا دس ڈگری کم ہوتا ہے۔

قطار: مسلمانوں اور ”کافروں“ کا رویہ

میں ایک ہفتے تک گھر میں بند رہا۔ اس دوران بخار اور درد ختم ہو گیا البتہ گلے کی تکلیف باقی تھی۔ میں نے مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے باہر نکل کر اپنی کاغذی کارروائی پوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح دس بجے ارشد کے دوست امتیاز بھائی مجھے لینے آ گئے۔ ہم اپنے گھر سے

قریب واقع ایک آفس میں پہنچے۔ داخلی دروازے کے ساتھ ایک قطار میں لوگ کھڑے تھے۔ ہم بھی اس قطار میں شامل ہوگئے۔ قطار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کیونکہ ایک خاتون ہر شخص سے اس کی آمد کا سبب دریافت کر کے متعلقہ کاؤنٹر پر بھیج رہی تھیں۔ ہمارا نمبر آنے پر ہمیں ایک طرف بھیج دیا جہاں ایک اور قطار تھی۔

برسبیلِ تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ ہماری قوم قطار سے جتنا بیر رکھتی ہے یہ لوگ اتنے ہی قطار پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہاں لائن بنانا ایک ضروری عمل ہے جس کی خلاف ورزی ایک سماجی جرم ہے۔ اگر کسی جگہ باوجوہ قطار نہیں بھی ہو تو ڈسپلن کے تحت یہ خیال رکھتے ہیں کہ اصولاً کس کا نمبر ہے۔ مجھے اس سلسلے میں ایسے ایسے تجربات پیش آئے ہیں کہ اگر ہم پاکستانیوں کے طرزِ عمل سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ مجھے کینیڈا میں یہ تجربہ بھی ہوا کہ میں ایک بینک میں قطار میں کھڑا تھا۔ لیکن اپنی سلپ بھرنے کے لیے میں قطار سے نکل گیا۔ میرے سلپ بھرنے کے دوران کئی لوگ لائن میں آ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے اپنے پاکستانی تجربات کے پیشِ نظر محسوس کیا کہ اگر میں واپس جا کر اپنی جگہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا ہوں تو بدمزگی کا پورا امکان ہے۔ میں یہ سوچ کر لائن کے آخر کی طرف جانے لگا تو میرے پیچھے والے شخص نے، جو اس وقت تک کاؤنٹر کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، مجھے آواز دے کر بلایا اور اپنے سے آگے کھڑا کر لیا۔

اب ذرا ایک اور منظر ملاحظہ فرمائیے۔ حرم پاک مسلمانوں کا مقدس ترین مقام ہے۔ اس کی عظمت پر ہر مسلمان نثار ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔ مگر اس کی تمام تر عظمت کے باوجود اس کے بارے میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث موجود ہے کہ ایک مسلمان کی جان، مال، عزت و آبرو اس سے زیادہ محترم ہے۔ اسی حرم میں مسلمان با جماعت صف در صف نماز ادا

کرتے ہیں۔ جیسے ہی امام صاحب سلام پھیرتے ہیں، انتہائی منظّم انداز میں نماز پڑھنے والے یہ نمازی وحشیوں کی طرح حجراسود کو بوسہ دینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں اوراس کے بعد اگلی نماز تک وہ دھینگامشتی ہوتی ہے کہ الامان الحفیظ۔ اس بلوۂ عام میں گھس کر حجراسود کو بوسہ دینے کی کوشش کرنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنا اپنی جان، مال اورآبرو تینوں کوخطرے میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ حالانکہ لوگ اگر قطار بنالیں تو ہرشخص بلاکسی زحمت، سکون سے اسے بوسہ دے سکتا ہے۔ اس منظر کی تفصیلی تصویرکشی انشاءاللہ آگے سعودی عرب کے باب میں ہوگی۔

بارہ لاکھ میں کینیڈا کی جنت

میرا نمبر آیا تو بمشکل ایک منٹ میں خاتون نے مجھے فارغ کردیا۔ رسید دیتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ تین ہفتے میں سن (SIN) کارڈ میرے گھر کے پتے پر پہنچ جائے گا۔ تاہم بعد میں صرف دو ہفتے میں مجھے یہ کارڈ مل گیا۔ وہاں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ پاکستانی تھے اور بارہ لاکھ روپے دے کر غیر قانونی طریقے پر اس ''جنت'' میں پہنچے تھے۔ چالیس سالہ یہ صاحب جن کی ایک ٹانگ میں سقم بھی تھا، ایک بہتر مستقبل کی امید میں نجانے کس طرح بارہ لاکھ جمع کرکے جعلی کاغذات پر کینیڈا آئے تھے۔ واپسی پر مجھے امتیاز بھائی نے بتایا کہ حکومت کی طرف سے انہیں اپنی معذوری کا بھی کچھ الاؤنس ملے گا۔

بینک اکاؤنٹ

اگلا مرحلہ بینک اکاؤنٹ کا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب واقع مال (Mall) میں ایک مشہور بینک کی برانچ تھی۔ یہ مال ایک بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں عام ضرورت کی تمام چیزیں ایک ہی چھت تلے جمع کردی گئی ہیں۔ بینکس، پوسٹ آفس، بڑے بڑے سپر اسٹورز،

عام اشیائے صرف، کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کی دکانیں سب ایک جگہ موجود ہیں۔ایسے مال یہاں اکثر علاقوں میں بنے ہوئے ہیں۔

بینک میں ہم ''نئے اکاؤنٹ'' کی تختی کے نیچے جا کر کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ کاؤنٹر خالی ہے۔اتنے میں ایک خاتون ہمیں دیکھ کر دور سے آئیں اور ہمیں ریسیپشن پر موجود ایک دوسری خاتون کے پاس لے گئیں۔انہوں نے ہمیں بتایا کہ آج بینک میں عملہ کچھ کم ہے اس لیے ہم ایک گھنٹے بعد کا اپائنٹ منٹ(appointment) لے لیں۔ہم نے بااصرار چار گھنٹے بعد یعنی تین بجے کا ٹائم لیا۔ بینک سے نکلتے ہوئے میں نے کہا کہ ہمیں ہیلتھ کارڈ کے لیے جانا ہے۔اگر انہوں نے کوئی شناخت مانگی تو ہم کم ازکم بینک اکاؤنٹ کی شناخت تو پیش کر سکتے ہیں۔ لہٰذا پہلے بینک اکاؤنٹ کھلنا چاہیے۔ چنانچہ ہم واپس لوٹ آئے اوران سے کہا کہ ہمیں بارہ بجے کا ہی وقت دے دیں۔

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اللہ کی بندی کم ازکم دو چار صلوٰتیں تو ضرور سنائے گی کہ جب میں نے کہا تھا کہ یہ وقت لے لو تو کیوں نہیں لیا اور اب تو میں رجسٹر پر لکھ چکی ہوں اس لیے کچھ نہیں ہوسکتا۔لیکن ایسا نہ ہوا۔ ہماری بات سن کر وہ ایک اور خاتون سے بات کرنے گئی اور واپس آ کر کہا کہ آپ بیٹھیں۔ پھر ایک خاتون کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ پانچ منٹ میں آپ کو بلالیں گی۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کہ اگر یہی کچھ مملکتِ خداداد میں ہوا ہوتا تو کیا ہوتا۔

ٹورنٹو بمقابلہ جدہ

میں ایک بات کی یہاں وضاحت کرنا چاہوں گا۔قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں گوروں سے بہت زیادہ مرعوب ہوں اور بلاوجہ ان کی قصیدہ گوئی کیے جارہا ہوں۔اللہ گواہ ہے کہ ایسی کوئی

بات نہیں ۔آپ آگے چل کر دیکھ لیں گے کہ میں ان کی تہذیبی بنیادوں پر کیسی تنقید کرتا ہوں ۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں ایسے ملک کا رہنے والا ہوں جہاں ہر کرسی والا، چاہے کلرک کی کرسی ہی کیوں نہ ہو، پوری کوشش کرتا ہے کہ سامنے والے کے کام میں روڑے اٹکائے اور اسے تنگ کرے ۔تا کہ اسے کام نہ کرنا پڑے اور کرنا پڑے تو اسکا اضافی ''حقِ خدمت'' بھی اسے ملے ۔اور اگر ان میں سے کچھ نہ کر سکے تو اپنے رویے سے ایسا ظاہر کرے کہ گویا وہ سامنے والے کی سات پشتوں پر احسان کر رہا ہے ۔مگر ان لوگوں میں اسلام نہ سہی ،کم از کم انسانیت تو موجود ہے۔ بدقسمتی سے ہم میں اس کے خصائص بھی تیزی سے ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں ۔اس وضاحت کے بعد میں ایک واقعہ نقل کرنا چاہوں گا۔البتہ قارئین کے قہر وغضب سے محفوظ رہنے کے لیے پاکستانیوں سے موازنہ نہیں کروں گا،سعودیوں سے کروں گا۔سب مسلمان بھائی ہیں اور دنیا میں جہاں کہیں ہوں اکثر ایک ہی جیسے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔

جدہ میں جاب کے دوران میں اور میرے بھائی رضوان نے بینک اکاؤنٹ کھلوانا چاہا۔ رمضان کے دن تھے ۔ہم تمام ضروری کاغذات تیار کر کے بینک پہنچے ۔لیکن متعلقہ شخص نے ہمیں یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ آج بہت کام ہے کل آنا۔ ہم اگلے دن بھی چلے گئے ۔مگر پھر وہی جواب ملا۔ایسا پانچ چھ دفعہ ہوا۔ جب اس شخص کو ہماری ڈھٹائی کا یقین ہو گیا تو آخری دفعہ اس نے ہمیں بٹھا لیا اور دونوں کے اکاؤنٹ کھول دیے۔مگر کتنی دیر میں؟ صرف تین گھنٹے میں ۔ جی ہاں اس نے دو اکاؤنٹ کھولنے میں تین گھنٹے لیے ۔ اس روز اس نے کوئی دوسرا کام نہیں کیا اور ہر آنے والے فون کے جواب میں یہی کہا کہ آج بہت کام ہے ۔اس طرزِ عمل کا سبب میں انشاءاللہ سعودی عرب کی زندگی کا تجزیہ کرتے وقت بیان کروں گا۔

نومسلم عائشہ

پانچ منٹ بعد ایک نوجوان خاتون، جو چہرے بشرے سے دیسی مگر لہجے سے انگریز لگ رہی تھیں، ہمارے پاس آئیں اور ساتھ لے جا کر اپنی میز کے پاس بٹھا دیا۔ انہوں نے ہمارا لینڈنگ پیپر اور پاسپورٹ دیکھا۔ اس کے بعد کوئی فارم فل کرنا پڑا نہ ریفرنس دینا پڑا اور ہمارا کاؤنٹ کھل گیا۔

جن خاتون نے ہمارا اکاؤنٹ کھولا ان کا نام عائشہ تھا۔ یہ ایک نومسلم سکھ خاتون تھیں جنہوں نے ایک پاکستانی سے شادی کی تھی۔ بظاہر یہ لگا کہ یہ شادی اور قبولِ اسلام کسی Love Affair کا نتیجہ ہے۔ مجھے یہ اندازہ ان کے لباس سے ہوا۔ وہ ایک منی اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس تھیں۔ ایک پیدائشی مسلمان لڑکی سے، اپنے ماحول کے زیرِ اثر، ایسا لباس پہننا متوقع ہے ۔مگر ایک نومسلم لڑکی جس نے اسلام سوچ سمجھ کر قبول کیا ہو، ایسا نیم عریاں لباس کبھی نہیں پہن سکتی۔ مجھے ان خاتون سے مل کر گہری مسرت ہوئی جس کا اظہار میں نے ان سے کیا بھی، مگر ساتھ ہی دکھ بھی ہوا۔ ان خاتون نے دورانِ گفتگو بتایا کہ انہیں نام بدلوانے کے سلسلے میں بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑی جس میں وقت اور پیسہ دونوں ضائع ہوئے۔ انہوں نے یہ ساری مشقت اس لیے اٹھائی کہ انہیں بتایا گیا ہوگا کہ نام کی تبدیلی، مذہب کی تبدیلی کے ساتھ لازمی ہے۔ یہ بتانے والے غالبًا ان کے شوہر ہوں گے۔ کاش وہ انہیں یہ بھی سمجھاتے کہ ایک مسلمہ کے لباس کی حدود و قیود کیا ہوتی ہیں تو شاید وہ اس پر بھی عمل کر لیتیں۔

یہاں یہ بات بھی میں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا کہ اسلام قبول کرنے پر نام بدلنا دین کا تقاضہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی کا نام بھی نہیں بدلا۔ حالانکہ وہ سب غیر مسلم سے مسلم ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کا نام اگر کبھی بدلا تو

صرف اس لیے کہ وہ مشرکانہ تھا یا اس کے معنی درست نہیں تھے۔

حیاتیاتی گھڑی

مجھے یہاں آئے ہوئے ایک ڈیڑھ ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں ایک مسئلے نے بڑا تنگ کیا جس کا ذکر بھی کرتا چلوں۔ جو لوگ پاکستان سے امریکا یا کینیڈا آتے ہیں انہیں اس مسئلے کا پہلے دن سے ہی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ نیند کے اوقات میں تبدیلی کا ہے۔ دونوں ملکوں کے وقت میں نو گھنٹے کا فرق ہے جس کی بنا پر نو واردوں کو کینیڈا میں سہ پہر سے ہی شدید نیند آنے لگتی ہے اور اگر سو جائیں تو نصف شب میں اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دراصل انسان میں اپنے سونے کی عادت کی بنا پر ایک حیاتیاتی گھڑی سی بن جاتی ہے جو نیند کا وقت ہو جانے پر انسان کا جاگنا اور بیداری کے وقت پر سونا ناممکن بنا دیتی ہے۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل ہوتا ہے کہ بندہ خود پر جبر کرکے نئی جگہ کے اعتبار سے اپنی عادت کو تبدیل کرے وگرنہ نئے حالات میں خود کو ڈھالنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے لیے اس مسئلے کو نماز نے جلد حل کر دیا۔ کیونکہ عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھنے کے لیے مجھے نیند سے لڑ کر جاگنا پڑتا تھا۔ البتہ چند مہینے بعد جب میرے دوست طارق کینیڈا آئے تو وہ اپنی عادت کافی عرصے تک نہ بدل سکے۔ چنانچہ وہ صبح ہی صبح اٹھ کر بیٹھ جاتے اور بچوں کی تصویریں دیکھنے کے بہانے اپنی اہلیہ کی تصویر دیکھتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے۔

ٹورنٹو میں نماز روزہ کے اوقات

کینیڈا آباد دنیا کا آخری ملک ہے۔ اس سے اوپر قطب شمالی واقع ہے۔ ملک کی بیشتر آبادی جنوبی حصہ میں امریکی سرحد کے ساتھ آباد ہے۔ جوں جوں شمال کی سمت اوپر چلتے جائیں گے سردی بڑھتی چلی جائے گی۔ موسم کے اعتبار سے کینیڈا کا سب سے اچھا علاقہ جنوب مغربی

صوبہ برٹش کولمبیا ہے۔ یہاں موسمِ سرما سب سے مختصر ہوتا ہے۔ قطب شمالی کے قریب ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ سردیوں میں دن بے حد چھوٹے اور گرمیوں میں بہت بڑے ہوجاتے ہیں۔ جولائی کے دن طویل ترین ہوتے ہیں جب فجر صبح سوا تین بجے اور مغرب رات سوا دس بجے ہوتی ہے۔ اس طرح دن 17 گھنٹے کے ہوجاتے ہیں۔ گویا رمضان میں روزے دار 17 گھنٹے تک کھانے پینے سے محروم رہے گا۔ لیکن سردیوں کے روزے بڑے ہی آسان گزرتے ہیں۔ کیونکہ سردیوں میں روزے نومبر دسمبر میں آتے ہیں۔ ان دنوں فجر سوا چھ بجے اور مغرب پونے پانچ بجے ہوجاتی ہے۔ گویا ساڑھے دس گھنٹے کا روزہ ہوتا ہے۔

مسیحی تاریخ سے ایک سبق

امریکا، کینیڈا اور یورپی ممالک میں داخلے کے لیے لوگ جس طرح مرے جارہے ہیں وہ اس بات کی عکاسی ہے کہ مغربی تہذیب کو کس درجہ میں مشرقی تہذیبوں پر برتری حاصل ہوچکی ہے۔ مسئلہ صرف معاشی ہی نہیں بلکہ سیاسی، سماجی، معاشرتی اور دیگر اعتبارات سے بھی کوئی تہذیب ان کے مقابلے کی نہیں ہے۔ جو فلاحی نظام (کینیڈا کے فلاحی نظام کا کچھ تذکرہ نیچے آرہا ہے) ان لوگوں نے قائم کرلیا ہے وہ اپنے اندر غیر معمولی کشش رکھتا ہے۔ لوگ ان پہلوؤں سے بھی متاثر ہوکر یہاں کا رخ کرتے ہیں۔

تاہم کچھ عرصے پہلے تک صورتحال بالکل الٹ تھی۔ ایک روز رابن ہڈ کے مشہور کردار سے متعلق ایک فلم کا ابتدائی حصہ دیکھا۔ فلم کے مطابق رابن ہڈ اس فوجی مہم کا حصہ تھا جو صلیبی جنگوں کے زمانے میں یروشلم کو ''بددینوں'' یعنی مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے کے لیے روانہ ہوئی۔ سلجوق جانبازوں نے انہیں ذلت آمیز شکست دی اور رابن ہڈ کو قیدی بنالیا گیا۔ رابن ہڈ قید خانے سے ایک مسلمان کردار کے ساتھ بھاگ کر انگلستان آجاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنی دوربین

نکال کر رابن ہڈ کو دکھاتا ہے۔ وہ جیسے ہی دوربین آنکھوں سے لگاتا ہے دور کی چیزوں کو بڑا دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مسلمان اس صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے طنزاً کہتا ہے کہ تم لوگ اسی لیے یروشلم نہیں لے سکے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کو دنیا میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آج مغربی اقوام کو حاصل ہے۔ اس کے بعد عیسائیوں نے مسلمانوں کے علوم سیکھنا شروع کر دیے۔ مسلمانوں کے اثر سے ان میں اصلاحی تحریکیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ چند سو سال کی محنت کے بعد انہوں نے وہی مقام حاصل کر لیا جو کبھی مسلمانوں کو حاصل تھا۔ اب مسلمانوں کے لیے بھی درست راستہ یہی ہے کہ وہ دورِ جدید کی ٹیکنا جی اور تعلیم سے خود کو آراستہ کریں۔ ان کے اندر دورِ زوال میں جو غلط رویے پیدا ہو گئے ہیں ان کی اصلاح کریں۔ تب کہیں جا کر وہ مغربی تہذیب کو لگام ڈالنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اس راہ کا کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ ہاں ایک مؤثر طریقہ ہے جس کی مدد سے اس عمل کو تیز کیا جا سکتا ہے۔ وہ دعوت کا طریقہ ہے۔ الحمد للہ انفرادی طور پر یہ عمل جاری ہو چکا ہے اور اس کے نتائج آ رہے ہیں جن کی تفصیل آگے سفرِ امریکا میں بیان کروں گا۔

پیسے لے کر بھی کام کرنے والی

کینیڈا میں نئے آنے والوں اور دیگر بیروزگار افراد کے لیے حکومت کی طرف سے ایمپلائمنٹ ریسورس سنٹر قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں جاب ڈھونڈنے والوں کے لیے وہ تمام سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں جن کی انہیں ضرورت ہوتی ہے۔

اگلے دن میں بس میں بیٹھ کر وہاں پہنچا۔ اندر داخل ہوا تو ریسپشن پر بیٹھی خاتون نے یہ جان کر کہ میں پہلی دفعہ آیا ہوں مجھے ایک فارم بھرنے کے لیے دیدیا۔ کچھ دیر میں ایک اور خاتون آئیں اور مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ نئے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کو

یہاں کی تفصیلات سے آگاہ کروں گی۔ پھر وہ اندر گئیں اور دو اور افراد کو لے آئیں۔ یہ دونوں پاکستانی تھے اور سول انجینئر تھے۔ میں نے ان خاتون سے دریافت کیا کہ کیا آپ رضا کار ہیں۔ انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ نہیں۔ میں تو یہاں جاب کرتی ہوں۔ پھر خود ہی بولیں کہ آپ نے یہ رائے شاید اس لیے قائم کی ہے کیونکہ میں بہت ینگ لگتی ہوں۔ میں دراصل اتنی ینگ ہوں نہیں جتنی لگتی ہوں۔ مگر آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے ایسا سمجھا۔

میں نے ان کے حسن ظن کی تردید نہیں کی لیکن میری اس رائے کا سبب ان کے کام کرنے کا جوش تھا۔ پیسے لے کر اتنے جوش سے کام کرتے ہوئے میں نے کبھی کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اتنا جوش صرف رضا کاروں میں ہی ملتا ہے۔ مگر میں ابھی کینیڈا میں نیا تھا اور اس بات سے ناواقف تھا کہ یہی ان لوگوں کے کام کرنے کا انداز ہے۔ اس لیے یہ غلط فہمی ہوگئی۔ اس دوران میرا ممبر شپ کارڈ بن گیا جو ریسپشنسٹ نے مجھے دیدیا۔ ان خاتون کا نام اولیورا تھا۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے ہمیں سنٹر کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور بتانے لگیں کہ یہاں جاب تلاش کرنے والوں کو کیا کیا سہولیات ملتی ہیں۔

دل کی کسک

میں جب یہ ساری تفصیلات سن رہا تھا تو بے اختیار دل میں کسک اٹھ رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس سنٹر اور اس جیسی دوسری سہولیات کی موجودگی میں کسی شخص کو روزگار ملے نہ ملے، مگر وہ تنگ آ کر خودکشی نہیں کرے گا۔ جبکہ اسے بیروزگاری کا وظیفہ بھی مل رہا ہو۔ آج مغرب اگر ہمارے بہترین دماغوں کی منزل بن گیا ہے تو اس کا بڑا سبب یہی سہولیات ہیں۔ ہمیں ہمیشہ مغرب کے بارے میں یہی بتایا جاتا ہے کہ وہ اسلام دشمن ہیں اور ہر جگہ مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے رویہ سے قطع نظر وہ کم از کم اپنے لوگوں کے لیے تو اچھے ہیں۔

ہم تو وہ ہیں جو اپنوں کی زیادتیوں سے بھی محفوظ نہیں۔

کون سا ظلم ہے جو مذہب ، زبان اور قومیت کے نام پر ہمارے ہاں لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ نہیں کیا۔ اور معاف کیجیے گا ہمارے اصل مجرم صرف بڑے لوگ نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں عوام کو سب سے زیادہ تکلیف عوام دیتے ہیں۔ دفتروں میں رشوت لینے والا کلرک کون ہے، جھوٹی قسم کھا کر مال بیچنے والا خوانچہ فروش کون ہے، سرِ راہ لوگوں کا مال اپنی جیب میں لے جانے والا کانسٹبل کون ہے، سرکاری اداروں میں بیٹھ کر کام چوری اور لوگوں کو تنگ کرنے والا اہلکار کون ہے، مال میں ملاوٹ کرنے والا تاجر کون ہے، لوگوں کی جان، مال اور آبرو کو چند پیسوں کے لیے برباد کرنے والا پولیس والا کون ہے، منی بس میں جانوروں کی طرح آدمیوں کو ٹھونسے والا کنڈکٹر کون ہے، اس منی بس کو اندھا دھند چلا کر لوگوں کی جان خطرے میں ڈالنے والا ڈرائیور کون ہے، راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنے والا نوجوان کون ہے، بچوں کو زبردستی ٹیوشن پڑھنے پر مجبور کرنے والا استاد کون ہے، استاد کو بھری کلاس میں رسوا کرنے والا طالبِ علم کون ہے؟ کیا یہ سب اور ان جیسے نہ جانے کتنے افراد بڑے سیاستدان اور اعلیٰ افسران ہیں؟ کیا ان کا تعلق ہماری اشرافیہ (Elite) سے ہے؟

ہم میں سے ہر شخص اپنے قومی فساد کا مجرم ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس کو جتنا موقع ملتا ہے وہ اتنا ہاتھ دکھا دیتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اندر ہمارے بعض مفکرین اور دانشوروں نے ایک خاص مزاج پیدا کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ جو برائی نظر آئے اس کا الزام دوسروں پر ڈال دو۔ سب سے پہلے غیر مسلم نشانہ بنتے ہیں۔ اس کے بعد اپنی قوم کے مقتدر طبقات کی باری آتی ہے۔ اس الزامی ذہنیت سے ان لوگوں کا کچھ بگڑے نہ بگڑے، ہمیں اپنے دائرے میں برائی کرنے کا ایک جواز مل جاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہم میں سے ہر شخص بدعمل ہو چکا ہے مگر خود کو معصوم بھی سمجھتا ہے۔

قارئین یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں مگرمچھوں کو معاف کر رہا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ مگر میں اس بات سے واقف ہوں کہ ہم براہِ راست ان مگرمچھوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے تو مزید فساد پھیلانے والے تو نہ بنیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ کوئی معاشرہ صرف بڑے لوگوں کے فساد سے تباہ نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت تباہ ہوتا ہے جب ہمارے جیسے عام لوگ ان کی پیروی شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح ہم اپنے جیسے عام لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ پھر وہ دوسرے عام لوگوں کی اور اس طرح پوری سوسائٹی فساد سے بھر جاتی ہے۔

ہمارے تمام مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ ہم اپنے اپنے دائرے میں اچھے ہو جائیں۔ یہ بھول جائیں کہ دوسرے برائی کر رہے ہیں۔ یہ طرز عمل نہ صرف روزِ جزا ہماری نجات کا ضامن ہوگا بلکہ اس دنیا میں بھی ہمارے سارے مسائل اسی سے حل ہوں گے۔ مشہور روایت ہے کہ '' جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمران ہونگے '' اور '' تمہارے اعمال ہی تمہارے حکمران ہوتے ہیں ''۔ یہ روایات جو سنداً تو ٹھیک نہیں، مگر اپنے مفہوم میں ایک حقیقت کا بیان ہیں۔ ہم اچھے ہو جائیں گے تو ایک روز ہمارے حکمران بھی اچھے ہو جائیں گے۔ رہے اہلِ مغرب تو انھوں نے اپنے معاشروں میں وہ نظام قائم کر رکھا ہے جو مسلمانوں کے لیے بھی قابل رشک ہے۔ عدلِ اجتماعی اور سماجی فلاح کے تصورات عملی صورت میں ان کے معاشروں میں موجود ہیں۔ ان کے افراد اپنی ذمہ داریوں سے گریزاں نہیں بلکہ خوش دلی سے انہیں ادا کرنے والے ہیں۔ دنیا کے پہلے ماہر سماجیات ابن خلدون کے مطابق یہی وہ خوبی ہے جو کسی قوم کو دنیا میں عروج عطا کرتی ہے۔

مغربی بے راہ روی

مجھے کینیڈا آئے ہوئے دو ہفتے ہونے کو تھے۔ عام طور پر مغربی تہذیب کے بارے میں

تاثر یہی ہے کہ یہ لوگ جنسی معاملات میں حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں۔تاہم ابھی تک کوئی ایسا واقع پیش نہیں آیا تھا جس سے اس تاثر کو تقویت ملتی۔ کچھ میں بھی گھر سے زیادہ باہر نہیں نکلا تھا۔اول تو بیماری نے موقع نہیں دیا۔ دوسرے ہوا میں وہ غضب کی ٹھنڈ تھی کہ میں بِلا ضرورت گھر سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔اسی سردی کی بنا پر ابھی تک لوگوں کی اکثریت معقول حلیے میں گھر سے باہر نکلتی تھی۔تاہم اس روز جب میں ریسورس سنٹر سے واپس آ رہا تھا تو پہلی بار ان گنہگار آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھ لیا جو شاید مقامی لوگوں کے لیے تو کوئی خاص بات نہیں مگر ایک نئے آنے والے کے لیے غیر متوقع طور پر اسے دیکھ کر نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں بھی مقامی ہو گیا تو ''نگاہ میں کوئی برا نہ رہا''۔

مجھے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ یہ کوئی ایسی رومانٹک جگہ نہ تھی جہاں انسان کے جذبات بے قابو ہو جائیں۔گاڑیوں کے شور، لوگوں کی آمد و رفت اور بازار کی گہما گہمی میں سرِ راہ اس بے خودی کو دیکھ کر جو نجانے کتنی دیر سے جاری تھی اور کتنی دیر تک جاری رہی، مجھے حیرت ہوئی۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ رک کر اتنا ہی کہہ دوں کہ یار کونے میں تو ہو جاؤ۔مگر میں ایسا نہ کر سکا اور مغرب میں حیا کے بعد ذوقِ جمال و لطافت کی بھی موت پر اناللہ پڑھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یہ حقیقت ہے کہ کینیڈا آنے کے بعد اہل مغرب سے میرا حسنِ ظن برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مجھے ٹھیک موقع پر ایک جھٹکا مار کر حقائق کی دنیا میں واپس بھیج دیا۔ یہ شاید اس دعا کا اثر تھا جو میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں اپنے رب سے کرتا تھا۔''اے اللہ تو مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھلا جیسی وہ ہیں، نہ کہ ایسی جیسا میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں''۔

اہلِ مغرب کے اخلاقی بگاڑ کی اساس

مغربی تہذیب جس اخلاقی بگاڑ اور مادر پدر جنسی آزادی کے دور سے گزر رہی ہے اس پر

ہماری طرف سے کافی اعتراضات کیے جاتے ہیں اور اسے مغربی زندگی کا ایک بڑا منفی پہلو خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم اہل مغرب اپنے اس رویے کو معیوب خیال نہیں کرتے۔ وہ اسے آزادی عمل کی غیر متنازع اور مسلمہ انسانی قدر کا لازمی نتیجہ خیال کرتے ہیں۔

مغربی فکر کے ارتقا سے واقف لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو ردِ عمل مروجہ عیسائی مذہب کے خلاف ہوا وہ بڑھتا ہوا انکارِ مذہب تک جا پہنچا۔ دریافت و ایجاد کے جوش میں فکر و عمل کی جو راہیں کھلیں انہوں نے ہر پہلو سے مذہب کو ایک کونے میں کر دیا۔ اس صورتحال کے متعدد اسباب تھے۔ جن میں پاپائیت کی بے لچک اور انتہا پسند حکومت کے خلاف ردِ عمل، مسیحی عقائد و مسلمات کا جدید سائنسی انکشافات کے خلاف ہونا اور اہل کلیسا کا اپنے توہمات پر اڑ جانا نمایاں تھے۔ مثلاً مسیحی فکر میں زمین کو کائنات کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ یہ ان کے خدا کی جنم بھومی تھی۔ جبکہ سائنس کے نزدیک یہ بات خلافِ واقع تھی۔ لیکن انہوں نے اس حقیقت کو ماننے کے بجائے سختی سے جدید خیالات کو دبانے کی کوشش شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں مذہب کے خلاف جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔

انیسویں صدی تک مغربی فکر کے لیے نظریاتی طور پر بھی خدا کو ساتھ لے کر چلنا مشکل ہو گیا۔ مگر رکاوٹ یہ تھی کہ انسان ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ انکارِ خدا کے بعد لازمی تھا کہ خدا کے بغیر انسان اور کائنات کی توجیہ کی جائے اور ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے یہ بتانا ضروری تھا کہ بغیر ایک خالق کے کائنات اور انسان کیسے وجود میں آئے۔ قرآن بھی اپنے منکرین کے سامنے یہی دو سوال رکھتا ہے: ”کیا یہ بغیر کسی (پیدا کرنے والے) کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا انہوں نے ہی آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ یقین نہ کرنے والے لوگ ہیں“، (الطُّور 52:35-36)۔

کائنات کا مسئلہ تو خیر آج کے دن تک حل نہیں ہو سکا کہ یہ خالق کے بغیر کیسے بن سکتی ہے۔ اس کے برخلاف (Big Bang Theory) نے اب اس بات کا پورا امکان سائنسی بنیادوں پر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کا آغاز جس دھماکے سے ہوا، وہ ایک خالق کی بیرونی مداخلت کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا۔ البتہ اُس زمانے میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی صورت میں خدا کے بغیر انسان کی توجیہ کی ایک شکل لوگوں کے سامنے آ گئی۔ گویا بندر کے ہاتھ ناریل لگ گیا (نظریۂ ارتقا میں بندر اور انسان میں جو خصوصی تعلق ہے، یہ محاروہ پڑھتے ہوئے، وہ ذہن میں حاضر رہے)۔ حال یہ ہوا کہ ڈارون کو The man who killed the God کا خطاب مل گیا۔ نظریۂ ارتقا کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب، اس کی تمام تر علمی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود، یہی تھا کہ اس نے سائنسی بنیادوں پر خدا سے ہٹ کر انسان اور حیات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر کیا تھا سماجی، عمرانی، نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی علوم کے ماہرین کی ایک فوج انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اس اصول کی روشنی میں کام کرنے کے لیے کھڑی ہو گئی کہ انسان ایک بے خدا اور حیوانی الاصل ہستی ہے۔ ان علوم میں سے دو ایسے تھے جن سے موجودہ جنسی بے راہ روی کی فضا ہموار ہوئی۔ پہلا علم نفسیات کا تھا۔ فرائڈ نے اس پر کام کیا اور جنس کے جذبے کو بنیاد بنا کر تمام انسانی اعمال و اعتقادات کی تشریح کر ڈالی اور اسی بنیادی جبلت کو زندگی کی روحِ رواں قرار دیا۔

اس سے کہیں زیادہ اثر اس کام کا ہوا جو انسانی تہذیب پر کیا گیا۔ اس میں دکھایا گیا کہ جنسی اخلاقیات کا ماخذ فطرت یا مذہب نہیں بلکہ معاشی نظام ہے جو شکار سے زراعت اور زراعت سے صنعت تک پہنچا ہے۔ اس علم کے مرتبین نے بتایا کہ ابتدا میں انسانی معاشروں میں مرد و عورت کے

تعلقات مکمل جنسی آزادی کے اصول پر قائم تھے۔مگر جب انسان نے شکار سے زراعت کے عہد میں قدم رکھا تو زمین کی انفرادی ملکیت کا نظریہ پیدا ہوا۔ایک مرد کو زمین پر کام کاج کرنے کے لیے کام کرنے والوں کی ضرورت پڑی۔ ان کارکنوں کے حصول کا بہترین ذریعہ اولاد تھی۔اس کے لیے ضروری تھا کہ شادی کا سلسلہ شروع ہو جس میں کسی عورت کی وفاداریاں صرف ایک مرد سے وابستہ ہوں اوراس سے ہونے والی اولاد صرف اسی کی ملکیت ہو۔عورت کے ایک مرد کی ملکیت ہونے کے اسی تصور سے عصمت اور حیا کے تصورات پیدا ہوئے۔تا کہ ان پابندیوں سے عورتوں کی لگام ہمیشہ مردوں کے ہاتھ میں رہے۔جبکہ مردوں نے خودکو ہمیشہ ان زنجیروں سے آزاد رکھا ہے۔

اس تحقیق کے مطابق اب انسان نے زراعتی دور سے صنعتی دور میں قدم رکھ دیا ہے۔ پیداواری عمل میں نہ صرف انسانوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے بلکہ عورت خود معاشی طور پر مکمل آزاد ہے۔لہٰذا اب نہ کسی عورت کے ایک مرد سے جڑے رہنے کی کوئی ضرورت ہے نہ شادی کی، نہ عصمت کوئی قابل لحاظ شے ہے نہ حیا کی کوئی ضرورت ہے۔نتیجے کے طور پر خاندان کے بنیادی ادارے کی ساری اساسات ختم ہوگئیں۔

اس پس منظر کو اگر آپ ذہن میں رکھیں تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ کیوں اہل مغرب بغیر شادیوں کے ساتھ رہتے ہیں، کیوں خاندان کا ادارہ کمزور ہو چکا ہے، کیوں وہ شادی کے بعد بھی دیر سے اور کم بچے کرتے ہیں، کیوں عورتیں رسیاں تڑا کر گھر سے باہر نکل آنا ضروری سمجھتی ہیں اور کیوں جنسی تسکین کے لیے وہ ہر رکاوٹ کو پھلانگنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔

مسلمان اہل علم کی ذمہ داری

ہمارے مسلم معاشرے بھی بدقسمتی سے اسی راہ پر چل پڑے ہیں جو اہل مغرب کا راستہ ہے۔ایک طرف ہمارے معاشرے صنعتی دور میں داخل ہو چکے ہیں جس کے اپنے تقاضے اور

نتائج واثرات ہیں۔ دوسری طرف سیٹلائٹ، کیبل اور انٹرنیٹ کے ذریعے مغربی افکار اور اخلاقی بگاڑ ہمارے گھروں میں داخل ہوکر لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کررہے ہیں۔ تیسری طرف ہماری پڑوسی ہندو تہذیب مغرب کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بعد اس کا بگاڑ ہماری زبان میں بالخصوص ہماری عورتوں تک پہنچا رہی ہے۔ ان سب کے ساتھ ہماری اشرافیہ اور حکمران طبقات کا بڑا حصہ اوپر بیان کردہ مغربی افکار کے پروردہ ہیں اور اس فکر کو دن رات عوام میں روشن خیالی اور خواتین کے حقوق کے نام پر، پھیلانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ان حالات میں اہل مغرب کی جنسی بے راہ روی پر شور مچانے سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ ان تمام مغربی افکار و تحقیقات پر قرآن کی روشنی میں تنقید کی جائے جو اس اخلاقی بگاڑ کو جواز فراہم کرتی ہیں۔ یہ کام مسلمان اہل علم کے کرنے کا ہے۔ اگر انہوں نے یہ کام بر وقت نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ مغربی تہذیب کا یہ طوفان ہماری مذہبی اور معاشرتی اقدار کو ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک بہت اہم کرنے کا کام یہ بھی ہے کہ فکرِ آخرت کے تصور کو بھی عام کیا جائے کیونکہ مغربی تہذیب کے زہر کا حقیقی تریاق اگر کوئی ہے تو یہی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مغربی نقطۂ نظر بیان کرنے کے بعد خود میری یہ ذمہ داری تھی کہ میں اس کا جواب دوں۔ میں ایسا کرنا بھی چاہتا تھا۔ تاہم اس کا جواب تھوڑا تفصیل طلب ہے اور اگر اسی موقع پر میں اسے بیان کرنا شروع کردوں تو ان قارئین کے اعتبار سے جو صرف ایک سفرنامے کو ہی پڑھنا چاہتے ہیں یہ بحث بہت زیادہ طویل ہو جائے گی۔ اس لیے اسے میں کسی اور مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ وہ وقت انشاء اللہ جلد ہی آئے گا۔

امریکا کی جنتِ ارضی کا سفر

مشرق کا شکست خوردہ علم

امریکا جانا میرے پروگرام میں ابتدا سے شامل تھا کیونکہ میرے پاس اپنی بہن کا کافی سامان تھا اور ان سے ملے ہوئے بہت دن بھی ہوگئے تھے۔ اب جب کہ میرے سارے ابتدائی اور ضروری کام ہو چکے تو امریکا جانے کے لیے مناسب وقت آ گیا تھا۔ مگر مسئلہ وہی تھا کہ کینیڈا میں نیا ہونے کی بنا پر مجھے امریکا جانے کی اجازت ملنی بہت مشکل تھی۔ مزید یہ کہ میں فی الوقت کوئی ملازمت بھی نہیں کر رہا تھا جو ایک بہت بڑا منفی نکتہ تھا۔ ان حالات میں مجھے سرحد پر موجود امیگریشن آفیسر کو مطمئن کرنا تھا۔ وہ اگر مجھے سرحد سے لوٹا دیتا تو بہت خواری ہوتی۔ بہر حال میں نے اللہ کا نام لے کر جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں روانگی سے ایک دن قبل ٹرین کا ٹکٹ لینے کے لیے گھر سے نکلا۔ واپس آتے ہوئے میں بینک گیا تا کہ سفر کے لیے پیسے نکال سکوں۔ میں بینک کاؤنٹر کی لائن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا نمبر آیا تو میں اتفاق سے ایک ایسے کاؤنٹر پر گیا جہاں ایک مسلمان خاتون تھیں۔ انہوں نے مجھ سے بہت زیادہ جرح کی اور میرے سارے کاغذات چیک کیے۔ مگر آخر میں معذرت کر کے بتایا کہ حال ہی میں کسی نئے آنے والے کا اے ٹی ایم کارڈ کھو گیا اور کوئی دوسرا شخص اس کے ذریعے اس کے اکاؤنٹ سے پیسے نکلوا کر چلتا بنا اس لیے مجھے ایسا کرنا پڑا۔

میں نے اس بات کا برا نہیں منایا۔لیکن ایک دوسری بات مجھے پسند نہیں آئی۔ یہ ان کے حجاب کا طریقہ تھا۔ پچھلے دنوں فرانس اور ترکی میں مسلم طالبات کو سر پر اسکارف پہننے سے جبراً روکا گیا۔اس بات کا مسلم میڈیا پر بہت چرچا ہوا۔شاید اسی کا ردعمل تھا کہ مغرب میں مسلمان خواتین اکثر سر پر اسکارف لے لیتی ہیں۔ میں نے اپنے قیام کے دوران ایسی بہت سی خواتین کو دیکھا۔اور سب کو مشترکہ طور پر وہی غلطی کرتے ہوئے دیکھا جو ان خاتون نے کر رکھی تھی۔ان کے سر پر اسکارف تو تھا مگر سینے پر لباس کے اوپر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ یہ بظاہر ایک چھوٹی بات ہے مگر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں اس چھوٹی بات کو جس طرح خصوصی طور پر بیان کیا ہے اس بنا پر میں نے بھی بااہتمام اس کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ بالخصوص مغرب میں مسلم خواتین اسکارف پردہ ہی کی نیت سے پہنتی ہیں۔اس لیے انہیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ رہا مشرق تو وہاں ایک زمانے میں دوپٹہ اسی مقصد کے لیے گھروں میں پہنا جاتا تھا کہ سر اور سینہ دونوں بیک وقت اچھی طرح ڈھک جائیں۔مگر اب یہ بیچارہ ایک پٹی کی شکل میں نسوانی شانوں پر اِدھر اُدھر کہیں پڑا رہتا ہے اور مغربی تہذیب کے ہاتھوں مشرق کے شکست خوردہ علم کی طرح نظر آتا ہے۔

امریکی سرحد پر

اگلی صبح میں یونین اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ یہ ٹورنٹو کا ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے مجھے نیویارک کے لیے ٹرین میں بیٹھنا تھا۔کینیڈا میں یہ سروس (VIA TRAIN) کہلاتی ہے۔یہی ٹرین سرحد عبور کر کے امریکی ٹرین میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جہاں کینیڈین عملہ کی جگہ امریکی عملہ لے لیتا ہے اور ٹرین کا نام ''ایم ٹریک'' ہو جاتا ہے۔ میں ٹرین چلنے سے بمشکل دس منٹ قبل اسٹیشن پہنچا اور بھاگم بھاگ ٹرین پر سوار ہوا۔اس روز موسم کافی سرد تھا کیونکہ ہوا تیز تھی اور بادل چھائے ہوئے تھے۔ٹورنٹو میں سڑکوں پر جگہ جگہ درجۂ حرارت بتانے کے لیے سائن بورڈ بنے

ہوئے ہیں۔ جن کے مطابق اس وقت درجۂ حرارت چھ ڈگری تھا۔ ونڈ چل نہ جانے کتنی ہوگی۔

ہماری ٹرین وقت پر روانہ ہوئی اور دو گھنٹے بعد سرحد پر پہنچ گئی۔ راستے بھر میں امید و بیم کی کیفیت میں رہا۔ بیچ میں کچھ سرسبز و شاداب وادیاں اور جھیلیں بھی آئیں مگر میں کسی منظر سے لطف نہ لے سکا۔ کیونکہ اس بات کا پورا امکان تھا کہ مجھے واپس کر دیا جائے۔ نیا گرا فالز کی سرحد پر ٹرین رکی تو امریکی امیگریشن کے کچھ افسران ٹرین پر چڑھے۔ امریکا جانے والے صرف دو بوگیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ لوگ انہی دو بوگیوں میں پھیل گئے اور ایک ایک مسافر کا انٹرویو کرنے لگے۔ میرے پاس ایک افسر آیا اور سوالات کرنے گا۔ میرا کیس بہت کمزور تھا مگر وکیل بہت مضبوط۔ میں اسی کے بھروسے پر چلا تھا اس لیے بہت اطمینان سے اس کے سارے سوالوں کے جواب دیے۔ آخر کار وہ افسر میری باتوں سے مطمئن ہو گیا۔ میں نے اپنے وکیل، اپنے رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے خواری سے بچالیا۔

امیگریشن افسران کے ساتھ ایک کتا بھی تھا جو ہر سیٹ کے نیچے جا کر شاید منشیات کی بو سونگھتا تھا۔ یہ لوگ ایک گھنٹے تک ٹرین میں رہے اور متعدد لوگوں کو پکڑ کر لے گئے۔ ہماری ٹرین جو پہلے ہی کافی خالی تھی اور بھی خالی ہوگئی۔ غالباً وقت کی طوالت کی بنا پر ٹرین کا سفر کوئی بہت زیادہ پسندیدہ سفر نہیں سمجھا جاتا ہے۔ سرحد عبور کرنے کے بعد ٹرین امریکی نیا گرا فالز کے اسٹیشن پر آدھ گھنٹے کے لیے رکی۔ میں اسٹیشن پر اترا تاکہ اپنی بہن کو فون کر کے بتادوں کہ میں نے سرحد کراس کر لی ہے۔ مگر یہ بھول گیا کہ میں امریکا آچکا ہوں اور یہاں فون کرنے کے لیے امریکی کرنسی چاہیے جو میرے پاس اِس وقت نہیں ہے۔ اتفاق سے وہاں ایک پاکستانی لڑکی فون کر رہی تھی۔ اس نے اپنے کارڈ سے مجھے فون کرنے کی پیشکش کی جو میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لی۔

سفرنامہ اور ازدواجی زندگی

جب دوبارہ ٹرین روانہ ہوئی تو یہی لڑکی میرے پاس آئی۔ اس کا نام حنا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ٹورنٹو میں رہتی ہے۔ کالج کی طالبہ ہے اور ساتھ میں جاب بھی کرتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے انکل کے پاس نیویارک چھٹیاں منانے جارہی ہے۔ وہ اکیلی سفر کررہی ہے اور اس لیے بہت بور ہورہی ہے۔ میں بدقسمتی سے اسے کسی قسم کی کمپنی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اولاً میں تنہائی چاہتا تھا۔ ثانیاً کمپنی دینے کے لیے مجھے اسے اپنے ساتھ بٹھانا پڑتا۔ گو مغربی معاشرے میں یہ ایک معمول کی بات ہے، بالخصوص بس اور ٹرین میں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں جہاں مرد و زن ایک ساتھ ہی سفر کرتے ہیں۔ مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مغرب میں اپنے قیام کے دوران جب کبھی کوئی لڑکی ٹرین یا بس میں میرے پاس آکر بیٹھتی تو میں سیٹ چھوڑ کر کھڑا ہوجاتا۔ میں صرف اتنا اہتمام کرتا کہ میرا جسم اس کے جسم سے مس نہ ہونے پائے۔

یہ قارئین کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایسے بدذوق شخص کا سفرنامہ پڑھ رہے ہیں جو ریل کے ایک بہت رومانٹک سفر میں ایک تنہا نوجوان لڑکی کو ساتھ بٹھانے سے گریزاں ہے۔ جبکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑی دیر میں وہ لڑکی مصنف کے کندھے پر سر ٹکا کر سوجائے۔ ایک سفرنامے میں رنگ بھرنے کے لیے یہ آئیڈیل صورتحال ہے۔ مگر الحمدللہ راقم کوئی بڑا مصنف یا ادیب نہیں ایک عام آدمی ہے جسے روزِ قیامت خدا کے علاوہ واپس جاکر اپنی بیوی کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اور جو سفرنامے میں قارئین کی دلچسپی بڑھانے کے لیے، اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔

دعا مانگنا اور پڑھنا

بہرحال میں نے بدتمیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اخلاقاً بھی حنا کو پاس بیٹھنے کے لیے نہیں

کہا۔ اس نے کھڑے کھڑے میرے بارے میں دریافت کیا تو میں نے مختصراً اپنے بارے میں بتا دیا۔ اس نے حیرت سے سوال کیا کہ امیگریشن والوں نے آپ کو کیسے چھوڑ دیا۔ میں نے جواب دیا کہ اللہ نے میری مدد کی۔ اس نے کہا کہ آپ نے بہت دعائیں پڑھی ہوں گی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن اس ایک جملے میں اس نے ہماری قوم کی پوری مذہبی نفسیات کو کھول کر رکھ دیا۔ ہم اپنی مشکل کشائی کے لیے وظیفے اور دعائیں ''پڑھتے'' ہیں۔ جب انسان دعا ''پڑھتا'' ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں ان الفاظ میں کوئی جادوئی تاثیر ہے۔ یہ کوئی جنتر منتر ہے جس کے زبان سے نکالتے ہی یا خاص اوقات میں خاص تعداد میں دہرا لینے سے کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہو جائے گا۔ جبکہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ اصل چیز الفاظ نہیں ہوتے، وہ کیفیت ہوتی ہے جن میں ڈوب کر بندے کے قلب سے وہ الفاظ نکلتے ہیں جو سیدھے عرش تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ الفاظ ایک وقت میں ایک طرح کے ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں دوسری طرح کے۔ بعض اوقات تو الفاظ منہ سے نکل ہی نہیں پاتے۔ بس اٹھی ہوئی نگاہ، جھکا ہوا سر، لرزتے ہوئے ہونٹ اور بہتے ہوئے آنسو بندے کو اللہ عالم الغیب سے اس طرح جوڑ دیتے ہیں کہ بندے کی رضا رب کی رضا بن جاتی ہے۔ دعا خدا سے زندہ تعلق پیدا کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے مگر ہم اسے بھی بے دلی سے دہرائے ہوئے الفاظ میں ضائع کر دیتے ہیں۔

بہر کیف میرے پاس اس وقت قرآن، بائبل اور تاریخ کے موضوعات پر بعض کتابیں تھیں جو میں نے اس کے سامنے رکھ دیں کہ ان میں سے کوئی کتاب پڑھ کر ٹائم پاس کرو۔ اس نے تاریخ کی کتاب لے لی۔ تاہم تھوڑی دیر میں آ کر اس نے تاریخ کی کتاب یہ کہہ کر واپس کر دی کہ اس کی زبان بہت ثقیل ہے۔ اس کی جگہ وہ بائبل لے گئی۔

عیسائیوں سے ایک مکالمہ

کینیڈا میں ٹرین کافی آہستہ چلی تھی مگر امریکی سرحد میں داخل ہونے کے بعد اس کی رفتار میں کافی تیزی آ گئی ۔ پہلا بڑا شہر بفلو (Buffalo) آیا۔ اس کے بعد متعدد چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آئے ۔موسم خنک اور ٹھنڈا، سماں ابر آلود اور راستہ سرسبز و شاداب تھا۔ یہ سب مجھے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میرا پورا سفر اسی طرح گزر جاتا مگر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر سفر کا آخری نصف حصہ یعنی چھ گھنٹے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈالنے کا موقع بھی نہ ملا۔

اس واقعے کے بیان سے قبل بہتر ہوگا کہ میں اردگرد بیٹھے لوگوں کے بارے میں کچھ تفصیل بتادوں ۔ٹرین میں دائیں بائیں دو دو آدمیوں کی دو نشستیں تھیں ۔ان کے درمیان گزرگاہ تھی ۔ میں تنہا بیٹھا تھا۔ جبکہ مجھ سے آگے دو ادھیڑ عمر میاں بیوی اور میرے پیچھے ان کی نوجوان بیٹی بیٹھی تھی ۔ میرے دائیں طرف والی نشست پر ایک مسلم خاتون اپنی بچی کے ہمراہ سفر کر رہی تھیں ۔ان کے پیچھے دو نوجوان بیٹھے تھے جن میں سے ایک کو امیگریشن والے پکڑ کر لے گئے ۔ بعد میں میرے پیچھے بیٹھی ہوئی لڑکی آگے اپنے والد کی جگہ پر آ گئی اور اس کے والد میرے پیچھے والی نشست پر آ کر بیٹھ گئے ۔ان کے ساتھ ایک اور خاتون آ کر بیٹھ گئیں اور یہ دونوں عیسائی مذہب پر گفتگو کرنے لگے ۔ بالعموم اہل مغرب مذہب پر گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے مگر ان صاحب کا تعلق انڈیا سے تھا اور بیس سال قبل کینیڈا آ گئے تھے ۔شاید عیسائیت قبول کی تھی اس لیے بہت پر جوش بھی تھے ۔

اس دوران حنا پھر آ گئی اور کہنے لگی کے میرا سفر نہیں کٹ رہا کیونکہ اکیلے سفر کرنا بہت مشکل کام ہے ۔ مجھے اس سے پورا اتفاق تھا کیونکہ ایک پاکستانی لڑکی کے لیے بارہ گھنٹے کا تنہا سفر ایک قسم کی سزا ہی ہے ۔ اس نے بائبل مجھے واپس کردی ۔ اسی دوران میرے پیچھے بیٹھے ہوئے

صاحب نے میرے پاس بائبل دیکھ کر پوچھا کہ کیا میں عیسائی ہوں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔انہوں نے کہا چونکہ آپ کے پاس بائبل تھی اس لیے میں نے ایسا سوچا۔ میں مختصر بات کرنا چاہ رہا تھا اس لیے بات ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا کہ ہم مسلمان کتب سابقہ کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں ،اس لیے میں بائبل کا مطالعہ کر لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔انہیں شاید یہ گمان ہوا کہ میں عیسائی نہیں ہوں مگر عیسائیت سے متاثر ضرور ہوں اور اگر مجھ پر تھوڑی سی محنت کی جائے تو میں بھی عیسائی ہو جاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے عیسائیت اور بائبل کی حقانیت پر گفتگو شروع کر دی۔ میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا مگر حنا کو اپنی بوریت دور کرنے کے لیے ایک شغل ہاتھ آ گیا۔ اسے شاید اس طرح کی چیزوں میں کچھ دلچسپی بھی تھی کیونکہ بائبل لے جاتے وقت وہ یوحنا کی انجیل کے باب پر مجھ سے نشان لگوا کر لے گئی تھی۔

وہ بائبل سے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگی جس میں اسے مکمل ناکامی ہوئی۔ ایسے معاملات میں وہی شخص دخل دے جسے کافی کچھ علم ہو۔ میں خاموشی سے بیٹھا یہ مناظرہ سن رہا تھا۔ میری طبیعت میں ویسے بھی مناظرہ بازی کا کوئی رجحان نہیں، نہ اسے میں اثباتِ حق کا کوئی مؤثر ذریعہ سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں چونکہ کھڑے ہوئے تھے اس لیے اردگرد کے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے۔ یہ مناظرہ آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ جب بالکل صاف نظر آنے لگا کہ حنا کے اسلحے خانے میں اب کچھ نہیں بچا اور جو پہلے چلا وہ بھی بیکار گیا تو مجبوراً مجھے مداخلت کرنی پڑی۔ میرے لیے اب یہ نصرتِ دین کا مسئلہ تھا۔ میں اب بھی خاموش رہتا تو میرا مسلمان ہونا خدا کی نگاہ میں بے کار تھا۔ بالخصوص میرے اس علمی پس منظر کے ساتھ جو تھا تو بہت معمولی مگر اس گفتگو کے لیے کافی تھا۔ یہ گفتگو شروع بھی میری ذات سے ہوئی تھی اس لیے میرا مداخلت کرنا دخل در معقولات ہر گز نہ تھا۔

میں نے ان صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اس وقت جس مذہب پر ہوں دلیل کی بنیاد پر ہوں۔ یہ میرا آبائی عقیدہ ہرگز نہیں۔ میں نے اسلام کو ایک طویل علمی سفر کے بعد حق سمجھا ہے۔اس دوران میں نے اسلام کا تمام اہم ادیان و مذاہب سے تقابل کیا ہے اور تب ہی اسلام کو دین بنایا ہے۔ اسلام کے مقابلے میں عیسائیت کو رد کرنے کے دلائل میں بالکل سادہ انداز میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔ میں اگر غلط ہوں تو دلائل سے میری اصلاح کر دیجیے۔ دلیل کے سامنے آپ میرا سر جھکا ہوا پائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے عیسائیت کی بنیادی کتاب بائبل (عیسائیوں کی بائبل میں عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید دونوں شامل ہیں۔ چاروں اناجیل یعنی متی، مرقس، لوقا اور یوحنا، عہد نامہ جدید میں شامل ہیں) کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کا ریکارڈ سمجھا جاتا ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اس میں صرف وہی کچھ لکھا ہوا ہے جو آنجناب نے فرمایا۔ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ یہ بات ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ بائبل کے متن میں تحریف ہوئی ہے۔ اب کیا معلوم کہ اس میں کتنا حصہ اصل ہے اور کتنا حصہ اضافی ہے۔لہٰذا میں اس کتاب پر اپنے عقیدے کی بنیاد کیوں کر رکھوں۔ جبکہ دین اسلام کی بنیاد ایک ایسی کتاب پر ہے جو ابتدا سے آج تک بغیر کسی تبدیلی کے ہم تک پہنچی ہے۔اسلام کو مانا جائے یا نہیں لیکن یہ بات ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس کے پیش کرنے والے نے جو بات کہی تھی وہی بات آج تک قرآن کی شکل میں محفوظ ہے۔

دوسری بات یہ کہ عیسائیت کی بنیاد جن عقائد پر ہے وہ ایک معقول آدمی کے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔مثال کے طور پر آپ عقیدۂ تثلیث کے امکان کو عقلی طور پر ثابت کر دیجیے۔ اگر نہیں کر سکتے تو آپ دوسروں کو اس کی طرف کس بنیاد پر بلا رہے ہیں جبکہ ان کے پاس ایک زیادہ عقلی عقیدہ

موجود ہے۔

اس کے بعد اگلے کئی گھنٹوں تک وہ صاحب، ان کی بیوی، ان کی بیٹی شیرون اور ساتھ بیٹھا ہوا عیسائی نوجوان رابن ان دونوں باتوں کا جواب دینے کی کوشش کرتے رہے۔ میری پہلی بات کا جواب دینا ان میں سے کسی کے بھی بس سے باہر تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے کہ بائبل میں تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے Revised ورژن ہوتے ہیں۔ یعنی بائبل پر نظر ثانی ہوتی رہتی ہے۔ میں نے بحث برائے بحث سے بچتے ہوئے ان سے کہا کہ آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھے۔ کیا آپ کی (وہ صاحب پروٹسٹنٹ تھے) اور کیتھولک فرقے کی بائبل بالکل ایک ہے؟ اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ زمانی اثرات اور انسانی خیالات کے تحت بائبل تبدیل ہوتی رہی ہے۔ اس کے جواب میں ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اسی طرح دوسری بات کے جواب میں جو دلیل وہ پیش کرتے میں چند الفاظ میں اس کی بے معنویت کو واضح کر دیتا۔ مثلاً انھوں نے تثلیث کو ایک تکون سے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ صرف یہ کہیں کہ خدا تین ہیں تو یہ مثال بالکل درست ہے مگر آپ کو اس پر بھی اصرار ہے کہ خدا ایک ہے۔ گویا کہ ایک وجود بیک وقت تکون بھی ہے اور خط واحد بھی۔ یہ بات عقلی طور پر ماننے کے قابل نہیں۔ میں نے کہا کہ میں ایک سادہ عقیدے پر یقین رکھتا ہوں کہ خدا ایک ہے۔ اس پر ان کی بیوی فوراً بولیں کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ میں نے جواب میں کہا کہ پھر وہ تثلیث کہاں گئی؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس تضاد سے واقف نہیں جو آپ کے عقیدہ میں پایا جاتا ہے۔

دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ آپ مشرقی ملکوں (دونوں میاں بیوی اور رابن کا تعلق انڈیا

پاکستان سے تھا)میں پروان چڑھنے والوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آپ لوگ عقلی استدلال کے جواب میں جذباتی تقریریں کردینا کافی سمجھتے ہیں۔میں نے بہت سادہ بات آپ کے سامنے رکھی ہے اس کا عقلی جواب دیجیے۔ان لوگوں میں سب سے زیادہ معقول ان کی بیٹی شیرون تھی۔وہ ساری زندگی کینیڈا میں رہی اوراس وقت یونیورسٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کی طالبہ تھی۔اس نے میرے اعتراض کی معقولیت کوتسلیم کرلیااور کہا کہ میں تثلیث کوسمجھانہیں سکتی۔بس یہ روحانی طور پرمحسوس کرنے کی بات ہے۔میرے دل نے اسے سچ تسلیم کرلیا ہےاورآپ بھی خدا سے دعا کریں کہ وہ آپ کوتثلیث پریقین عطا کردے۔اس پرمیں نے ان لوگوں سے کہا کہ سب سے زیادہ درست بات شیرون نے کی ہے کہ تثلیث کوعقل سےنہیں سمجھا جاسکتا۔عقل کے بعداب نقل پر آیئے اور بائبل سے تثلیث کو اسی طرح ثابت کردیجیے جس طرح آپ بیان کررہے ہیں۔میرے اس سوال کا جواب بھی وہ نہ دے سکے۔

خدا، بیٹا اور سولی

اس ابتدائی گفتگو کے بعد وہ صاحب اوران کی بیوی تو ڈھیر ہوگئے اورمیدانِ جنگ چھوڑ گئے البتہ شیرون اورراابن ڈٹے رہے۔شیرون عیسائیت پراپنے ایمان کا معاملہ بیان کرکے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔جبکہ راابن پاکستان میں عیسائیوں پرہونے والے مظالم کو بیان کرنے لگا۔میں نے اس سے کہا کہ میں مسلمانوں کےنہیں اسلام کے وکیل کی حیثیت سے بات کررہاہوں۔کیا آپ ثابت کرسکتے ہیں کہ عیسائیوں پرظلم کرنا اسلامی تعلیم ہے۔اگرایسا ہےتو یہ نکتہ ہماری بحث میں شامل ہونا چاہیےوگرنہ نہیں۔ پھرمیں نے اس لایعنی بحث کوختم کرنے کے لیے گفتگو کا رخ موڑ دیااورشیرون سے کینیڈا اوراس کے بارے میں تفصیلات دریافت کرنے لگا۔مگرآخر کارگفتگوگھوم کروہیں آگئی جہاں سے چلی تھی۔شیرون نے ایک دفعہ پھرعیسائیت پر

اپنے قوی روحانی یقین کا تفصیلی اظہار کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسلام کی دعوت پیش کرنا اب میری ذمہ داری ہے اس لیے کہ محض عیسائیت پر تنقید کرنا میرا مقصد تھا نہ اس کا کوئی فائدہ۔

جب وہ گھنٹہ بھر بول چکی تو میں نے کہا کہ میں بھی آپ کو بتانا چاہوں گا کہ میں کیوں مسلمان ہوں۔ میں نے کہا کہ ایک صاحبِ شعور آدمی کی حیثیت سے مجھے اسلام کی یہ بات سب سے زیادہ پسند ہے کہ اس کی تعلیمات جیسا کہ اس کے اولین داعی نے پیش کی تھیں آج کے دن تک بعینہٖ موجود ہیں۔ انھوں نے خدا کا نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ سچے ہیں تو ہمارے سامنے ٹھیک خدا کی بات موجود ہے۔ جبکہ دیگر تمام مذاہب، بلا استثنا، یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں کہ ان کے اولین داعی نے جو کچھ کہا وہ آج کے دن تک محفوظ ہے۔ گویا اگر انھیں سچا مان بھی لیا جائے تو ضروری نہیں کہ ان کی بات کو سچ مانا جائے۔ کیونکہ وہ تو تبدیل ہو چکی۔ دوسری بات یہ ہے کہ خدا کو جاننے کا ذریعہ مذاہب ہی نہیں یہ کائنات بھی ہے۔ اور یہ کائنات جس قسم کے خدا کا تعارف کراتی ہے وہ غیر معمولی حد تک بلند و عظیم ہے۔ یہ کائنات آخری حد تک عقلی اصولوں پر استوار ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ خدا جس نے یہ کائنات بنائی جب اپنا پیغام بھیجے تو اس میں غیر عقلی باتیں ڈال دے اور اس میں خدا کی ایک مضحکہ خیز تصویر سامنے آئے۔ اسلام واحد مذہب ہے جس کی ہر بات عقل کے عین مطابق ہے اور اس کی کتاب سے خدا کی عظمت کا صحیح تصور سامنے آتا ہے۔ مجھے اسلام کی یہ خوبیاں کسی دوسرے مذہب میں نظر نہیں آئیں۔

پھر میں نے اسلام کی تعلیم پیش کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کے فلسفے کے مطابق خدا نے اس دنیا میں انسان کو آزمائش کے لیے بھیجا ہے۔ اس نے ہر دور میں اپنے رسولوں کو ایک ہی پیغام دے کر بھیجا ہے کہ لوگو! تمہارا رب ایک ہی ہے اور ایک روز تمھیں اس کے حضور حاضر ہو کر اپنے

اعمال کا جواب دینا ہے۔ اگر تم اچھے کام کرو گے تو اس کی نعمت بھری جنت میں جاؤ گے اور برے کام کرو گے تو جہنم تمہارا مقدر ہو گی۔ اسلام کے فلسفے اور اس کی تعلیم میں آپ کو کوئی بھی کمی یا علمی اور عقلی نقص نظر آئے تو بتایئے۔ ابھی نہیں تو بعد میں سوچ کر اعتراض کر لیں۔ میں نے ان دونوں کو اپنا ای میل ایڈریس بھی دیا۔

میری اس گفتگو کے پس منظر میں دراصل میرے وہ اعتراضات تھے جو میں پہلے عیسائیت کی تعلیمات پر کر چکا تھا۔ مثلاً میں نے کہا تھا کہ خدا کو بیٹے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ جواب ملا کے آدمؑ وحوا کے اس گناہ (Original Sin) کی بنا پر جو ابتدائے آفرینش میں انہوں نے ممنوعہ درخت کا پھل کھا کر کیا۔ جس کی بنا پر پوری انسانیت گنہگار ہو گئی۔ چنانچہ خدا نے اپنے بیٹے کو انسان کی شکل میں دنیا میں بھیجا تا کہ وہ سولی پر چڑھ کر پوری انسانیت کی طرف سے کفارہ ادا کر دے۔

میں نے کہا یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ اگر آدمؑ نے بالفرض کوئی گناہ کیا تو اس کی ذمہ داری ان کی اولاد پر کیوں ڈالی جائے۔ یہ تو خلافِ عدل ہے۔ دوسرے یہ کہ گناہ آدمؑ نے کیا تھا تو کفارہ بھی وہی دیتے۔ خدا نے اس مقصد کے لیے کیوں پہلے ایک بیٹے کو پیدا کیا اور پھر اس کو سولی پر بھی چڑھا دیا۔ ایک کے جرم کا بدلہ دوسرے کو دینا کیا ظلم نہیں ہے؟ آپ جس کفارے کو خدا کی رحمت کہتے ہیں وہ تو اس کے ظلم کا ثبوت ہے۔ تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کے مطابق عیسیٰ بھی خدا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انسانوں کے جرم کی سزا خدا نے اپنے آپ کو کیوں دی۔ عجیب منطق ہے۔ جرم آدمؑ نے کیا، مجرم اولادِ آدمؑ ہوئی اور سزا خدا نے بھگتی۔ پچھلی بات اگر خدا کے ظلم کا ثبوت ہے تو یہ بات اس کی حماقت کا (معاذ اللہ)۔

پھر اس کفارہ کا وقت بھی محل نظر ہے۔ اس کی اگر کوئی ضرورت بھی تھی تو اس کا مناسب

وقت حضرت آدمؑ سے متصل زمانہ تھا تا کہ بعد میں آنے والے تمام لوگ کفارہ پر ایمان لاتے اور نجات پاتے۔ یہ واقعہ صرف دو ہزار سال قبل پیش آیا۔ سوال یہ ہے کہ اس سے پہلے لوگوں کی نجات کیسے ہوتی تھی؟ جیسے بھی ہوتی تھی کم از کم کفارے کے عقیدے کو مان کر تو ہوتی نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تک تو یہ واقعہ ہوا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کفارے کو مانے بغیر نجات ہوتی رہی ہے۔ تو دو ہزار سال قبل خدا کو اچانک یہ خیال کیسے آ گیا کہ اب نجات کے لیے بیٹا پیدا کروں اور اسے سولی پر چڑھواؤں؟

پھر میں نے پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایک سادہ راستہ یہ نہیں تھا کہ وہ آدمؑ کو معاف کر دیتے؟ میں جس مذہب پر ہوں اس نے مجھے یہی بتایا ہے کہ خدا نے آدمؑ کو معاف کر دیا تھا۔ آپ بتائیے کہ کون سی بات عقل سے قریب ہے۔ بلا وجہ بیٹا پیدا کر کے سولی پر لٹکوانا یا سیدھا سا آدمؑ کو معاف کر دینا۔

عصائے قرآن

خدا نے اپنے رسولوں کو مختلف معجزات سے نوازا ہے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن سب سے زندہ اور عظیم معجزہ ہے۔ بڑے بڑے کام کرنے والا حضرت موسیٰ کا عصا ان کے بعد محض لکڑی کی ایک عام چھڑی بن کر رہ گیا تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرآن آج بھی ہر سانپ کو رسی میں بدل دیتا ہے۔ اس روز مجھے اس کا ایک مشاہدہ ہوا۔ میں نے اپنی بات کے آخر میں سورۃ المائدہ کی آخری آیات کا مفہوم ان کے سامنے بیان کیا جس میں، بروزِ قیامت، اللہ تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ کا مکالمہ نقل ہوا ہے۔ میرا مقصد خدا کی عظمت اور حضرت عیسیٰؑ جیسے عظیم ترین انسان کی حالت کا بیان تھا جو خدا کی ہیبت سے ان کے اوپر طاری ہوگئی۔ ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ سے جو عبدیت اور بے کسی جھلک رہی ہے اور خدا کے کلام سے

جو غضب (خیال رہے کہ غضب کا رخ عیسائیوں کی طرف ہے) ٹپک رہا ہے وہ کسی بھی ترجمے اور خاص طور پر اس انگریزی ترجمے کی، جو میں اس وقت کر رہا تھا، گرفت میں نہیں آ سکتا۔ بالخصوص جب حضرت عیسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے عیسیٰ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بنالو۔ مجھے دوسروں کی قلبی حالت کا تو اندازہ نہیں لیکن اس وقت میرا اپنا حال یہ ہوگیا کہ گویا میرا اپنا دل پھٹ جاتا۔ ان سب پر بھی سناٹا طاری ہوگیا جو بہت دیر تک رہا۔ شاید وہی سناٹا جو جادوگروں کے سانپوں کے رسیوں میں تبدیل ہو جانے پر ہوگیا ہوگا۔

اس وقت ٹرین اپنی منزل کے قریب پہنچنے والی تھی۔ قرآن کے بعد ہم سب نے جان لیا تھا کہ کہنے سننے کی ساری بات ختم ہو چکی ہے۔ رابن کچھ کہے بغیر اپنی سیٹ پر چلا گیا اور شیرون جو پچھلے چھ گھنٹے سے میری طرف رخ کیے اپنی سیٹ پر الٹی بیٹھی تھی خاموشی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ البتہ حنا وہیں کھڑی رہی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ یہ بے چاری چھ گھنٹے سے کھڑی ہوئی ہے۔ اترنے سے قبل میں نے بہت خوشگوار انداز میں ان لوگوں سے اجازت لی اور واضح کیا کہ کسی کی دل آزاری یا مناظرہ بازی میرا مقصود نہ تھا۔ بہرحال ہم اچھی طرح مل کر رخصت ہوئے۔

میں اس چھ گھنٹے کی بحث میں بمشکل آدھ گھنٹے ہی بولا ہوں گا۔ میں نے اسلام کا دفاع کیا تھا تو کسی تعصب کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ اس بنا پر کہ یہ اس دنیا میں حقیقت کو جاننے کا واحد ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک حق کو عقل سے دریافت کرنا چاہیئے اور دل سے عمل کرنا چاہیے۔ میں نے ان کے لیے اور اپنے لیے بھی خدا سے ہدایت کی دعا کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ امریکا کی سرزمین میں داخل ہوتے ہی میں نے امریکا والوں کے لیے دعا کی تھی کہ اے اللہ تو ان لوگوں کو ہدایت کی روشنی عطا فرما۔

آخر میں ایک مومنہ

میں جس وقت ان لوگوں سے فارغ ہوا تو ٹرین نیویارک شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ میں اللہ کا شکر ادا کر کے اور سکون کا سانس لے کر بیٹھا تو حنا نے مجھ سے کہا کہ آپ بہت صاحبِ علم ہیں، میرے بھی کچھ اعتراضات ہیں انہیں حل کر دیں۔ وقت کم تھا اور اتنا موقع نہیں تھا کہ میں اپنے بارے میں اس کی غلط فہمی دور کرتا اس لیے اختصار کے ساتھ کہا کہ فرمایئے۔ اس نے کہا کہ قرآن میں ایک لفظ کے نجانے کتنے مفہوم ہوتے ہیں...... میں نے اس کی بات بیچ سے اچک کر کہا کہ یہ درست نہیں۔ میں نے اپنا رجسٹر اٹھا کر کہا کہ دیکھیں میں ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ میں اس میں اگر ایک لفظ لکھتا ہوں تو ڈکشنری میں اس کے بہت سے مفاہیم ہوں گے، مگر میری کتاب میں اس کا ایک ہی مطلب ہوگا جس کا فیصلہ سیاق وسباق کرے گا۔ یہی معاملہ ہر کتاب کا ہوتا ہے اور یہی معاملہ قرآن کا بھی ہے۔ میں نے مزید کہا کہ آپ نے کبھی امتحان میں یہ سوال نہیں حل کیا کہ سیاق وسباق کی روشنی میں پیراگراف کی تشریح کریں۔ اگر آپ اپنا یہی اصول جو قرآن پر اپلائی کر رہی ہیں اس پر اپلائی کریں گی تو آپ کو صفر ملے گا۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر اس نے ایک دوسرے انداز سے اپنی بات سامنے رکھی تو اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق ایک خاص مکتبِ فکر سے ہے۔ بہرحال میں نے قرآن کی روشنی میں اس کا جواب اختصار کے ساتھ دے دیا کیونکہ ٹرین رک چکی تھی۔ تاہم تھوڑی دیر قبل عیسائیوں کے مقابلے میں میری جس ''علمی برتری'' کا وہ اعتراف کر چکی تھی اب وہ اس کی نگاہوں میں بے وقعت ٹھہری۔ مجھے انسانی طبیعت کے اس پہلو کا خوب اندازہ ہے کہ انسان حق پرست نہیں ہوتا، خود پرست ہوتا ہے۔ دلیل کے بعد اپنی ذات ونظریات کی نفی کر کے حق قبول کرنے والے لوگ خال خال ہی ہوا کرتے ہیں۔ حنا نے مجھ سے کہا کہ وہ ای میل پر اپنا مقدمہ

پیش کرے گی۔ میں نے کہا کہ میں انتظار کرونگا۔تادمِ اشاعت یہ انتظار ختم نہیں ہوا۔

ہدایت حاصل کرنے کا معیار

شیرون نے مجھ سے بار بار کہا تھا کہ آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ آپ کو ہدایت دے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ تو دن میں کئی دفعہ نماز میں یہ دعا کرتے ہیں۔تاہم اس رات ایک واقعہ پیش آیا جس سے مجھے اس بات کا عملی تجربہ ہوا کہ راہ پانے کے لیے صرف دعا کافی نہیں بلکہ انسان کو ہدایت کے حصول میں عملاً بھی سنجیدہ ہونا چاہیے اور اس طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے جو ہدایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ہماری ٹرین دس بجے کے قریب نیو یارک کے پین اسٹیشن (یہ ''پین'' دراصل امریکی ریاست پینسلوینیا کا مخفف ہے) پر پہنچی۔ٹرین سے اتر کر میں لاؤنج میں آیا۔ یہ ایک بہت خوبصورت لاؤنج تھا جو دیکھنے میں کسی ایئرپورٹ کا لاؤنج لگتا تھا۔ ویٹنگ ایریا میں موجود فون سے میں نے بہن کو فون کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بہنوئی یعنی فہیم بھائی پہنچنے والے ہوں گے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد فہیم بھائی نظر آئے۔ میں نے انہیں سات سال بعد دیکھا تھا مگر ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں نظر آئی۔

ہم اسٹیشن سے نکل کر سب وے میں آ گئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ ہماری مطلوبہ ٹرین اس وقت بند ہو چکی ہے۔ نیو یارک کا ریلوے نظام دنیا کا سب سے بڑا انظام ہے۔ٹورنٹو کے برخلاف اس میں ٹرینوں کے درجنوں روٹس ہیں۔ خیر ہم گھر سے قریب ترین والی ٹرین میں بیٹھے۔ہمیں کوئنز کے علاقے میں جانا تھا۔ میرے بہنوئی چونکہ اس علاقے میں نئے آئے تھے اور گھر جانے کے لیے اس ٹرین میں نہیں بیٹھتے تھے اس لیے ٹرین سے اتر کر گھر کی مخالف سمت میں چلے گئے۔ رات کا وقت، سنسان علاقہ۔ کوئی شخص نہ تھا کہ صحیح راستہ بتاتا۔نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کافی دیر تک بھٹکتے

رہے۔ بہت چلنے کے بعد ایک صاحب ملے جنھوں نے بتایا کہ ہم الٹی سمت جا رہے ہیں۔ ہم واپس پلٹے اور بہت دیر چلنے کے بعد گھر پہنچے۔ اسٹیشن سے گھر پہنچنے میں تین گھنٹے لگے۔ جتنی کوفت ٹرین کے بارہ گھنٹے کے سفر میں نہیں ہوئی تھی اس دوران ہوگئی۔ شدید ٹھنڈ، ہاتھوں میں بھاری سامان، سارے دن کی تھکن، بے یقینی کی کیفیت اور سنسان رات میں لٹیروں کا خوف۔ ان سب چیزوں کے ساتھ پیدل چلنا کافی تکلیف دہ تجربہ تھا۔ تاہم بعد میں احساس ہوا کہ یہ خدا کی طرف سے ایک عملی تربیت تھی۔

میں اس دوران اللہ سے دعا مانگتا رہا۔ مگر اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے صرف دعا پر انحصار نہیں کیا بلکہ راستے کی نشانیوں اور خارج کی رہنمائی سے بھی پوری مدد لی۔ بیشک خدا نے مدد کی کہ کوئی حادثہ نہ ہوا اور رات ایک بجے رہنمائی کے لیے ایک شخص اپنے گھر سے باہر کھڑا مل گیا۔ تاہم گھر ہم اس لیے پہنچے کہ ہم نے بلاتعصب خارج کی رہنمائی کو قبول کیا۔ انسان آخرت اور خدا کے معاملے میں بھی انھی اصولوں کی پیروی شروع کردے جن کی دنیا کے معاملے میں کرتا ہے تو ولیوں کے درجے پر پہنچ جائے۔ مگر انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دنیا کے معاملے میں بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ لیکن آخرت کے معاملے میں بہت احمق۔

چاند کا دن میں نظارہ

گھر پہنچ کر بہن سے ملا۔ وہ بے چاری کب سے ہمارے انتظار میں پریشان ہو رہی تھیں۔ میری تینوں بھانجیاں -ندرت، ماہ رخ اور عائشہ- سو چکی تھیں۔ بہن نے کئی قسم کے کھانے بنا رکھے تھے۔ مگر میری ساری بھوک خواری کی نذر ہوچکی تھی۔ تاہم آنے والے دنوں میں اس خواری کا حساب برابر ہوگیا۔

اگلا دن میں نے آرام کرتے ہوئے گزارا۔ اس کے بعد اگلے دو دن تک ہم روز صبح کے

وقت نیو یارک کو دیکھنے کے لیے نکل جاتے۔ دراصل فہیم بھائی کی جاب کے اوقات دوپہر سے رات تک تھے۔ اس لیے وہ صبح کے وقت ہی فارغ ہوتے۔ ویسے شہر دیکھنے اور گھومنے کا اصل مزہ رات میں تھا جب روشنیوں کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کر دیتی۔ لیکن اس کے لیے ویک اینڈ کا انتظار کرنا پڑتا۔ لہٰذا ہم دن میں ہی گھوم لیے۔ میں نے ان دو دنوں میں تمام راستے اور ٹرانسپورٹ سسٹم اس طرح سمجھ لیا کہ آنے والے دنوں میں تنِ تنہا پورا نیو یارک کھنگال لیا۔

نگہت باجی نے میرے دن کے وقت شہر گھومنے پر بڑا خوبصورت تبصرہ کیا کہ نیو یارک کو دن میں دیکھنا ایسا ہی ہے جیسے چاند کا نظارہ دن میں کیا جائے۔ بعد میں رات کے وقت جب ان جگہوں پر آیا تو سو فیصد اس تبصرے کو درست پایا۔ بلا شبہ یہ شہر چاند ہے بشرطیکہ رات میں دیکھا جائے۔

جنتِ ارضی اور جنتِ سماوی

امریکا کم وبیش ایک برِ اعظم جتنا وسیع ہے۔ یہاں فطرت اپنے ہر رنگ میں جلوہ گر ہے۔ عظیم سمندر، طویل ساحل، لق ودق صحرا، بلند پہاڑ، بہتے دریا، سر سبز و شاداب میدان، گھنے جنگلات، شدید گرمی، سخت سردی، ہر سو پھیلی بہار اور اجاڑ خزاں۔ غرض قدرت کی ہر صناعی یہاں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اس پر انسانوں کی کاریگری نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے۔ جدید سائنس کی مدد سے مغربی تہذیب نے انسانی زندگی کو جن سہولتوں سے بہرہ مند کیا ہے، وقت کی رفتار کو جس طرح تیز کیا ہے، فطرت کی نیرنگیوں کے ساتھ انسانی عقل و ہنر کے جو کرشمے دکھائے ہیں، ان کے مشاہدے کے لیے یہ بہترین جگہ ہے۔

یہ سرزمین اپنے معاشی استحکام کی بنا پر غریب ملکوں کے نوجوانوں کا خواب ہے۔ اپنے حسن و صناعی کی بنا پر دنیا بھر سے آنے والے سیاحوں کی منزل ہے۔ اپنی آزاد خیالی کی بنا پر بند

معاشروں کے افراد کے لیے مقامِ عیش ہے۔ یہاں انسان کو نہ صرف اپنی قیمت ملتی ہے بلکہ اس قیمت سے وہ ہر لذت خرید سکتا ہے۔ زندگی کا ہر حسن، دنیا کی ہر آسائش اور دورِ جدید کی ہر سہولت باافراط اور باآسانی یہاں دستیاب ہے۔ وہ جوانی جو زندگی کے ہر رنگ کو رنگین تر اور دنیا کے ہر حسن کو حسین تر بنا کر دکھاتی ہے، اپنے ظہور کے لیے اگر یہ زمین پالے تو انسان بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمیں ہست

ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

مگر یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ میں نے بارہا ان فلک بوس عمارتوں کو ایک جنگل کی طرح محسوس کیا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ انتہائی بلندی پر واقع اپنے شاندار دفاتر کی کھڑکیوں سے جب ٹریلین ڈالرز کا کاروبار کرنے والے سرمایہ دار باہر جھانکتے ہوں گے تو نیچے چلتے ہوئے انسان انہیں حشرات الارض محسوس ہوتے ہوں گے۔ ان میں سے نجانے کتنے ہوں گے جو ڈالروں کی جھنکار کے پیچھے اپنا ملک، اپنی زمین، اپنی ہوا، رشتے ناطے، چاہنے والے اور دوست احباب چھوڑ کر یہاں آئے ہوں گے۔ مگر یہ ڈالر درختوں پر نہیں لگتے۔ انسان کو اپنا آپ بیچنا پڑتا ہے۔ اپنا ضمیر، ایمان، دین، تہذیب اور بعض اوقات اولاد بھی تیاگنی پڑتی ہے۔

لوگ ایسے معاشرے کا حصہ بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی بنا سود پر ہے، جس کے ریشے ریشے میں قمار بازی کی روح سرائیت کی ہوئی ہے، جہاں عریانی ایک قدر ہے، جہاں شراب ایک ضرورت ہے، جہاں مفاد پرستی بقا کا راز ہے۔ غرض شجرِ ایمان کی جڑ کاٹ ڈالنے والا ہر تیشہ یہاں زندگی کا لازمہ ہے۔ یہ بات شاید آخرت فراموش لوگوں کے لیے قابلِ توجہ نہیں۔ مگر وہ جنہیں اپنے رب کا یہ فرمان یاد ہے: ''اس زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے اس کی زینت بنایا

ہے تا کہ آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔ اور جو کچھ اس پر ہے ہم اسے چٹیل میدان بنادینگے''، (الکہف 18: 7-8)، ان کی زندگی کا نصب العین یہ دنیا اور اس کی رنگینیاں نہیں بن سکتیں۔

منکرِ خدا و منکرِ آخرت تہذیب کا گہوارہ یہ سرزمین ایسی آزمائش ہے جس میں پڑنے کے بعد آدمی کا بچ نکلنا آسان نہیں۔ یا تو وہ ایک مجاہد کی زندگی گزارے وگرنہ شعوری نہ سہی لاشعوری طور پر انسان خود کو شیطان کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور پاتا ہے۔ یہاں آنے سے قبل میں نے سنا تھا کہ مغرب میں رہ کر بھی برائی سے بچا جاسکتا ہے۔ مگر آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ یہاں تو اکثر لوگوں کے لیے برائی کا معیار ہی بدل جاتا ہے۔

جو تھا ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

اس کے برخلاف ایک جنت خدا نے بنائی ہے۔ جس کا حسن کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا اور نہ کسی دل پر اس کا خیال گزرا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے، مقابلہ کرنے والوں کو مقابلہ کرنا چاہیے۔ اس جنت کی قیمت بس اتنی ہے کہ انسان اس دنیا کو جنت نہ سمجھے۔ اسے اپنی منزل نہ سمجھے، ایک سرائے سمجھے اور خود کو ایک مسافر۔ جو شخص یہ بات سمجھ لے گا وہ خود بخود اللہ کی فردوس تک جا پہنچے گا۔

ایک پاکستانی

ایک روز فہیم بھائی کے ساتھ بس میں جاتے ہوئے ایک مقامی آدمی ملا۔ یہ جان کر کہ ہم پاکستانی ہیں وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے بتایا کہ ایک پاکستانی نے اس کی بیماری کے دوران نہ صرف دوسال تک اس کے خاندان کا خیال رکھا بلکہ اس کے علاج پر اٹھنے والا دس ہزار ڈالر کا خرچہ بھی برداشت کیا۔ اور بعد میں یہ پیسے بھی معاف کر دیے۔ ایک پاکستانی کے مثالی رویے کی

بنا پر اب ہر پاکستانی اس کی نگاہ میں محترم ہو گیا۔ جس کا اظہار اس کے لفظ لفظ سے ہو رہا تھا۔ اس نے ہمیں جاب کے سلسلے میں مدد کی پیشکش بھی کی۔

مجھے خیال آیا کہ دورِ زوال سے قبل سارے مسلمان ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ لوگوں کو ہر دم ان کی ذات سے بلا تخصیص مذہب و نسل نفع پہنچتا تھا۔ چنانچہ لوگ ان کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتے حالانکہ یہ مسلمان ان پر تبلیغ کا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ بس ان کا طرزِ عمل دلوں سے تعصب ختم کر دیتا تھا اور پھر جب لوگ اسلام کی تعلیمات کو سنتے تو اسے اپنے دل کی آواز سمجھ کر قبول کر لیتے۔ آج مسلمان ایک دفعہ پھر یہی طرزِ عمل اختیار کر لیں تو اکیسویں صدی صرف اسلام کی صدی بن جائے گی۔

نیویارک کے شرمیلے باسی

ان دو دنوں میں شہر کی تمام اہم اور قابلِ ذکر جگہیں فہیم بھائی نے مجھے دکھا دیں اور نیویارک کا نقشہ بھی سمجھا دیا۔ شہر میں گھومتے پھرتے احساس ہوا کہ ہر چند کے ٹورنٹو کے مقابلے میں موسم کم ٹھنڈا تھا مگر لوگ نسبتاً جامے میں تھے۔ اس کا بظاہر سبب یہ محسوس ہوا کہ یہاں کے لوگ زیادہ شرم والے ہیں۔ مگر آنے والے ہفتے میں جب تیز گرمی پڑی اور لوگوں کو جس طرح جامے سے باہر آتے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شرم جس کھیت کی مولی ہے، اس کی زرخیزی کے لیے یہ زمین بہت ناموزوں ہے۔ دراصل بات یہ تھی کہ کینیڈا میں زیادہ ٹھنڈ پڑتی ہے اس لیے وہاں جیسے ہی موسم قدرے بہتر ہوتا ہے، لوگوں کو گرمی کی آمد کا احساس ہو جاتا ہے۔ جبکہ یہاں اِس درجہ کی ٹھنڈ کا مطلب ٹھنڈ ہی ہوتا ہے اور لوگ پینٹس جیکٹ میں ہی ملبوس رہتے ہیں۔ اگلے دن ایک خاتون کو اٹلانٹک سٹی میں دیکھا کہ شوق میں اسکرٹ جیسا ہوادار لباس تو پہن لیا مگر کھلی فضا میں جب یخ بستہ ہوا جسم سے ٹکرائی تو سی سی کرنے لگیں۔

اٹلانٹک سٹی کا سفر

اسی دوران ویک اینڈ آ گیا جس میں ہمارے پاس موقع تھا کہ ہم دور دراز مقامات کا سفر کریں۔شہر کے قابل ذکر مقامات بعد میں بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ ہمارے سامنے کئی جگہیں تھیں لیکن قرعۂ فال اٹلانٹک سٹی کے نام نکلا۔ یہاں جانے سے میرا مقصد محض سیر و تفریح نہ تھا۔ گو اس کے لیے بھی یہ بہترین جگہ ہے۔ امریکا کا یہ شہر مغربی تہذیب کے ایک اور پہلو یعنی قمار بازی کا نمائندہ ہے۔ یہ امریکا میں جوئے اور قمار بازی کا، لاس ویگاس کے بعد، دوسرا بڑا اڈہ ہے۔

فہیم بھائی نے اپنے ایک قریبی دوست عزیز بھائی کو بلا لیا جو نیویارک کی پڑوسی ریاست کنکٹی کٹ (Connecticut) میں رہائش پذیر ہیں۔ ہم ان کے ساتھ دوپہر کے قریب روانہ ہوئے۔ اٹلانٹک سٹی ریاست نیوجرسی میں واقع ہے اور نیویارک سے تقریباً سوڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ہے۔ عزیز بھائی نے نیویارک سے باہر نکلنے کے لیے مین ہٹن کا راستہ اختیار کیا۔ مگر چھٹی کا دن ہونے کے باوجود وہاں اتنا رش تھا کہ اس سے نکلتے نکلتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ مین ہٹن سے نکل کر ہم اس سرنگ میں داخل ہوئے جو پانی کے اندر بنائی گئی تھی۔ اس سرنگ سے گزرتے ہوئے محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ہم زیرِ آب سفر کر رہے ہیں۔ سرنگ سے گزر کر ہم نیوجرسی میں داخل ہو گئے۔

خلا کی سیاحت اور شادی بیاہ کے اخراجات

دورانِ سفر عزیز بھائی نے ریڈیو پر خبریں لگا دیں۔ اس روز دو خبریں نمایاں تھیں۔ پہلی خبر ساٹھ سالہ امریکی تاجر ڈینس ٹیٹو کے بارے میں تھی جو روسی راکٹ سویوس میں سوار ہو کر قازقستان کے خلائی مرکز سے خلا کے سفر کے لیے روانہ ہوا۔ اس طرح اس نے دنیا کے پہلے خلائی سیاح ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بیس ملین ڈالر کی خطیر رقم ادا

کی۔

انسان کے پاس جب بے حد دولت آجائے تو نت نئے شوق وجود میں آتے ہیں۔ مذکورہ بالا واقعہ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ یہ شوق ابتدا میں تو دولت مندوں تک محدود رہتے ہیں مگر ایک زمانہ آتا ہے کہ پوری سوسائٹی ان دولت مندوں کی پیروی میں انہیں اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے موقع پر جس طرح پیسہ لٹایا جاتا ہے اور جو نت نئی رسومات ایجاد کی گئی ہیں ان کا آغاز غریب غربا نے نہیں کیا۔ یہ بڑے لوگوں کے چونچلے تھے جو آہستہ آہستہ شادی کی سادہ رسم کے لوازمات میں شامل ہوگئے۔ اور اب لوگ قرضہ لے کر ان خرافات کا اہتمام کرتے ہیں ورنہ معاشرے میں ناک کٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دوسری طرف کتنے ہی لوگ ہیں جو نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہیں، جن کے گھروں میں جوان بہنیں اور بیٹیاں صرف اس وجہ سے بیٹھی ہیں کہ ان کے پاس مالی وسائل نہیں ہیں۔ افسوس کہ لوگ اپنے شوق کے لیے لاکھوں برباد کر دیتے ہیں۔ مگر دوسروں کی ضرورت کے لیے ایک دھیلہ نکالتے ہوئے بھی انہیں تکلیف ہوتی ہے۔

شراب نوشی کی ملزمہ

دوسری خبر شراب نوشی کی ایک ملزمہ کے بارے میں تھی۔ امریکا میں شراب نوشی پر کوئی پابندی نہیں لیکن شراب پینے کے لیے عمر کی ایک حد مقرر ہے جس کی خلاف ورزی ایک جرم ہے۔ اس روز کی دوسری خبر یہ تھی کہ امریکا کے صدر بش کی انیس سالہ صاحبزادی جینا کو پولیس نے شراب نوشی کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ یہ واقعہ ٹیکساس میں پیش آیا جہاں شراب نوشی کی کم سے کم عمر اکیس سال ہے۔ اس وقت جینا کو گرفتار نہیں کیا گیا صرف جرمانہ کیا گیا۔ لیکن موصوفہ عادی مجرمہ تھیں اس لیے بعد میں بھی متعدد دفعہ اسی جرم میں پکڑی گئیں اور کمیونٹی سروس کی سزا پانے

کے علاوہ ڈرائیونگ لائسنس بھی گنوا بیٹھیں۔ان کی استقامت سے ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ وہ اکیس سال کی ہو جائیں۔

اس واقعہ پر وہائٹ ہاؤس نے یہ بیان جاری کیا تھا کہ یہ بش فیملی کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں اس خبر کو سن کر سوچنے لگا کہ اگر یہ واقعہ اسلامی جمہوری پاکستان کی پاک سرزمین پر پیش آتا تو کیا ہوتا؟ قطع نظر اس کے کہ وہاں شراب نوشی ہر عمر میں اخلاقی ، مذہبی ،سماجی اور قانونی جرم ہے،صدر تو کجا کسی وزیر یا مشیر کی بیٹی/ بیٹا یہ کام کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو پولیس والے کا رویہ کیا ہوتا؟ جس لمحے ملزم اپنی شناخت ظاہر کرتا، پولیس والا دو سلوٹ مارتا اور چار بوتلیں اپنی طرف سے بھی پیش کر دیتا۔

ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

امریکہ میں سڑک پر ٹول ٹیکس لیا تو جاتا ہے مگر اس کے بدلے میں اتنی سہولتیں دستیاب ہیں کہ افسوس نہیں ہوتا۔سڑک اس قدر اچھی ہے کہ تیز رفتاری سے گاڑی چلنے کے باوجود جھٹکے نہیں لگتے۔راستہ انتہائی سرسبز و شاداب ہے۔سڑک کے دونوں طرف سیکڑوں میل تک جنگل کی صورت میں درختوں کا طویل سلسلہ چلتا چلا گیا ہے۔اس وقت موسمِ بہار کی آمد آمد تھی اور ٹھنٹھ درختوں پر سبزہ پھوٹا پڑ رہا تھا۔نگہت باجی نے بتایا کہ جب یہ درخت مکمل سبز ہو جاتے ہیں تو ان کی شادابی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ درخت قدرت کی کاریگری نہیں بلکہ انسانی کاوشوں کے نتیجے میں سڑک کے دونوں طرف نظر آتے ہیں۔ یہاں بارش بہت ہوتی ہے جس کی بنا پر زمین زرخیز ہے۔ انسانی عمل کی دیر تھی کہ یہ سرسبزی وجود میں آ گئی۔

راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سروس ایریا بھی بنے ہوئے ہیں جہاں رک کر مسافر تازہ دم ہوتے ہیں۔ان میں وسیع و عریض پارکنگ لاٹ اور ساتھ میں ملحقہ عمارت ہوتی ہے۔

ہر عمارت میں اسنیکس کی دکان اور کھانے پینے کے تمام لوازمات دستیاب ہیں۔ صاف ستھرے واش رومز کی سہولت بھی موجود ہے۔ راستوں کے نقشے اور اہم تفریحی مقامات کے معلوماتی کتابچے وغیرہ مفت مل جاتے ہیں۔ چھوٹی موٹی اشیا کی خریداری کی دکان بھی ہوتی ہے۔ اکثر جگہ فری انٹرنیٹ اور ای میل کی سہولت بھی ہے۔ غرض ہر وہ سہولت جس کا ایک مسافر طلبگار ہوسکتا ہے وہاں مل جاتی ہے۔ راستے میں پولیس کی گاڑیاں بھی ملیں۔ عزیز بھائی نے بتایا کہ یہ راستے میں چھپ کر کھڑی ہوتی ہیں تاکہ مسافروں کی رفتار کو چیک کرسکیں۔ اگر کوئی مسافر مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلا رہا ہو تو اسے ٹکٹ مل جاتا ہے۔ اگر راستے میں کوئی مسئلہ ہو جائے تو فون کر کے پولیس کو مدد کے لیے بھی بلایا جا سکتا ہے۔

انگریزی کا کرشمہ

ہمارے معاشرے میں جوئے کے اڈے پر جانے کو بڑا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جوا کھیلنا میں نے اس لیے نہیں لکھا کہ مختلف انعامی اسکیموں کے ذریعے اب پوری قوم گھر بیٹھے جوا کھیلتی ہے۔ جب سب ہی جواری ہیں تو کون برا کہے گا اور کون برا ٹھہرے گا۔ جوا ہوتا کیا ہے؟ صرف قسمت کی بنیاد پر پیسہ لگانا۔ نصیب نے یاوری کی تو کئی گنا کما لیا نہیں تو لگائی ہوئی رقم بھی ڈوبی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ جوئے خانے گئے یا نہیں۔ اب تو انٹرنیٹ پر جوا عام کھیلا جاتا ہے۔

ہمارے ذہن میں جوا خانے کا بڑا برا نقشہ تھا۔ تصور یہی تھا کہ جوا خانہ تو بدمعاشوں کا اڈا ہوتا ہے۔ ہمارے وہ قارئین جو جوئے کے تصور سے بھی پریشان ہو جاتے ہیں ان کی سہولت کے لیے ہم آئندہ جوئے خانے کے بجائے کیسینو کا لفظ استعمال کریں گے۔ دراصل ہماری قوم کی کچھ نفسیات بن گئی ہے کہ غلط تصورات، اعمال اور حرکتوں کو جب انگریزی میں بیان کیا جائے تو

وہ اچھی لگنے لگتی ہیں یا ان کی برائی کم ہو جاتی ہے۔مثلاً سود کو انٹرسٹ بلکہ پروفٹ کہہ کر جائز کر لیا جاتا ہے۔جنس پر گفتگو معیوب سمجھی جاتی ہے البتہ سیکس پر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔اردو میں جو الفاظ گالی شمار ہوتے ہیں جب انگریزی کا روپ دھارتے ہیں تو معیارِ قابلیت ٹھہرتے ہیں۔وغیرہ وغیرہ۔

تاہم ہمیں گھر میں ہی بتا دیا گیا تھا کہ یہاں ایک بالکل مختلف دنیا دیکھنے کو ملے گی۔ جب سہ پہر کے وقت وہاں پہنچے تو واقعی ایک بالکل مختلف دنیا نگاہوں کے سامنے آئی۔ ابتداءً عزیز بھائی مجھے انفارمیشن سنٹر لے گئے۔ وہاں مفت معلوماتی کتابچے دستیاب تھے۔ ان کا مقصد سیاحوں بلکہ زیادہ درست الفاظ میں جواریوں کو ضروری اور غیر ضروری سہولیات کی تفصیلات سے آگاہ کرنا تھا۔ میں ضروری سہولیات کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور ''غیر ضروری سہولیات'' کی تفصیل اخلاق سے گری ہوئی ہے۔لوگ جس وجہ سے یہاں آتے ہیں وہ ان کیسینوز کی بے مثل خوبصورتی اور ان میں کھیلا جانے والا جوا ہے۔وگرنہ یہاں جتنی دیگر چیزیں دستیاب ہیں مثلاً شراب، شباب، کباب، ساحل سمندر، شاپنگ سنٹرز اور دیگر تفریحات تو یہ مغربی معاشرے کا جزو لاینفک ہیں۔ جو کچھ ہمارے نزدیک معیوب ہے وہ اس سوسائٹی کا معروف ہے۔جب تک آپ اس معاشرے میں ہیں ان سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ انہیں نظر انداز کر سکتے ہیں۔

بورڈ واک (Board Walk)

یہ کیسینوز لبِ ساحل اس طرح تعمیر کیے گئے ہیں کہ ایک طرف بحر اوقیانوس کا تاحدِ نگاہ پھیلا پانی اور طویل ساحلی پٹی ہے تو دوسری طرف دکانوں کی لمبی قطار ہے جن میں طرح طرح کی چیزیں دستیاب ہیں۔ان دکانوں کے عقب میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع تیرہ عالیشان اور

وسیع وعریض کیسینوز ہیں جو دیکھنے میں محلوں جیسے ہیں۔ درمیان میں ایک بورڈ والک ہے جو دراصل تختوں سے بنی ایک چوڑی فٹ پاتھ ہے۔ یہ ساڑھے چار میل لمبی ہے جس پر چلتے ہوئے لوگ خریداری بھی کرتے ہیں اور ساحلی ہوا اور منظر کا لطف بھی لیتے ہیں۔ وہ لوگ جو اس طویل راستے پر چلتے چلتے تھک جائیں ان کے لیے ہاتھ گاڑی کی سواری موجود ہے۔ یہ رکشہ جیسی چیز ہے۔اس کا ڈرائیور اسے پیچھے سے دھکا دے کر چلاتا ہے اور اندر بیٹھنے والے چاروں طرف کا نظارہ کرتے جاتے ہیں۔سواریوں کو اگر سردی لگے تو ان کے سامنے کی سمت ایک سفید پلاسٹک ڈال دیا جاتا ہے تا کہ ہوا سے محفوظ رہ سکیں۔

اس وقت ماہِ اپریل کا اختتام تھا اور سردیوں کے اثرات ابھی باقی تھے جس کے اثر سے ساحل ان تمام خرافات سے پاک تھا جو موسم گرما میں یہاں کے معمولات میں شامل ہیں۔ ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی مگر اب چونکہ میں کینیڈین ہو چکا تھا اس لیے مجھے بری نہیں لگ رہی تھی۔

تھیم(Theme) کیسینوز

اس بورڈ والک پر چلتے چلتے ہم لوگ راستے میں آنے والے کیسینوز میں جاتے رہے۔ یہ کیسینوز چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں اور ان میں داخل ہو کر دن ورات کا فرق مٹ جاتا ہے۔ تاہم ان کی اصل رونق کا وقت رات کا ہوتا ہے۔ یہ حسن ورعنائی، تعمیر وزیبائش اور رونق وصفا میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ان میں سے بعض کسی خاص تھیم (Theme) پر بنائے گئے ہیں۔ یعنی کسی خاص واقعہ یا جگہ کو بنیاد بنا کر پورا کیسینو اسی پس منظر میں تعمیر کیا گیا ہے۔ان میں سے تین ایسے تھے جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔میں ان کی تفصیلات آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ان میں سے پہلا تاج محل اور ہندوستان کی قدیم تہذیب کے پس منظر میں بنایا گیا تھا۔

اس کا نام بھی تاج محل تھا۔اس کے داخلے کا دروازہ بہت خوبصورت اور دیدہ زیب تھا۔دن کے وقت بھی اس کے رنگوں نے عجب بہار دکھا رکھی تھی مگر رات کے وقت اس کی روشنیوں کا حسن انتہائی دلکش سماں دکھا رہا تھا۔اس کی تعمیر میں مغلیہ دور کے قلعوں اور محلوں کا انداز پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔اندر بھی ہر چیز ایسا ہی تاثر پیش کر رہی تھی ۔کہیں کوئی گھڑ سوار کھڑا تھا۔کہیں کوئی اڑن قالین پر سوار اڑتا چلا جا رہا تھا۔کہیں طویل العمر منکے والا سانپ بنا دیا گیا تھا۔کیسینو کے مختلف حصوں کے نام بھی اسی مناسبت سے رکھے گئے تھے۔مثلاً جس جگہ بڑے نوٹوں سے جوا کھیلا جاتا ہے اس ہال کا نام ''سلطان'' رکھا گیا تھا۔پھر دبیز قالینوں، دیوہیکل فانوسوں اور آرائشی شیشوں نے ماحول ایسا بنا دیا کہ مغلیہ دور کے شاہی محلوں کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔

دوسرا کیسینو جو مجھے پسند آیا اس کا نام "Wild Wild Wild West" تھا۔یہ امریکا کے قدیم دور کے پس منظر میں بنایا گیا تھا جب لوگ سونے کی تلاش میں امریکا کے صحرائی علاقوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔جو لوگ ویسٹرن فلموں سے واقف ہیں وہ اس پس منظر کو بخوبی سمجھتے اور لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ہم اندر داخل ہوئے تو ایک عجیب منظر تھا۔ایک بڑا سا مصنوعی آدمی ایک ٹب میں ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے میں شراب لیے پڑا تھا اور پاس میں سونے کی ڈلیاں پڑی تھیں۔گویا کہ وہ اس کامیابی کا جشن منا رہا تھا جو سونا پانے کی شکل میں اسے حاصل ہوئی تھی۔ہم آگے بڑھے تو ایک ہال میں پرانی وضع کی ٹرین چلتی ہوئی دکھائی دی۔ دیواروں پر اس دور کے کلچر اور عام واقعات کی عکاسی بڑے اچھے انداز میں کی گئی تھی۔یہ عکاسی تصویروں کی شکل میں نہیں تھی بلکہ باقاعدہ دیواروں پر مکانوں اور انسانوں کی شبیہیں بنائی گئی تھیں۔کہیں عورتیں اس دور کے لباس میں مکانوں سے جھانک رہی تھیں، کہیں کوئی ڈاکو بینک سے پیسے لوٹ کر فرار ہو رہا تھا اور کہیں پولیس اور شیرف نظر آ رہے تھے۔لطف یہ تھا کہ اس کیسینو

کے واش رومز بھی اسی دور کی طرز تعمیر کے مطابق بنائے گئے تھے۔

ہم ایک اور ہال کی طرف بڑھے جو سب سے زیادہ دلچسپ تھا۔ اگر چہ اس کیسینو میں ہر جگہ دیواروں سے پہاڑیوں کا تاثر دیا گیا تھا۔مگر یہاں ان پہاڑیوں سے پانی کا جھرنا بھی بہہ رہا تھا جو آگے جا کر ایک تالاب میں جا گرتا تھا۔ یہاں سونے کی موجودگی کا تاثر دینے کے لیے ان پہاڑیوں پر سنہری چمکیلی لکیریں بھی ڈالیں گئی تھیں۔سب سے زیادہ دلچسپ منظر اس تالاب نما دریا کا تھا۔ یہاں پہاڑیوں کے پس منظر میں ایک شخص اپنے گدھے کے ساتھ ہاتھ میں پلیٹ لیے کھڑا تھا۔ گویا کہ کوئی آدمی دریا کی ریت چھان کر پانی سے سونا نکالنے کی کوشش کررہا ہے۔اس منظر کی اصل خوبی یہ تھی کہ آدمی اور اس کا گدھا بالکل حقیقی لگ رہے تھے۔ میں جب ہال میں سائڈ کی طرف سے داخل ہوا تو تھوڑی دیر کے لیے یہی سمجھا کہ انہوں نے اس جگہ حقیقت کا عنصر پیدا کرنے کے لیے اصلی آدمی اور گدھے کو کھڑا کر دیا ہے۔دراصل ان کی حرکات حقیقت سے بہت قریب تھیں۔گدھا باقاعدہ چیختا اور اسکا مالک اس سے منہ ہلا کر باتیں بھی کررہا تھا۔ساتھ میں دیگر جانور مثلاً گدھ اور گلہریاں وغیرہ بھی بنے ہوئے تھے جو وقفے وقفے سے حرکت کررہے تھے۔ پہاڑوں کے ساتھ صحرائی درخت بھی بنے ہوئے تھے۔

ماحول کو حقیقت سے قریب کرنے کے لیے چھت کو گنبد نما آسمان کی شکل میں بنایا گیا تھا۔اس کا رنگ وقفے وقفے سے بدلتا رہتا۔جن سے دن اور رات کے مختلف اوقات کا تاثر ابھرتا۔صبح کا جھٹپٹا، دن کا اجالا، شام کی ملگجی روشنی اور رات کا تاروں بھرا آسمان۔سب وقفے وقفے سے آتے رہتے۔ان سب کے ساتھ ابر آلود موسم اور بارش کی بھی عکاسی کی گئی تھی، جس میں گرج چمک اور بارش کے صوتی اور بصری اثرات سے حقیقت کا رنگ بھرا گیا تھا۔غرض بڑی چابکدستی سے فطرت کی نقل کی گئی تھی۔ہم کافی دیر تک وہاں بیٹھے اور اس مہارت کی داد دیتے

رہے۔

تیسرا ایکسینو رومی سلطنت کی تھیم پر بنایا گیا تھا۔اس کا نام ''سیزر'' تھا۔مرکزی دروازے پر رومی انداز کی رتھوں،ان میں جتے گھوڑوں اور سوار کو بڑی متاثر کن مجسمہ سازی کے ذریعے دکھایا گیا تھا۔اندر بھی رومی تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے تعمیر و آرائش کی گئی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ اس کے ریسٹورنٹ کا حصہ پسند آیا۔ جسے اس زمانے کے مندر (Temple) اور قلعے کے پس منظر میں بنایا گیا تھا۔اس کے داخلی دروازے پر لگے بڑے بڑے پردے، قلعے کی دیواروں پر لگی جلتی ہوئی مشعلیں اوران کے ساتھ پہرے دار محافظ گو مصنوعی تھے مگر انھوں نے ماحول پر ایسا تاثر پیدا کر دیا کہ انسان لامحالہ خود کو اسی دور میں محسوس کرتا۔ ایک کونے میں سیزر کا بلند و بالا مجسمہ نصب تھا جس کے ساتھ ایک خوبصورت فوارہ بھی چل رہا تھا۔ان سب سے بڑھ آسمان کا ایک ایسا تاثر دیا گیا تھا جس نے تمام ماحول کو بے پناہ مسحور کن بنا دیا تھا۔چھوٹے چھوٹے جھلمل کرتے تارے اور خوبصورت آسمانی رنگ جسکے ساتھ روشنی کا تناسب ایسا حسین تھا کہ وقت کی رفتار تھمی ہوئی سی معلوم ہو رہی تھی۔

میری ٹریجڈی اور میرے ابنائے نوع کی ٹریجڈی

مجھے خاموش دیکھ کر میری بہن مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھیں کہ یہ سب کیسا لگ رہا ہے۔وہ اس جگہ کے بارے میں میرے تاثرات جاننا چاہتی تھیں۔مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کمالِ فن اور حسنِ صناعی نے مجھے گنگ کر دیا تھا۔ آپ اسے میری ٹریجڈی کہہ لیجیے کہ مجھے جب بھی کوئی چیز اس طرح متاثر کرتی ہے تو میں کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو جاتا ہوں۔میرا ذہن ہمیشہ مخلوق سے خالق کی طرف مڑ جاتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب انسان اپنے تمام تر عجز کے باوجود ایسی کاریگری دکھا سکتا ہے تو خدا – کائنات کا پالنہار اور تمام خزانوں کا مالک – جب فردوس کی صورت

میں اپنی خلاّقی کا مظاہرہ کرے گا تو اس کا عالم کیا ہوگا۔ یاقوت ومرجان کی وہ بیٹیاں چاندسورج جن کی دلکشی کو سجدہ کریں، شیشے اور موتی کے وہ محل جن کا مسالہ مشک وعنبر ہوگا، سونے اور چاندی کے وہ درخت جن کے سائے ابدی اور پھل ہر لمحہ قابلِ رسائی ہوں گے، بکھرے موتیوں جیسے وہ خدّام جو آخری حد تک مالک کے مزاج آشنا ہوں گے، دودھ، شہد، ماء مصفا اور شراب کی وہ نہریں جو پینے والوں کو ہر گھونٹ میں صحت وزندگی اور لطف ولذت کے ایک نئے ذائقے سے آشنا کریں گی اور نجانے کیا کیا کچھ۔ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ بتادیا ہے کہ جہاں تمہارے علم وادراک کی حدیں ختم ہوتی ہیں خدا کا فن وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اور خود خداوند یہ کہتا ہے کہ یہ وہ سلطنت ہے جہاں ملے گا جو مانگو گے اور جو تمہارا دل چاہے، وہ دیا جائے گا، جہاں خوف پر مار سکتا ہے نہ غم کا کوئی گزر ہے، جہاں ماضی اپنے تمام تر پچھتاووں کے ساتھ غیر موجود ہے اور مستقبل اپنے تمام تر اندیشوں کے ساتھ غیر حاضر۔ یہ خدا کے غلاموں کی ابدی بادشاہی ہے جس سے وہ نکلنا چاہیں گے نہ کوئی انہیں نکالے گا۔ کوشش کرنے والوں کو اس جنت کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ مقابلہ کرنے والوں کو اس جنت کے لیے مقابلہ کرنا چاہیے۔

انسان کے تحت الشعور میں کہیں اس فردوس کی کوئی جھلک ضرور موجود ہے جو اسے ہر جگہ اس کی نقل کرنے پر مجبور ضرور کرتی ہے۔ اللہ نے یہ جھلک انسان میں اس لیے رکھی ہے کہ انسان اللہ سے اس فردوس کو خرید لے۔ مگر پیغمبروں کی رہنمائی کھو دینے کے بعد انسان اس دنیا میں ہی فردوس کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ میں اور آپ کتنی سادگی سے زندگی گزار سکتے ہیں، مگر نہیں گزارتے۔ زندگی کو زیادہ سے زیادہ پرآسائش بنانے کی کوشش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی ساری توانائی دنیا میں اپنی جنت کی تعمیر کی کوشش میں گنوادیتے ہیں۔ مگر جنت نہیں بن پاتی۔ بار بار ہماری محدودیت ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ہم کھانا کھاتے ہیں مگر پیٹ بھر جاتا ہے، ہم

نکاح کرتے ہیں مگر یکسانیت سے اکتا جاتے ہیں۔ ہم تھک جاتے ہیں، اداس ہوجاتے ہیں ،بوڑھے ہوجاتے ہیں، بیزار ہوجاتے ہیں، بیمار ہوجاتے ہیں اور ہم......اپنی فردوسِ ناتمام کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور لوٹ جاتے ہیں۔ جہاں ہماری اصل جنت موجود ہے مگر اس وقت اسے خریدنے کے لیے ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہوگا۔ وہ تو سارا دنیا کی جنت کی تعمیر میں خرچ ہوچکا۔ ہاں کچھ ہوگا تو ابد تک اپنی محرومی پر رونا اور چلانا ہوگا۔ وہ میری ٹریجڈی تھی یہ میرے ابنائے نوع کی ٹریجڈی ہے۔ پتا نہیں کس کی ٹریجڈی زیادہ بڑی ہے۔کون جانے............

ون آرم بنڈٹ (One Arm Bandit)

یہ پورا شہر جس مقصد کے لیے آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا اس کا ابھی تک کوئی تذکرہ میں نے نہیں کیا۔ میرا اشارہ جوئے کی طرف ہے جو انسانی طبیعت میں موجود طمع کی آگ سے جنم لیتا ہے اور خاندان کے خاندان جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ ان تمام کیسینوز میں تمام مروجہ طریقوں کے مطابق جوا کھیلنے کی سہولت موجود ہے۔حتیٰ کہ دوسرے ممالک یعنی یورپ وغیرہ میں ہونے والی گھڑ دوڑ پر سیٹلائٹ کے ذریعے جوا کھیلنے کا بھی انتظام ہے۔ یہاں جن طریقوں سے جوا کھیلا جا رہا تھا میں نے ہر جگہ رک کر انہیں دیکھا تو سہی لیکن تفصیلات سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ایک قسم ایسی تھی جس پر سب سے زیادہ جوا کھیلا جا رہا تھا اور اسے سمجھنے میں مجھے کوئی دقت بھی نہیں ہوئی۔

اس طریقے میں ایک سلوٹ (Slot) مشین استعمال کی جاتی ہے۔ یہ مشین کم و بیش پٹرول پمپ پر لگی ہوئی پٹرول ڈالنے والی مشین جیسی ہوتی ہے۔ پٹرول ڈالنے والے پمپ کی طرح اس کے ایک طرف بازو نما ایک لیور لگا ہوتا ہے۔ جبکہ سامنے پیسے اور پٹرول کی مقدار بتانے والے نمبروں کی جگہ تصویریں یا بعض اوقات نمبر لگے ہوتے ہیں۔اس مشین میں سلوٹ

کے ذریعے مختلف قیمت کے سکّے ڈالے جاتے ہیں۔ پھر لیور کو پکڑ کر کھینچ لیا جاتا ہے۔ بعض مشینوں پر لیور کی جگہ بٹن لگا ہوتا ہے جسے دبایا جاتا ہے تو مشین پر لگی ہوئی تصویریں یا نمبر گھومنے لگتے ہیں۔ یہ اگر ایک خاص ترتیب میں آ کر ٹھہر جائیں، جو کہ مشین پر بنی ہوئی ہوتی ہے، تو کھیلنے والا ڈھیر سارے سکّے جیت جاتا ہے وگرنہ ڈالے ہوئے سکّے بھی چلے جاتے ہیں۔ ان تمام جوئے خانوں میں بندھے نوٹوں کے عوض سکّے لینے اور دینے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ بڑے نوٹوں سے جوا کھیلنا چاہیں انکے لیے ایسی مشینوں کا انتظام بھی ہے جن میں بڑے نوٹ ڈالے جا سکتے ہیں۔ بہر حال یہاں سلوٹ مشین جوئے کی سب سے مقبول عام قسم نظر آئی۔

اسی مشین سے متاثر ہو کر انگریزی زبان میں ون آرم بنڈٹ (One Arm Bandit) یعنی ایک بازو والے ڈاکو کی انتہائی مناسب اور حسبِ حال اصطلاح وجود میں آئی ہے۔ کیونکہ اکثر ڈالے ہوئے سکّوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ انسان ابتدا میں ایک کھیل اور تفریح سمجھ کر اس میدان میں کودتا ہے۔ مگر جوا ایک کھیل نہیں ایک لت ہے۔ جسے یہ لت لگ جائے وہ آخر کار اپنا سب کچھ اس ایک بازو والے ڈاکو کے ہاتھ لٹا دیتا ہے۔

کیسینوز کی کامیابی کا راز

ان کیسینوز میں ہونے والا جوا آنے والے جواریوں کے لیے تو بخت و اتفاق کی چیز ہو گی مگر ان کے چلانے والوں کے لیے یہ ایک منظّم کاروبار ہے جو قسمت کی بنیاد پر نہیں بلکہ باقاعدہ سوچ سمجھ کر چلایا جا رہا ہے۔ محلوں جیسے عالیشان کیسینوز، ان کے بے گنتی ملازمین، بے تحاشہ اخراجات ایک انویسٹمنٹ ہے جسے تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جوئے خانے جس اصول پر بنائے جاتے ہیں وہ یہ نہیں ہوتا کہ آنے والا جیت کر جائے۔ بلکہ اصول یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں لوگ آ کر جیت کی امید میں تھوڑا تھوڑا ہارتے جائیں۔ اس کے بعد چند اشخاص کو جتوا دیا جاتا ہے

اور ہارے ہوئے لوگوں کی رقم میں سے کچھ انہیں مل جاتا ہے اور باقی رقم جوئے خانے والوں کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ان کی بڑی کمائی ان سلوٹ مشینوں سے ہی ہوتی ہے جو سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں لگی ہوئی ہیں۔ان میں کھیلا جانے والا جوا ایک مکمل حسابی عمل ہے۔مثلاً ایک مشین میں سو لوگوں نے سو ڈالر ڈالے ہیں تو اس میں سے نوے ڈالر پندرہ آدمیوں میں مختلف تناسب سے تقسیم کر دیے جاتے ہیں۔ بقیہ دس ڈالر ان لوگوں کا نفع ہے۔ دن بھر میں کئی ملین ڈالر کا جوا کھیلا جاتا ہے چنانچہ ان کو بھاری منافع ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ان کیسینوز کے ساتھ بڑے بڑے ہوٹل بھی ہیں جہاں لوگ آ کر ٹھہرتے ہیں ان کا منافع الگ ہے۔شراب خانے اور کھانے پینے کی جگہیں مزید ہیں۔ نیز جو بڑے لوگ کھیلنے آتے ہیں ان کے لیے ہارنے اور جیتنے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ تو پیسہ لٹانے اور اپنی شان کا اظہار کرنے آتے ہیں۔ یہ لوگ سلوٹ مشینوں پر نہیں کھیلتے بلکہ انکے لیے خصوصی میزیں لگی ہوتی ہیں۔ ہاتھ میں قیمتی شرابوں کے جام لیے شعلہ بدن پری چہرہ حسیناؤں کے جھرمٹ میں یہ لوگ لاکھوں ڈالر ایک وقت میں لٹا دیتے ہیں۔

کیسینو کا ماحول اور جوا کھیلنے کی عمر

ہمارے ذہن میں مغربی تہذیب کا شاید یہ نقشہ ہے کہ یہ لوگ مادر پدر آزاد ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ عیش و مستی کو ہی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔مگر اس معاملے میں ان کے کچھ اصول ہیں۔ایک اصول یہ ہے کہ اپنے بچوں کے معاملے میں یہ لوگ حساس ہیں۔ جینا بش کے حوالے سے پیچھے بیان ہوا کہ شراب نوشی کی ایک عمر ہے۔سگریٹ کی تفصیل اگلے باب میں کینیڈا کے حوالے سے آئے گی۔ عصمت فروشی (جسے اقوام متحدہ کی سرکردگی میں ایک باعزت پیشہ قرار دلوائے جانے کی سرتوڑ کوششیں ہو رہی ہیں اور اسکے لیے Commercial

Sex Worker جیسی معزز نظر آنے والی اصطلاح استعمال ہو رہی ہے) کے لیے بھی عمر کی حد اکیس برس ہے۔

جوئے کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ہر جگہ دھڑ لے سے نہیں کھیلا جا تا۔عزیر بھائی نے مجھے بتایا کہ نیو یارک میں کوئی کیسینو نہیں۔ وہاں کے لوگ یہیں آتے ہیں۔ان تمام کیسینوز میں بھی اکیس سال سے کم عمر لوگوں کا داخلہ منع ہے۔ ہمارے جیسے لوگ جو صرف گھومنے پھرنے آتے ہیں، مجبوراًاپنے بچوں کو دروازے پر لے کر بیٹھتے ہیں۔جیسا کہ اوپر بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے ذہن میں جوئے خانے کا جو نقشہ تھا یہاں ایسا کچھ بھی نہیں دیکھا۔ ہمارے جیسوں کے لیے تو یہ ایک گھومنے پھرنے اور تفریح کرنے کی جگہ تھی۔شراب کے بار الگ بنے ہوئے تھے۔ان میں کہیں کہیں گلوکار گانا سنا رہے تھے۔کچھ ویٹرس جوئے کی مشینوں پر لوگوں کو مشروبات مہیا کر رہی تھیں۔لوگوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے باقاعدہ کیمرے لگے ہوئے تھے اور فساد کرنے والوں سے نمٹنے کے لیے خصوصی ملازمین ہاتھوں میں فون لیے گھوم رہے تھے۔

مغربی تہذیب کا دھوکا

میں ان کیسینوز میں تھا تو مغربی تہذیب کی کاریگری کی داد دینے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔تاہم بورڈ والک پر چلتے ہوئے ایک ایسا منظر دیکھا جس سے اندازہ ہوا کہ یہ تہذیب انسان کو اس طرح دھوکا دیتی ہے کہ اگر انسان سطح بین ہو تو افسانے کو حقیقت اور دنیا کو جنت سمجھ بیٹھے۔ ہوا یوں کہ ایک کیسینو کے باہر ایک بڑا اسانل دیکھا جو ہوا میں معلق تھا اور اس میں سے پانی نکل کر ایک دھار کی شکل میں نیچے گر رہا تھا۔لمحہ بھر کو میری آنکھوں نے یہ منظر دیکھا اور اسے قبول کر لیا۔کیونکہ یہ بالکل حقیقت لگتا تھا۔ پھر خیال آیا کہ کوئی نل ہوا میں کیسے معلق ہو سکتا ہے۔بغور دیکھنے پر اصل صورتحال واضح ہوئی کہ زمین سے پلاسٹک کا ایک گول پائپ اوپر آ رہا تھا۔اس کے اوپری سرے

پر نل کا دہانہ لگا ہوا تھا۔ اس طرح اس پائپ کے سہارے نل ہوا میں معلق تھا۔ پائپ میں پانی نیچے سے اوپر کی سمت جا رہا تھا اور پائپ کے اوپر والے حصے سے، جس میں نل فٹ تھا، نکل کر پائپ کے ساتھ ساتھ نیچے گر رہا تھا۔ پائپ چونکہ بے رنگ اور شفاف تھا اس لیے دیکھنے میں یہ تاثر بنتا تھا کہ نل سے پانی کی دھار نکل کر نیچے جارہی ہے۔ یہ مغربی تہذیب کی پوری کہانی ہے۔ وہ معاملے کو بالکل الٹی سمت سے دکھاتے ہیں۔ اور اس کمال کے ساتھ دکھاتے ہیں کہ سطح بین آدمی اسے دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ یہی حق ہے۔ چونکہ دنیا میں زیادہ تر لوگ سطح بین ہی ہوتے ہیں اس لیے یہ فکر دنیا کی غالب فکر بن چکی ہے۔ بہر حال اٹلانٹک سٹی کا سفر ایک بہت خوشگوار سفر تھا۔ جس میں مجھے مغربی زندگی کے اس پہلو کے بغور مشاہدے کا موقع ملا۔

لیک جارج کا سفر

اگلے روز ہم لوگوں نے لیک جارج جانے کا پروگرام بنایا۔ اس جگہ کی وجہ انتخاب اس کی فطری خوبصورتی تھی۔ یہ جھیل جسے امریکا میں جھیلوں کی ملکہ کہا جاتا ہے نیویارک ریاست میں، نیویارک شہر سے تقریباً چار گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے۔ ہم دوپہر کے وقت روانہ ہوئے۔ راستے کے تمام پہلو کم وبیش وہی تھے جو کل اٹلانٹک سٹی جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ البتہ ہریالی زیادہ دیکھنے کو ملی۔ نیز دریا اور سرسبز وشاداب پہاڑ بھی راہ میں آئے۔ ہم جھیل پر پہنچے تو پانچ بج رہے تھے مگر چونکہ سورج ڈوبنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے اس لیے کافی روشنی تھی۔ سورج چمک رہا تھا اور ایک خوشگوار سی ٹھنڈک چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

قدرتی حسن کا شاندار نظارہ

اس وقت سیزن نہیں تھا اس لیے لوگ کافی کم تھے۔ موسم بہار اپنے شباب پر نہیں پہنچا تھا مگر اس کے باوجود جھیل فطرت کے حسن کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کر رہی تھی۔ 32 میل طویل اس جھیل کو

چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا۔مگر یہ اتنے بلند نہیں تھے کہ دم گھٹنے لگے جو بالعموم پہاڑی علاقوں کے دامن میں واقع جگہوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ پہاڑوں کو سبزے کی تہہ نے مکمل طور پرڈھک رکھا تھا۔جھیل کے اردگرد گھاس کے بڑے بڑے قطعات تھے جن کے اطراف میں درخت لگے تھے۔جھیل کے پرسکون پانی اور شور سے پاک ماحول نے فضا کو بہت مسحور کن بنادیا تھا۔ پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی مرغابیاں آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ ہرطرف درختوں کی کثرت تھی جن پر آمدِ بہار کی علامت کے طور پرکونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ چاندکی پوری راتوں میں جب ہرطرف دودھیاروشنی پھیلی ہوتی ہوگی تو ایک چاند آسمان پراور دوسرا جھیل کے ہموار پانی میں اس کاعکس بن کرظاہرہوتا ہوگا۔ بلاشبہ یہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہوگا۔نگہت باجی نے، جو پہلے بھی یہاں آچکی تھیں، مجھے بتایا کہ جب بہاراپنااصل رنگ دکھاتی ہےتو یہاں کا نظارہ ناقابلِ بیان حدتک حسین ہوتا ہے۔ ہرطرف ہرے بھرے درخت نظر آتے ہیں۔رنگ برنگے پھول ہرجگہ چھاجاتے ہیں اورسرسبزی وشادابی سے پوری وادی ڈھک جاتی ہے۔

فطرت کی ان تمام ترعنایات کےساتھ انسانی کاوشوں نے سیاحوں کے لیے بہت ساری سہولیات مہیا کردی تھیں۔جھیل کے اردگرد پکی سڑک تھی۔جس کے دونوں طرف کھانے پینے کے علاوہ دیگر چیزوں کی خریداری کی دکانیں تھیں۔ کچھ ریسٹورنٹ اورشراب خانے جھیل کے بالکل کنارے پربھی تھے۔آنے والوں کے لیے تفریح کی بہت سی چیزیں تھیں۔کناروں پر دوربینیں لگی تھیں جن میں کوارٹر (25 سینٹ) ڈال کر دورتک دیکھا جاسکتا تھا۔ساحل پر بڑی بڑی کشتیاں کھڑی تھیں جودوتین گھنٹوں میں لوگوں کو پوری جھیل گھمادیتی تھیں۔دورانِ سفرجھیل سے متعلق پوری معلومات رواں تبصرے کی صورت میں سنائی جاتی تھیں۔کشتی میں شراب کے بار اورکھانے پینے کی دکانیں بھی تھیں۔جھیل کے اردگرد کیمپنگ کی سہولت بھی دستیاب تھی۔ یہاں

نہانے کے لیے باقاعدہ بیچ بھی بنی ہوئی تھی۔تاہم سردی کا شکر یہ کہ نہانے والے نہیں تھے۔ بڑی تعداد میں رہائشی ہوٹل بھی تھے، جھیل میں کشتی رانی اور یاٹنگ یعنی پردے والی کشتی چلانے کی سہولت بھی تھی۔لوگ یہاں کئی کئی دن رہنے کے لیے آتے اور ان تمام تفریحات سے لطف اندوز ہوتے۔

انگریزوں کی حرام تجارت

ہم دیر تک جھیل کے پاس بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ میری بھانجیاں پانی کے پاس کھیلتی پھر رہی تھیں۔ عزیز بھائی پزا (Pizza) خرید کر لائے۔ وہ ہر جگہ اہتمام سے حلال پزا خریدتے تھے۔جس میں کسی قسم کی حرام چیز نہیں ہوتی تھی۔ ذائقہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ حلال چیزوں کے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے کہ جتنی زیادہ حلال ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ معمولی اور بے مزا لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر جائز آمدنی، اپنی بیوی وغیرہ وغیرہ۔اس کے برعکس حرام کی لذت دوآتشہ ہوتی ہے۔ایک اس چیز کا اپنا مزہ اور دوسرا اس کے حرام ہونے کا مزہ۔ غالباً نشاۃِ ثانیہ میں اہلِ یورپ کی سب سے بڑی دریافت حرام کی یہی ''نشاطِ ثانیہ'' تھی۔جس سے سرشار ہوکر وہ دوسروں کے مال ومتاع اور ملک واقتدار کو غصب کرنے کی حرام تجارت کے واسطے اپنے ملکوں سے نکلے۔

ان میں سے کچھ اپنے برصغیر کی طرف گئے۔ انہوں نے کئی سو سال تک وہاں کے لوگوں سے تجارت کی۔ انہیں اپنی زبان، لباس، تہذیب اور تمدن دیا۔ بدلے میں ان کا ملک، دولت اور کوہِ نور ہیرا لے لیا۔لیکن وہاں کے لوگوں کو انگریزوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ بات یہیں تک محدود رہی اور انگریز تجارت سے فارغ ہوکر اپنے ملک واپس چلے گئے۔ وگرنہ اسی زمانے میں انگریز یہاں یعنی براعظم امریکا بھی آئے۔ یہاں کی تجارت کا نیٹ رزلٹ یہ رہا کہ مقامی لوگ اپنے ملک، زمین، مال و دولت سے مستقل طور پر ہاتھ دھونے کے علاوہ اپنی جانوں سے بھی

گئے۔ انگریزوں نے بے گنتی مقامی باشندوں کو اپنی گولیوں سے ہلاک کیا اور جو اس طرح نہ مر سکے انہیں یورپی بیماریوں کے جراثیم کے حوالے کردیا۔ جس کے نتیجے میں پوری پوری آبادیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ لاکھوں کی تعداد میں پائے جانے والے، اس براعظم کے تنہا وارث، یہاں کے مقامی باشندے اب محض چند ہزار کی تعداد میں مخصوص علاقوں میں آباد ہیں۔ تاکہ ہمارے جیسے لوگ انہیں دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔

امریکا میں ماں اور باپ کا دن

اسی دوران میری بڑی بھانجی ندرت نے جو پانچویں کلاس کی طالبہ ہے، اپنی امی کے لیے بڑی محنت سے ایک بہت خوبصورت کارڈ بنایا۔ یہ اسائنمنٹ اسے ماں کے دن Mother's Day کے موقع پر اسکول کی طرف سے ملا تھا۔ امریکا اور یورپ میں ماں اور باپ کا دن بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ اس موقع کی مناسبت سے میڈیا پر خصوصی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ لوگ خاص طور پر اپنے والدین سے ملنے جاتے ہیں۔ ان کے لیے خصوصی تحائف خریدتے ہیں۔ کیبل اور انٹرنیٹ کے عام ہونے کے بعد یہ دن اب پوری دنیا میں منایا جانے لگا ہے۔ مغرب میں یہ دن جس پس منظر کے تحت منایا جاتا ہے وہ یہ تھا کہ خاندانی نظام کمزور ہونے کے بعد انسانی رشتوں کا باہمی تقدس، احترام اور محبت اپنا مقام کھو چکے تھے۔ مگر اس کے نتیجے میں زبردست معاشرتی مسائل پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ خاندان کے ادارے کو معاشرے میں فعال اور مؤثر بنانے کے لیے اس طرح کے دن وہاں منائے جانے لگے۔

میری وہاں موجودگی میں ہی یہ دونوں دن آئے۔ میں نے نوٹ کیا کہ باپ کے دن پر اتنا جوش و خروش نظر نہیں آیا جتنا ماں کے دن پر نظر آیا تھا۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بڑا دلچسپ ہے۔ ایک پاکستانی کو امریکا میں کچھ مالی مسائل درپیش تھے۔ اس کے کسی جاننے والے نے اسے مشورہ

دیا کہ ماں کا دن آرہا ہے۔تم اس موقع پر تحائف اور گلدستے بیچنا۔لوگ بڑی تعداد میں خریدیں گےاور تمہیں کافی فائدہ ہوگا۔اس نے ایسا ہی کیا اور کافی منافع کمایا۔تھوڑے دنوں کے بعد باپ کا دن آیا تو اس نے سوچا کہ چلو اس دفعہ بھی یہی کام کرتے ہیں۔اس نے پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں ان چیزوں کو بیچنے کا اہتمام کیا۔مگر اس مرتبہ اس کی بہت ہی کم چیزیں بکیں اور اسے بہت نقصان ہوا۔اس نے اپنے دوست کو بتایا تو اس نے کہا کہ ارے بیوقوف تم سے کس نے کہا تھا کہ باپ کے دن پر بھی یہ کام کرو۔ان میں سے اکثر لوگوں کو اپنے باپ کا پتا ہی نہیں ہوتا تو اسے کیا خاک تحفہ دیں گے۔

خاندانی نظام: انسان کی ضرورت

یہ لطیفہ محض ایک لطیفہ ہی نہیں ایک سانحے کا بیان بھی ہے۔انہوں نے جنسی لذت کے حصول کے پیچھے خاندان جیسے قیمتی ادارے کو تباہ کردیا۔میں پچھلے باب میں ذکر کر چکا ہوں کہ اہل مغرب نے مادر پدر جنسی آزادی کی راہوں پر نہ صرف قدم رکھا بلکہ انسانی تاریخ کو اس انداز سے متعین کیا کہ جس کے نتیجے میں خاندان کے ادارے کی مستقل بنیاد ہی ختم ہوگئی۔اس معاملے کے علمی پہلو پر میں آگے چل کر بحث کروں گا کہ انسان کے جس جسمانی اور ذہنی ارتقا کو ایک مسلمہ بنا کر پیش کیا جاتا اور اس کی بنیاد پر جنسی آزادی اور مذہب بیزاری کا جواز تلاش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی اساس ہے یا نہیں۔لیکن یہاں اس پہلو کو سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جنسی آزادی اور خاندان کے ادارے میں عورتوں اور مردوں کو ہر اعتبار سے برابر حیثیت دینے کا لازمی نتیجہ خاندان کی تباہی ہے۔

مذہبی پہلو کو ایک کونے میں رکھیے اور خالص انسانی نقطۂ نظر سے غور کریں تب بھی یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ انسان کا وجود جسمانی اور ذہنی طور پر اس قابل نہیں کہ کسی مستحکم چھتری کے بغیر

اپنے منتہائے کمال کو پہنچ سکے۔ یہ انسان کی اتنی فطری اور لازمی ضرورت ہے کہ انسان کے سر سے اس چھتری کو مکمل طور پر ہٹانا کبھی ممکن ہوا اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ صرف اس چھتری کی شکلیں بدلنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ خاندان کا ادارہ سب سے بڑھ کر تحفظ کی یہ چھتری فراہم کرتا ہے جس کے نتیجے میں گوشت کا ایک لوتھڑا کئی سالوں کی نگہداشت و تربیت کے بعد ایک طاقتور اور معاشرے کے لیے مفید انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

خاندان کی یہ فطری چھت چونکہ مذہب کی تجویز کردہ ہے اور وہ مرد کو خاندان کا سربراہ قرار دیتا اور آزادانہ جنسی تعلق پر قدغن لگاتا ہے، اس لیے اہل مغرب مذہب بیزاری میں اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن چونکہ ضرورت فطری تھی اس لیے خاندان کی ذمہ داریوں میں اسکول اور اسٹیٹ کو شریک کر دیا گیا۔ جس کے بعد ماں باپ کی ذمہ داری کم تو ہوئی لیکن ان کے حقوق بھی کم ہو گئے۔ بظاہر یہ حل بہت شاندار ہے۔ لیکن اس میں چند بنیادی نقائص ہیں۔ اول یہ نظام صرف ان معاشروں میں قابلِ عمل ہے جنہیں ایک خاص حد تک مالی استحکام حاصل ہو۔ مغرب میں بھی یہ نظام عصر حاضر کی مادی فتوحات کے بعد ہی ممکن ہوا ہے۔ جبکہ انسان امیر اور غریب معاشروں کی تفریق کے بغیر پیدا ہوتے ہیں۔ اس کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اعلیٰ ترین انسانی صفات یعنی ایثار، قربانی، محبت، حیا، وفاداری، انفاق، رشتوں کا احترام اور تقدس اور ان جیسی دیگر خصوصیات جو صرف خاندان کی درسگاہ سے ملتی ہیں، ان سے ان کے بچے محروم رہ جاتے ہیں۔ بلکہ اکثر حالات میں جب وہ اپنے سر پر ماں باپ میں سے کسی ایک کا سایہ نہیں دیکھتے یا ان کا تعلق ٹوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کی شخصیت پر اس کا منفی اثر پڑنا لازمی ہے۔

تیسرا نقص یہ ہے کہ یہ نظام جوانوں کے لیے ہے۔ ایک نوجوان جوڑے کے لیے یہ بات بہت اچھی ہے کہ بچے سارا دن اسکول میں رہیں جہاں انہیں اچھی باتیں سکھائی جائیں اور

حکومت انہیں ماہانہ خرچہ دیتی رہے۔لیکن وہ بچے ان ماں باپ کو بڑھاپے میں پلٹ کر کیوں پوچھیں گے جنھوں نے ذاتی عیاشی اور مزوں کے لیے انہیں اس شفقت اور محبت سے محروم رکھا جو قربانی کی زمین پر ہی جنم لیتی ہیں۔لہٰذا ایک انسان کے لیے یہ نظام بچپن اور بڑھاپے دونوں میں گھاٹے کا سودا ہے۔کسی بھی معاشرے کی اکثریت بوڑھوں اور بچوں پر مشتمل ہوتی ہے۔اور اس نظام کا سب سے بڑا نقصان انہی کو ہوتا ہے۔ان وجوہات کی بنا پر یہ نظام عارضی طور پر تو کہیں چل سکتا ہے۔لیکن مستقل بنیادوں پر اسے اختیار کرنا انسانیت کے لیے ممکن ہے نہ مفید۔

امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری

نیویارک میں متعدد میوزیم تھے۔مگر میری دلچسپی کی چیز امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری (American Museum of Natural History) تھا۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا میوزیم ہے۔ یہاں تین کروڑ کے قریب اشیا نمائش کے لیے رکھی گئی ہیں۔جس میں ڈائنوسار کے ڈھانچوں کا سب سے بڑا ذخیرہ بھی شامل ہے۔

میں نے نقشے کی مدد سے اس کا پتا سمجھا۔اب میں خود بھی راستوں سے واقف ہو چکا تھا اس لیے با آسانی وہاں پہنچ گیا۔آج کافی گرمی تھی۔ بلکہ ریکارڈ گرمی تھی اور درجۂ حرارت پینتیس ڈگری کے قریب تھا۔ ہر جگہ تیز اے سی چل رہا تھا۔سب وے سے نکلتے ہی میوزیم کا داخلی دروازہ تھا۔کاؤنٹر پر موجود خاتون نے داخلے کے ٹکٹ کی مختلف شرحیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میوزیم میں داخلے کا ٹکٹ دس ڈالر کا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ اضافی طور پر اسپیس شو کا ٹکٹ لے لیا جو نو ڈالر کا تھا۔

اسپیس شو کا ٹائم شروع میں ہی تھا۔اس لیے پہلے اسے ہی دیکھا لیکن بعد میں احساس ہوا کہ غلطی ہوگئی۔میں نے بہترین چیز ابتدا ہی میں دیکھ لی جس کے بعد دوسری چیزیں جو اپنی جگہ

بہت اچھی تھیں زیادہ متاثر نہ کرسکیں۔اگر آپ کا کبھی وہاں جانا ہوتو اسپیس شو کا ٹکٹ ضرور لیں مگر اس کا وقت بعد کا رکھوائیں کیونکہ یہ سارا دن وقفے وقفے سے ہوتا رہتا ہے۔

اسپیس شو

یہ اسپیس شو ایک گول ہال میں دکھایا گیا۔اس کی چھت گنبد کی طرح تھی۔سیٹیں بھی گول دائرے میں لگی ہوئی تھیں۔میں بھی ایک نشست پر بیٹھ گیا۔کچھ ہدایات اور معلومات کے بعد شو شروع ہوگیا۔اس میں جو معلومات دکھائی گئیں وہ ہمارے نظامِ شمسی، ستاروں، کائنات اور بلیک ہولز کے بارے میں تھیں۔میرے لیے ان میں سے کوئی بات بھی انکشاف کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔لیکن سب سے زیادہ متاثر کن چیز ان کے پیش کیے جانے کا انداز تھا۔عام روایتی اسکرین کے بجائے پوری گنبد نما چھت اسکرین بن گئی تھی۔اس مقصد کے لیے ایک پروجیکٹر ہال کے وسط سے ابھر کر باہر آ گیا اور چھت پر سہ رخی تصویریں بنانے لگا۔یہ منظر کشی اتنی حقیقی تھی کہ محسوس ہوتا کہ جیسے ہم کسی خلائی جہاز میں سفر کررہے ہیں اور اس کے عرشے سے کھلے آسمان کا مشاہدہ کررہے ہیں۔ساتھ میں آواز اتنی بھرپور تھی کہ کرسیوں پر بھی باقاعدہ ارتعاش محسوس ہورہا تھا۔

اس شو کا پیغام یہ تھا کہ ہم ایک لامتناہی کائنات کا حصہ ہیں، اس ترتیب سے کہ ہماری زمین نظامِ شمسی کا حصہ ہے، نظامِ شمسی ملکی وے (Milky Way) کہکشاں کا حصہ ہے، ملکی وے کہکشاؤں کے ایک عظیم تر جھرمٹ کا حصہ ہے جس کا نام ورگو سپر کلسٹر (Virgo Supercluster) ہے۔اس کی حیثیت اس کائنات میں محض ایک ذرے کی سی ہے۔بلکہ اس زنجیر میں ہر ایک کی حیثیت دوسرے کے مقابلے میں ایک حقیر ذرے کی سی ہے۔ہمارا خمیر اس کائنات سے اٹھا ہے اور جو ایٹم ہمارے جسم کی تشکیل کرتے ہیں وہی اس کائنات کی تخلیق

میں بھی کارفرما ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری اوراس کائنات کی اصل ایک ہے۔

ہیرو کے بغیر فلم

میوزیم کے باقی حصوں کا حال میں بعد میں تفصیل سے بیان کروں گا۔مگراس میوزیم اور بالخصوص اس شوکو دیکھ کر جو بات سب سے زیادہ محسوس ہوئی اسے میں اسی وقت ہی بیان کرنا چاہوں گا۔ مجھے یہ شدت سے محسوس ہوا کہ میں ایک ایسی فلم دیکھ رہا ہوں جس میں ایک مربوط اور مکمل کہانی دکھائی گئی ہے مگر ہیرو کا تذکرہ ہی نہیں ہوا۔ یہ میوزیم کائنات، ہماری زمین، اس کے باسیوں؛ انسان، حیوان، چرند، پرند اور تمام مخلوقات کے بارے میں اتنی حیرت انگیز معلومات دے رہا تھا کہ دیکھنے والے کا متاثر ہوجانا یقینی تھا۔مگر خالق کا ذکراس طرح گول کر دیا گیا تھا جیسے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہوگیا ہو۔تھوڑی دیر میں نے سوچا تو خیال آیا کہ خدا کا تعارف ان لوگوں تک جس مذہب کے ذریعے سے پہنچا ہے وہ ہر اعتبار سے ایک غیر مصدقہ مذہب ہے۔اس کی کتاب مسلمہ طور پر تحریف شدہ ہے، بائبل کثرت سے ایسے بیانات سے بھری ہوئی ہے جو قدم قدم پر مصدقہ سائنسی حقائق سے ٹکراتے ہیں۔عیسائیوں کا بیوی اور بیٹے والا خدااس میوزیم میں اگر نہیں ہے تو اس میں ان لوگوں کا اتنا قصور نہیں۔ایسے احمقانہ عقیدے سے بہت بہتر ہے کہ آدمی خدا کے وجود سے ہی انکار کر دے یا مذہب کو روحانی تفریح کی ایک چیز بنا کر زندگی کا ایک ضمنی حصہ بنادے اور بقیہ زندگی کو مادیت کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔اب یہی اہلِ مغرب کرر ہے ہیں۔

میوزیم کی تفصیل

یہ میوزیم چار منزلہ عمارت پر مشتمل ہے۔جس میں بیالیس ہالز ہیں۔اور ایک بہت بڑا حصہ خلااورزمین سے متعلق ہے۔اس کا نام (Rose Center of Space and Earth)

ہے۔اس میں بگ بینگ (Big Bang) سے لے کر آج تک کائنات پر گزرنے والے تمام مراحل زمانی ترتیب کے ساتھ دکھائے گئے ہیں۔ بعض جگہ چھوٹے چھوٹے آڈیٹوریم بھی ہیں جن میں معلوماتی فلمیں دکھائی جارہی تھیں۔مثلاً روز سنٹر میں بلیک ہول سے متعلق دستاویزی فلم دکھائی گئی۔ کہیں وڈیو اسکرین پر معلومات دی جارہی تھیں۔بعض جگہ کمپیوٹر اسکرین کے ذریعے کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے معلومات حاصل کرسکتا تھا۔اسپیس شو کے علاوہ بھی دیگر سینما ہال تھے جن میں دوسرے موضوعات پر فلمیں چل رہی تھیں۔مگر ان کا ٹکٹ الگ سے لینا پڑتا تھا۔

یہ تمام چیزیں تفصیل کے ساتھ دیکھنے میں تو بہت وقت لگتا۔خصوصاً اس بنا پر کہ ہر چیز کے ساتھ متعلقہ معلومات بھی لکھی ہوئی تھیں جنہیں پڑھنے میں کافی وقت لگ رہا تھا۔ میں ان تمام ہالوں میں گیا تو ضرور لیکن تفصیل کے ساتھ تین ہی جگہیں دیکھیں۔ ایک تو مذکورہ بالا روز سنٹر جس میں بڑے اچھے انداز میں معلومات پیش کی گئی تھیں۔ دوسرا ڈائنا سور والا سیکشن۔ میں نے اس سے قبل ان کا صرف تذکرہ پڑھا تھا۔مگر پہلی دفعہ براہ راست دیکھا تو ان کے قدوقامت کا کچھ اندازہ ہوا۔ان کے ڈھانچے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے کے لیے باقاعدہ فاصلے تک چلنا پڑ رہا تھا۔ڈھانچے کا یہ حال تھا تو گوشت پوست کے ساتھ چلتے ہوئے وہ کس قدر بڑے اور دہشتناک لگتے ہوں گے؟

تیسرا ہال جس میں مجھے کافی دلچسپی محسوس ہوئی وہ انسان سے متعلق تھا۔اس میں انسان کے تمام تر نظاموں اور حیوانی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ یہاں اس بات پر بڑا زور دیا گیا تھا کہ انسان کا تعلق جانوروں کے زمرے سے ہی ہے اور ارتقا کے نظریے کی روشنی میں اس کی تفصیلی وضاحت کی گئی تھی۔

میں پچھلے باب میں بیان کر چکا ہوں کہ مذہب کا انکار کرنے کے بعد اہل مغرب کے سامنے دوسوال آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ محض اخلاقی نوعیت کے سوال نہیں تھے بلکہ خالص عقلی اور منطقی نوعیت کے سوالات تھے۔ پہلا یہ کہ کائنات کو کس نے پیدا کیا اور دوسرا یہ کہ مخلوقات اور خود انسان جیسی باشعور ہستی کیونکر کائنات کے سادہ صفحے پر ابھری۔ ان سوالات کا سبب یہ علم تھا کہ کائنات ایک مادی وجود ہے۔ ہر مادی چیز کی طرح کائنات بھی خود بخود وجود پذیر نہیں ہوسکتی۔ اس کی کوئی علت ہونی چاہیے۔ یہ علت وہ شے خود نہیں ہوسکتی۔ ایک سادہ سی مثال سے یوں سمجھیں کہ کسی کمرے میں اگر فرج رکھا ہوا ہے تو اسکے بارے میں یہ سوال لازماً اٹھے گا کہ اسے کس نے بنایا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ فرج خود اپنے آپ کو بنالے۔ ٹھیک یہی بات اس کائنات کی ہر شے اور خود کائنات پر بھی صادق آتی ہے کہ ان میں کوئی بھی اپنی تخلیق پر آپ قادر نہیں۔ یہ محض ایک منطقی نوعیت کی بحث نہیں بلکہ سائنسی بنیاد رکھتی ہے۔ سائنس یہ مان چکی ہے کہ کائنات کا وجود ابدی نہیں ہے۔ یہ آج سے پندرہ بلین سال قبل ایک عظیم دھماکے (Big Bang) کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کس نے کیا۔ اس بات کے جواب میں سائنس بالکل خاموش ہے۔ وہ صرف اتنا بتادیتی ہے کہ یہ دھماکہ کسی خارجی طاقت کی مداخلت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ خارجی طاقت کون تھی اور اس نے ایسا کیوں کیا ، اس کا جواب سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ کیونکہ یہاں سے عالم شہود ختم ہوجاتا ہے اور عالم غیب شروع ہوتا ہے۔ اس بات کا جواب صرف مذہب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے بنایا۔ (خیال رہے کہ یہاں اور اس بحث میں آگے ہر جگہ مذہب سے میری مراد اسلام ہے۔ کیونکہ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس کے من جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور اس کی

کتاب بالکل محفوظ ہے۔)

ملحدین (یعنی خدا کے منکر) مذہب کے اس دعوے کے جواب میں فوراً کہتے ہیں کہ پھر خدا کو کس نے بنایا۔لیکن یہ قطعاً ایک غیر عقلی اور غیر منطقی سوال ہے۔کائنات اوراس کی ہر چیز کے بارے میں ایک خالق کا سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ان کا تجزیہ کر کے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ انہیں ایک خالق کی ضرورت ہے۔ان کا مادی ہونا اور قابل تجزیہ ہونا لازم کرتا ہے کہ یہ بنائی گئی ہیں،خودبخود سے وجود میں نہیں آئیں۔کیا کوئی ملحد خدا کی ذات کا تجزیہ کر کے یہ ثابت کرسکتا ہے کہ خدا ایک مخلوق ہے جس کا کوئی خالق ہونا منطقی طور پر ضروری ہے؟ کیا مذہب یہ کہتا ہے کہ خدا ایک مادی وجود ہے کہ سائنسی اعتبار سے یہ سوال اٹھے؟ دراصل خدا کے غیر مادی ہونے کی وجہ سے سائنس کی بنیاد پر خدا کا اقرار ممکن ہے نہ انکار۔سائنس صرف یہ کرسکتی ہے کہ مادی دنیا کے مطالعے کے بعد، خدا کے امکان کے بارے میں کوئی منفی یا مثبت شہادت دے۔دوسرے الفاظ میں آپ یہ کہہ لیں کہ اس بحث میں سائنس کی حیثیت ایک جج کی نہیں بلکہ گواہ کی سی ہے۔اور اس دور میں سائنس نے خدا کے ہونے کے امکان کے حق میں شہادت دے دی ہے۔

اس معاملے میں فیصلہ کن کردار عقلِ عام (Common Sense) کا ہے۔چنانچہ مذہب کا مقدمہ سائنس کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقلِ عام کی بنیاد پر ہے۔اس لیے کہ مذہب کا مخاطب انسان ہے۔اور انسان اپنی زندگی سائنس کے اصولوں پر نہیں بلکہ عقلِ عام کے اصولوں پر گزارتا ہے۔وہ اپنی زندگی کا پورا ڈھانچہ عقلِ عام کو استعمال کر کے ہی قائم کرتا ہے۔یہاں یہ بات بھی جان لیں کہ خدا تو بہت آگے کی ہستی ہے خود انسان سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ انسان سائنس کے دائرہ کار میں آتا ہے نہ اس کے اعتبار سے چیزیں سمجھتا ہے۔یہاں انسان سے میری مراد اس کا حیوانی وجود نہیں بلکہ عقلی اور شعوری وجود ہے۔سائنس کا دائرہ کار صرف اور

صرف جمادات، نباتات اور حیوانات تک محدود ہے۔

اس بات کو چند مثالوں سے سمجھیں۔ نیوٹن کا تیسرا قانون ہے کہ ہر عمل کا ردعمل اتنا ہی ہوتا ہے اور مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ آپ نے کتنی دفعہ انسانوں کے شعوری وجود کو اس اصول کی پابندی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ انسان اس اصول کی پابندی کرسکتا ہے مگر اس اصول کا پابند نہیں۔ جبکہ پوری کائنات اس اصول کی پابند ہے۔ سائنس کہتی ہے کہ زمین ہر آن متحرک ہے۔ آپ نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کسی شخص کو کبھی کہتے سنا ہے کہ میں حرکت کررہا ہوں۔ کوئی ایسا کہے گا تو لوگ اسے پاگل خیال کریں گے۔ انسان اپنی زندگی کی ترتیب عقلِ عام کے اصولوں کے تحت بناتا ہے، نہ کہ سائنس کے تحت۔ وہ سائنس کی اس وقت تک پیروی کرتا ہے جب تک وہ عقلِ عام سے موافقت کررہی ہو۔ انسانوں کے لیے آج بھی سورج ''ڈوبتا'' اور ''طلوع'' ہوتا ہے۔ سائنس کا جو دل چاہے کہتی رہے۔

لہٰذا مذہب نے انسان پر خدا کے وجود کی دلیل سائنس سے قائم نہیں کی بلکہ عقلِ عام کی مدد سے بالواسطہ دلیل قائم کی ہے۔ پورا قرآن ان دلائل سے بھرا پڑا ہے جو اس نے عقلِ عام کی روشنی میں انسانوں کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ جس کو دیکھنا ہو وہ قرآن میں ان کی تفصیل دیکھ لے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات اور خود انسان کے وجود میں کوئی کام الل ٹپ نہیں ہورہا۔ بلکہ ایک حکمت، ربط اور ترتیب کے ساتھ ہورہا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے انسانوں سے منوانے کی ضرورت پڑے۔ یہ اس کا مشاہدہ ہے۔ یہ اس کے لیے ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ قرآن ان حقیقتوں کو اس کے سامنے رکھ کر اکثر خاموش ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اگر انسان عقلِ عام کو استعمال کرے تو ٹھیک نتیجے پر پہنچ جائے گا بشرطیکہ وہ وہاں پہنچنا چاہے۔ اس کی عقلِ عام اسے یہ بتادے گی کہ حکمت اگر پائی جارہی ہے تو لازماً اس کے پیچھے ایک حکیم موجود ہے، اگر نظم موجود ہے

تو عقلِ عام کے لیے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ ناظم کو مانے۔قرآن کا اصل زور اس ذات کو منوانے پر نہیں، اس کی صفات کے صحیح تعارف پر ہے۔ کیونکہ انسان اصل ٹھوکر یہاں کھاتا ہے۔

خدا کی ذات کا ثبوت

قرآن نے خدا کے ہونے کے ثبوت کے لیے براہِ راست خارجی دنیا کی صرف ایک دلیل پیش کی ہے۔ جو کہ سورۂ النور 24:35۔40، میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ اس کائنات کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کو کائنات کا خالق مان لیا جائے۔ اللہ کو نکال دینے کے بعد کائنات کی کوئی عقلی تو کیا غیر عقلی توجیہ بھی ممکن نہیں ہے۔ جس طرح ایک اندھیرے کمرے میں جب تک روشنی نہیں ہے آپ تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔ جیسے ہی روشنی ہوگی ہر چیز اپنی جگہ ٹھکانے پر نظر آنے لگے گی۔ اسی طرح خدا کی دی ہوئی ہدایت کی روشنی کے بعد کائنات میں ہر چیز (میں اس کی تفصیل قرآن کے علم الانسان کے عنوان سے آگے بیان کر رہا ہوں) اپنی درست جگہ پر نظر آئے گی اور اس کے بغیر آپ کائنات کے بارے میں بلا یقین متضاد باتیں کہتے رہیں گے۔ تاریکی پر تاریکی۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ خدا کے سوا اس کائنات کی کسی دوسری توجیہ کا نہ ہونا آخری حد تک ثابت کرتا ہے کہ اگر کائنات کے ہونے کو ہم مانتے ہیں تو ہمیں خدا کو بھی ماننا ہوگا اور اگر نہیں مانتے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم کائنات کے وجود کے منکر ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جو لوگ اس بنا پر خدا کو نہیں مانتے کہ وہ سائنسی طور پر ایک تسلیم شدہ حقیقت نہیں ہے، وہ ایک دوسری ہستی کو ماننے پر مجبور ہیں جو سائنسی طور پر ثابت شدہ ہے اور نہ اس کے دائرہ میں آتا ہے۔ یہ خود حضرتِ انسان کا اپنا شعوری وجود ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کے شعوری یا روحانی وجود کو سائنس کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کے قوانین کا اس پر

اطلاق ہوتا ہے۔اوپر میں دکھا چکا ہوں کہ انسان اپنی زندگی کا نقشہ بھی سائنس کی روشنی میں نہیں بناتا۔ اس کے باوجود انسان کے شعوری وجود کو نہ صرف مانا جاتا ہے بلکہ اس کے مطالعہ کے لیے علم النفسیات کے نام سے ایک پورا علم وجود میں آ گیا ہے۔

خدا کوکس نے بنایا

اتفاق کی بات ہے کہ نیویارک میں اپنی بہن کے گھر بیٹھا جب میں یہ تحریر لکھ رہا تھا تو میری بیچ والی بھانجی ماہ رخ نے، جو پرائمری اسکول کی طالبہ ہے، اچانک مجھ سے سوال کیا کہ اللہ میاں کوکس نے بنایا۔شاید خدا کو یہ منظور تھا کہ اس مقام پر عقلِ عام کی روشنی میں بھی یہ ثابت ہو جائے کہ خدا کے بارے میں یہ سوال ہی اصلاً غلط ہے اس لیے اس نے اس معصوم بچی کے دل میں اسی وقت یہ سوال ڈالا۔ میں اس سے مذکورہ بالا بحث نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے اس سے کہا کہ ’’ A B C D ‘‘ سناؤ۔ اس نے سنائی تو میں نے اس سے پوچھا کہ A سے پہلے کیا آتا ہے۔اس نے کہا کہ A سے پہلے تو کچھ بھی نہیں آتا۔اس پر میں نے کہا کہ جس طرح A سے پہلے کچھ نہیں اسی طرح اللہ میاں سے پہلے بھی کچھ نہیں تھا۔ جب اللہ میاں سے پہلے کچھ نہیں تھا تو انہیں کسی نے پیدا بھی نہیں کیا۔ یہ بات با آسانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔

ارتقا کا نظریہ

خدا کے سوا کائنات کی کسی دوسری توجیہ کی غیر موجودگی میں، انکارِ خدا کے لیے، منکرین ِ مذہب کے پاس صرف ارتقا کا نظریہ بچا ہے۔جس کو وہ انکارِ خدا کی اساس سمجھتے ہیں۔مگر سوال یہ ہے کہ ایک لمحے کے لیے اگر ہم ارتقا کے نظریے کو بالکل درست مان بھی لیں تب بھی یہ انکارِ خدا کی بنیاد کیسے بن سکتا ہے؟ مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ مخلوقات کو خدا نے بنایا۔اس نے خدا کے طریقۂ تخلیق کو بیان نہیں کیا۔اس ضمن میں قرآن نے صرف ایک بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ اللہ نے آدمؑ

کو خصوصی تخلیق سے پیدا کیا۔ سورۂ آلِ عمران آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، ''عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے۔ اس نے اسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر فرمایا ہو جا تو ہو گیا''۔ کیا کوئی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ خدا کی یہ بات غلط ہے اور جس آدمؑ سے یہ انسانیت وجود میں آئی وہ مٹی سے پیدا نہیں ہوئے۔

انسانوں کو جانوروں کی ایک ترقی یافتہ شکل ثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہا اور پیش کیا جاتا ہے وہ اپنی خواہش کا اظہار تو ہو سکتا ہے حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ محض اندازے اور قیاسات ہیں۔ جن پر مشرق اور مغرب دونوں جگہ بہت تنقید ہو چکی ہے۔ یہ لوگ تو انسان کے حیوانی وجود کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں کر سکے کہ یہ حیوانوں سے ترقی پا کر وجود پذیر ہوا ہے۔ کجا کہ وہ انسان کے اس شعوری اور روحانی وجود کے بارے میں کوئی دعویٰ کر سکیں جس کے قریب تو کیا دور تک بھی کوئی جانور نہیں پہنچ سکا۔

انسان کا روحانی وجود اور علم الانسان

انسان ایک حیوانی وجود رکھتا ہے۔ اس میں وہ تمام بنیادی جبلتیں پائی جاتی ہیں جو حیوانوں کا خاصہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انسان جانوروں سے بلند تر ایک وجود اور شعور رکھتا ہے جسے مذہبی اصطلاح میں روحانی وجود کہا جاتا ہے۔ اہل مغرب علم الحیوانات سے تو کسی طور یہ ثابت نہیں کر پائے کہ کب اور کیسے یہ نرا حیوان ایک بلند تر ذہنی اور روحانی شخصیت میں تبدیل ہوا۔ لیکن وہاں اصولی طور پر یہ طے ہو چکا تھا کہ انسان کی تشریح خدا اور بائبل والے آدمؑ سے ہٹ کر ہی کرنی ہے۔ لہٰذا علم الانسان کی بنیاد رکھی گئی اور ایک پورا فلسفہ گھڑ لیا گیا۔ جس میں انسان کے ذہنی اور روحانی ارتقا کا سفر وحشی انسان سے متمدن انسان تک دکھایا گیا۔ اس سلسلے میں جس استدلال کا سہارا لیا گیا وہ تحقیق کا نہیں حماقت کا شاہکار تھا۔

اس شعبے کے ماہرین کا طریقۂ کار یہ ہے کہ یہ معاصر غیر متمدن قبائل کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی توہم پرستی اور وحشیانہ زندگی کو دیکھ کر انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ جس گوہرِ نایاب کی وہ تلاش میں تھے وہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ یعنی انہوں نے انسان کی اصل ڈھونڈ لی۔ وہ ان قبائل کی تمام خصوصیات کو دورِ قدیم کے انسان پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ پھر اپنی یہ نادر تحقیق دنیا کے سامنے بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ ہے ہمارا آغاز۔

اس استدلال کی بنیادی کمزوری اصولی طور پر یہ مان لینا ہے کہ تمدن کا شجر اسی غیر متمدن بیج سے پھوٹا ہے، حالانکہ اس بات کا پورا امکان ہے کہ یہ وحشی انسان شاخِ تمدن سے ٹوٹ کر گرا ہو اور ناموافق حالات میں پروان چڑھ کر اس حال کو پہنچا ہو۔ انسانی تمدن کو اپنے ارتقا کے لیے مناسب ماحول چاہیے۔ جس جگہ یہ حالات دستیاب نہ ہوں انسان مجبوراً خود کو صرف بنیادی جبلی ضروریات تک محدود کر لیتا ہے اور وحشیانہ اور جانوروں سے قریب تر اندازِ زندگی اختیار کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ آج کے متمدن انسان کو بھی تنہا کسی غیر آباد ویرانے میں پہنچا دیں جہاں کسی قسم کے وسائل نہ ہوں۔ پھر دیکھئے کہ وہ اپنی زندگی کا سفر کس طرح طے کرتا ہے۔ اسی طرح افریقہ، آسٹریلیا اور امریکا کے قدیم قبائل کی مثال کو بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ قبل از تاریخ کے کسی دور میں تہذیبِ انسانی کے مرکزی دھارے سے کٹنے کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئے ہوں گے۔ ان کی موجودگی سے یہ نتیجہ کیسے برآمد ہوتا ہے کہ تہذیب کا دھارا لازماً ان سے نکلا ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے۔ آج سے چند ہزار سال قبل ایک مرد و عورت میں عشق ہوا۔ ان کا تعلق باہمی دشمن قبائل سے تھا۔ جس کی بنا پر ان کی شادی ناممکن تھی۔ چنانچہ یہ دونوں نہ صرف اپنے قبائل بلکہ اس سارے علاقے سے دور فرار ہو گئے جہاں تک ان کی پہنچ ممکن تھی وگرنہ

یہ دونوں قتل کر دیے جاتے۔اب یہ دونوں اس دور کی متمدن دنیا سے دور کسی ویرانے میں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ جہاں ان کا واسطہ انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے پڑتا ہے۔یہ دونوں تنہا مل کر کونسا تمدن تعمیر کریں گے۔تمدن صرف انسانی ہاتھ تشکیل نہیں دیتے۔ یہ سیکڑوں نسلوں کے تجربات، ہزاروں سالوں کی تحقیق کے بعد جنم لینے والے آلات اور مخصوص قدرتی وسائل وحالات کامحتاج ہوتا ہے۔ان سب کے بغیر یہ دونوں کیا تیر چلائیں گے؟ ان کی اولاد کی باہمی شادیوں کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ ان کے لباس، رہنے سہنے اور کھانے پینے کے معاملات ان کے پرانے قبیلے کی سطح کا کیسے ہوسکتا ہے؟ لازمی طور پر چند صدیوں میں ان دونوں سے ایک غیر متمدن قبیلہ جنم لے لے گا۔ یہ محض ایک مثال ہے وگرنہ عشق کے علاوہ جنگ وجدل، قدرتی حوادث، معاشی مسائل اور دیگر کئی وجوہات کی بنا پر بارہا انسان اپنی اصل سے کٹے ہیں۔جس براعظم پر بیٹھا میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں یہاں بھی انسان چالیس ہزار سال قبل، چائنا کو اس وقت امریکا سے ملانے والے ایک گلیشیئر کے ذریعے، شکار کے پیچھے آئے تھے۔ بعد میں آئس ایج کے خاتمے سے یہ زمینی رابطہ منقطع ہوگیا تو یہ لوگ یہیں پھنس گئے۔ ایشیا والوں نے تو عظیم تہذیبیں جنم دیں مگر یہ لوگ آخری وقت تک شکاری ہی رہے۔

رہی عقائد ونظریات کی بات تو اس معاملے میں انسان نے ہر دور میں الٹی سمت میں سفر کیا ہے۔ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ انسان نے شرک اور توہم پرستی سے اپنا آغاز کیا اور پھر خداؤں کی تعداد کم کرتا کرتا ایک خدا تک پہنچا۔انسان نے تو معلوم تاریخ میں بھی ایک خدا سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے اور تین سے تین کروڑ خداؤں تک پہنچ گیا۔خود اپنی امت کو دیکھ لیں۔شرک کی جتنی مذمت اس دین میں ہے کسی اور میں نہیں۔اس کا آغاز آخری درجے کے موحدین سے ہوا۔اور آج حال دیکھ لیجیے۔خدا کے گھر میں بیٹھ کر غیر اللہ کے نام کی دہائی دی جاتی ہے۔انسان کی اس

طبیعت سے واقف کوئی شخص کسی قبیلہ کے توہم پرستانہ عقائد دیکھ کر کبھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا کہ یہ انسان کے ابتدائی عقائد ہیں۔

قرآن کا علم الانسان

اہل مغرب کے علم الانسان کی بنیادی غلطی واضح کردینے کے بعد یہ مناسب ہوتا ہے کہ قرآن کا علم الانسان بھی بیان کردیا جائے کیونکہ اس کے بغیر یہ بحث مکمل نہ ہوگی۔ مغرب کا علم الانسان ہمیں انسان کی ایک ایسی تصویر دکھاتا ہے جس میں وہ صرف ایک ترقی یافتہ جانور نظر آتا ہے۔ جو بخت واتفاق کے ہاتھوں اس اتھاہ مگر بے آباد کائنات کے ایک حقیر سے ذرے یعنی زمین پر نمودار ہوگیا۔ جسے اپنے آغاز کا کچھ پتا ہے نہ انجام کا۔ بقول شاعر

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

قرآن اس بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر ایک مکمل، معقول اور قابلِ قبول بات ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ قرآن کے مطابق اس دھرتی پر انسان کا وجود خدا کی اس اسکیم کا حصہ ہے جس کے تحت اس نے اپنی تمام مخلوقات کے سامنے ایک پروگرام رکھا۔ جس میں مخلوقات کو یہ موقع دیا گیا تھا کہ وہ خدا کی طرف سے دیے گئے بارِامانت کو اٹھالیں۔ امانت سے مراد یہ تھی کہ کائنات میں جو فیصلہ کن اختیار اللہ کو حاصل ہے وہ ایک خاص دائرے میں عارضی طور پر کسی مخلوق کو دے کر اس کا امتحان کیا جائے کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس عرصے میں خدا غیب کے پردہ میں رہے گا اور اس کے بعد اس مخلوق کو مکمل آزادی ہوگی کہ چاہے تو بلا جبر و اکراہ خدا کے احکامات مانے اور چاہے تو انکار کردے۔ جس نے پہلا راستہ اختیار کیا اس کا بدلہ ابدی جنت کی نعمتیں اور جس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اس کا بدلہ جہنم کی سزا۔ تمام مخلوقات نے اس امتحان کی ممکنہ اور بہت حد تک متوقع

ناکامی اوراس کے بھیانک نتائج کو دیکھ کراس میں کودنے سے انکار کر دیا۔لیکن انسان نے اس بارِگراں کواٹھانے کا فیصلہ کرلیا، (الاحزاب33: 72)۔

اس امتحان کے پہلے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کوایک ساتھ پیدا کیا اوران سب سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا۔انہیں رسمی طور پراس بات سے آگاہ کیا کہ قیامت کے دن جب ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہوگا تواس کی بنیاد یہی توحید ہوگی۔یعنی خدا کو ماننا اورایک ماننا، (الاعراف7: 172۔174)۔اس واقعے کو اصطلاحاً عہدِ الست کہا جاتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں اللہ تعالیٰ نے آدمؑ وحوا کو پیدا کر کے یہ بتایا کہ انہیں دنیا کے امتحان میں کیا کیا رکاوٹیں پیش آئیں گی جو انہیں ناکام کرسکتی ہیں۔اس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب فرشتوں نے خدا کے حکم پر، کچھ سوال و جواب کے بعد، بلا جھجک آدمؑ کو سجدہ کیا۔لیکن ابلیس نامی جن نے نہ صرف سجدے سے انکار کیا بلکہ اپنی بڑائی کے زعم میں وہ خدا سے بغاوت اورسرکشی پر اتر آیا۔جس کے نتیجے میں اسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔یہ پہلا سبق تھا کہ خدا سرکشی کو معاف نہیں کرتا۔اس لیے کبھی خدا کے سامنے سرکشی مت کرنا۔دوسرا سبق انسان کواس وقت دیا گیا جب آدمؑ وحوا ابلیس کے بہکاوے میں آ گئے اوراپنی پوشاک سے محروم ہو گئے۔خدا نے اس معاملے کو بڑے مہذب انداز میں بیان کیا ہے۔لیکن قرآن بالخصوص سورۂ الاعراف کا گہرا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ دراصل یہ جنس کا درخت تھا جس کا ثمر وہ شیطان کے بہکانے میں آ کر چکھ بیٹھے۔ کیونکہ شیطان نے انہیں ابدی زندگی کا لالچ دیا تھا۔تاہم شیطان کے برعکس انہوں نے سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کیا بلکہ ندامت اورشرمندگی کا راستہ اختیار کیا تو خدا نے انہیں معاف کر دیا۔اس واقعے میں یہ سبق تھا کہ جس دنیا میں امتحان کے لیے رکھا جا رہا ہے اس میں برائی کی طاقتیں وسوسہ اندازی کر کے ہمیشہ انہیں بہکاتی رہیں گی کہ وہ خدا کے احکام کو سن لینے کے بعد بھی ان کی

خلاف ورزی کریں۔ اوراس بہکانے کا ایک بہت بڑا ذریعہ جنسی داعیات اورعریانی ہوگی۔ تیسرا سبق یہ تھا کہ جب کبھی غلطی ہوجائے تو خدا کے حضور معافی مانگنے سے معافی مل جائے گی۔

آخری بات خدا نے یہ بتائی کہ اب قیامت تک کے لیے میں اپنے اور انسانوں کے بیچ میں غیب کا پردہ حائل کررہا ہوں اور اب تم جانو اور تمہارا امتحان۔ میرے پیغمبر ہر دور میں آکر میرے اس منصوبے کی یاددہانی تمہیں کراتے رہیں گے۔ اور میرے تازہ ترین احکامات تمہیں دیتے رہیں گے۔ جوان کو مانے گا وہ نجات پا جائے گا وگرنہ بربادی اس کا مقدر ہوگی۔ قرآن میں یہ قصہ سات سورتوں میں بیان کیا گیا ہے یعنی البقرہ، الاعراف، الحجر، بنی اسرائیل، الکہف، طہٰ، ص۔

یہ ہے قرآن کا علم الانسان جس کے مطابق انسان پورے دن کی روشنی میں اس دنیا میں آیا ہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا جواب اول دن سے موجود تھا۔ وہ اپنی، کائنات کی اور خدا کی حقیقت سے خوب باخبر تھا۔ انسان نہ کسی ارتقائی سفر کے نتیجے میں پیدا ہوا اور نہ اس کا علم کسی ارتقائی مرحلے سے گزر کر اس مقام تک پہنچا۔ قرآن کے مطابق ہاں یہ ضرور ہوا کہ ''احسن تقویم'' پر پیدا ہونے والا انسان بار بار پستی میں گرا اور اتنا گرا کہ جانوروں سے بھی نیچے پہنچ گیا۔ اس بحث کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کے تمدن نے ارتقا نہیں کیا۔ تمدن نے تو کیا مگر خدا کے بارے میں انسان کے علم نے کوئی ترقی نہیں کی۔ بلکہ یہ الٹی سمت میں ہی گیا۔ کبھی اپنے سے کمتر درجے کی مخلوقات کو معبود بنا کر اور کبھی خود کو محض ایک ترقی یافتہ حیوان سمجھ کر۔ اب آپ اگر قرآن اور مغرب دونوں کے علم الانسان کا موازنہ کریں تو جان لیں گے کہ کون سی بات زیادہ معقول اور مکمل ہے۔

تاریخِ انسانی اور خدا کے امتحان کی نوعیت

جب ہم انسانی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو قرآن کے بیان کردہ اس امتحان اور جن جن امور

سے خدا نے متنبہ کیا تھا ان میں انسانوں کا مبتلا ہونا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انسانوں کی اکثریت حسبِ توقع اس امتحان میں بری طرح ناکام ہوئی ہے۔ کمال یہ ہے کہ انسانوں کے بارے میں جن توقعات کا اظہار فرشتوں اور شیطان نے کیا تھا، انسانوں نے ان سب کو پورا کیا۔ فرشتوں نے فساد اور خونریزی کا امکان ظاہر کیا تھا۔ آپ عالم کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو اس میں سب سے زیادہ نمایاں چیز جنگ و جدل ہی ملے گی۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعویٰ کیا تھا کہ جن کو تو نے مجھ پر ترجیح دی ہے ان کی اکثریت میری پیروی کرے گی اور تو ان کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ یہ بات کتنی سچی ثابت ہوئی۔ لمحے لمحے اللہ تعالیٰ کے احسانوں میں پلنے والا انسان جس طرح اپنے رب کی ناشکری اور اپنے دشمن شیطان کی پیروی کرتا ہے اس کا حال ہر دور میں عیاں رہا ہے۔

بنیادی طور پر انسانیت کے سامنے اصل مقصد پرچۂ توحید میں کامیابی کا حصول تھا۔ اس کی یاد اس کے لاشعور میں اتنی گہری ہے کہ انسان ہر دور میں ایک برتر ہستی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لیے بے قرار رہا ہے۔ منکرینِ مذہب بھی یہ بات ماننے پر مجبور ہیں کہ مافوق الفطری قوت کا تصور انسان میں اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ شیطان انسانوں کے اندر سے توحید کی اس فطری پیاس کو تو ختم نہیں کر سکا لیکن اس نے کبھی ان کے سامنے شرک کی نشہ آور شراب رکھ دی اور کبھی مادیت و انکارِ خدا کا رنگین شربت۔

حضرت آدمؑ کی داستان میں جن رکاوٹوں کا ذکر ہے وہ بالعموم رسولوں کی امتوں کو پیش آئیں۔ یہود و نصاریٰ آج بھی اس بات کی صداقت پر مہر لگانے کے لیے موجود ہیں۔ یہود اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ پہلی رکاوٹ کا شکار ہو گئے۔ شیطان کی طرح انہوں نے تکبر کیا اور اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہو کر مغضوب ہو گئے۔ جبکہ عیسائی دوسری رکاوٹ کا شکار ہوئے۔ توحید

کے علم کو تین ٹکڑوں میں تبدیل کرنے کے علاوہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام یعنی شریعت کی پابندی کا چوغہ ہی سر سے اتار پھینکا۔ بالخصوص عریانی اور جنسی بے راہروی جس بڑے پیمانے پر ان کے ہاں عام ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہ خود بھی گمراہ ہوئے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

ایک سوال

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو اکثر لوگ مجھ سے کرتے بھی ہیں کہ خدا نے انسان کو اس آزمائش میں کیوں ڈالا جس میں ان کی اکثریت ناکام ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس امتحان سے انسانیت گزر رہی ہے اس میں اسے خدا نے نہیں ڈالا۔ انسان نے خود اس آگ میں چھلانگ لگائی ہے۔ انسانوں کے رویے نے ہمیشہ اس بات کی تصدیق کی ہے۔ آج بھی انسان فائدہ حاصل کرنے کے لیے نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ آج بھی انسان نے اپنی دنیا میں کامیابی کے لیے امتحان کا اصول قائم کر رکھا ہے جس میں ناکامی کا پورا امکان ہوتا ہے۔ آج بھی انسان تجارت میں نفع کے حصول کے لیے اپنی پونجی کو داؤ پر لگانے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ یہ انسان کی طبیعت ہے۔ جو آج بھی ہے، ہمیشہ رہی ہے اور اس وقت بھی یقیناً ہوگی جب یہ امتحان ساری مخلوقات کے سامنے رکھا گیا تھا۔

انسان نے ابدی کامیابی، جنت کی بے مثال نعمتوں اور خدا کے تقرب کو دیکھ کر جہنم کے اندیشے سے آنکھیں بند کرلیں۔ کہانیوں کے اس غریب لکڑہارے کی طرح جو حسین و جمیل شہزادی اور شاہی تخت و تاج کو پالینے کی خواہش میں کسی بھی ناممکن مہم پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ لکڑہارا کامیاب ہو جاتا ہے۔ آج کا انسان بھی اکثر دنیاوی امتحان اور تجارت میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ یہاں مہم کو مہم، تجارت کو تجارت اور امتحان کو

امتحان سمجھا جاتا ہے۔مگر افسوس آخرت کی مہم،آخرت کی تجارت اورآخرت کے امتحان کوکوئی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔انسان آخرت میں اس لیے ناکام ہوگا کہ وہ اس سے غافل ہوگیا،اس لیے نہیں کہ اس میں کامیابی کی صلاحیت نہیں تھی۔

میری زندگی کی کتاب میں

بات میوزیم سے شروع ہوئی تھی مگر کہاں پہنچ گئی۔دراصل وہ ایک انتہائی شاندار،معلوماتی اورحیرت انگیز جگہ تھی۔اس روز ورکنگ ڈے تھا مگرلوگ بڑی تعداد میں، بالخصوص طلبا وہاں آئے ہوئے تھے۔اسکولوں کی بسوں میں بھر کر چھوٹے چھوٹے بچے بھی آئے ہوئے تھے۔میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ ان کے ذہن میں کیا سوالات پیدا ہوتے ہوں گے۔اپنی بھانجی کا ایک سوال میں پیچھے نقل کر چکا ہوں۔اس میوزیم میں آنے والے اکثر لوگ انکارِ خدا یا کم از کم اعراضِ خدا کا ذہن لے کر جاتے ہوں گے۔حالانکہ یہ خدا کی حمد وتسبیح کرنے کی بہترین جگہ تھی۔یہی معاملہ ان معلوماتی چینلز کا ہے جو دنیا بھر میں دیکھے جاتے ہیں۔مثلاً ڈسکوری،نیشنل جیوگرافک وغیرہ۔ اب تو کیبل کے ذریعے یہ ہمارے بھی گھر گھر میں دیکھے جاتے ہیں۔میں نے جو اس قدر دراز نفسی سے کام لیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے لاشعوری طور پر ہمارے لوگوں کو انکارِ خدا کی راہ پر ڈال دیا ہے۔کیونکہ وہ اس اعلیٰ طریقے سے اپنی بات پیش کرتے ہیں کہ لوگ خدا کے منکر نہ بھی ہوں تو اس کا ہونا نہ ہونا ان کی نگاہ میں برابر ہوجاتا ہے۔اورزیادہ سے زیادہ خدا کی وہی حیثیت رہ جاتی ہے جو فلسفہ میں مبداء اول کو حاصل ہے۔یعنی خدا نے دنیا پیدا تو کردی مگر اس کے بعد اس سے بےتعلق ہوگیا۔

اس بحث کے آخر میں بے اختیار میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی بہن پروین سلطانہ حنؔا کی ایک نظم لکھتا چلوں۔اس بحث کا اس سے اچھا اختتام میرے ذہن میں نہیں آرہا۔

میری خواہشات کے پرند سب
تہہ دام ہیں ترے حکم سے
تیرے حسن میں بڑی تاب ہے
میرے عجز میں کوئی شک نہیں
مگر اتنا سن مرے مہرباں
میری خواہشات کے باب میں
کسی امتحان کے نصاب میں
تیرا نام جس پر رقم نہیں
میری زندگی کی کتاب میں
وہ ورق نہیں وہ ورق نہیں

امریکی گالیاں

معاف کیجیے گا میں آپ کو سفر نامے سے بہت دور لے گیا۔ دراصل مغرب الحاد (Atheism) اور عیسائیت دونوں کا گڑھ ہے۔ میرے جیسے آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں ان سے لاتعلق ہو کر گزر جاؤں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسباب بھی ایسے پیدا کیے کہ مجبوراً مجھے دونوں پر قلم اٹھانا پڑا۔ مجھے امید ہے کہ پڑھنے والوں کے دل میں اگر ایمان کا کوئی شائبہ بھی موجود ہے تو انہیں یہ بحث غیر متعلق نہیں لگی ہوگی۔ آپ نے اوپر کی نظم نہیں پڑھی تو اب پڑھ لیں۔ مومن کی زندگی کے ہر ورق پر خدا کا نام رقم ہوتا ہے۔ بہرحال اب آیئے واپس نیویارک کی طرف۔ میوزیم میں کئی گھنٹے گزارنے کے بعد میں واپس ہوا۔ راستے میں دو جھگڑے دیکھے۔ ایک خواتین کا دوسرا مردوں کا۔ گھر آنے والی بس میں ایک آدمی چڑھا تو نجانے کس بات پر اس کی دوسرے

سے تلخ کلامی ہوگئی۔ نوبت مار پیٹ تک آ گئی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا۔ دوسرا جھگڑا گھر کے قریب سپر اسٹور کی پارکنگ سے گاڑی نکالنے پر دو خواتین میں ہوا جہاں ایک خاتون دوسری کی گاڑی پیٹ پیٹ کر اسے دعوتِ مبازرت دے رہی تھیں۔

ان دونوں لڑائیوں میں ان تمام فحش امریکی گالیوں (تاہم خواتین کے لیے بعض گالیاں تکنیکی طور پر قابلِ عمل نہ تھیں) کا آزادانہ استعمال کیا گیا جو عکاسی تو امریکی معاشرے کی کرتی تھیں، مگر اب ہالی وڈ کی مہربانی سے اقوامِ عالم کا قابلِ صد افتخار سرمایہ بن چکی ہیں اور ان کے نوجوان تبرک سمجھ کر انہیں اپنی اپنی قوموں میں تقسیم کرتے ہیں۔

نیویارک میں نمازِ جمعہ

نیویارک میں متعدد مساجد ہیں۔ مجھے مین ہٹن میں واقع اسلامک کلچرل سنٹر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے کا موقع ملا۔ یہ مسجد کسی عرب ملک غالباً کویت کے عطیے سے بنائی گئی ہے۔ مسجد کی عمارت کافی بڑی اور خوبصورت ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک لان بھی ہے۔ مسجد اسلامی فنِ تعمیر کے مطابق بنائی گئی ہے اور اس کے ساتھ ایک مینار بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ مسجد کی چھت ایک گنبد کی طرز پر تعمیر کی گئی ہے اور کافی بلند ہے۔ مسجد کے وسیع ہال اور لان میں کافی تعداد میں نمازی آسکتے ہیں۔

مجھے مسجد کی مکانیت کا علم نہ تھا۔ مگر جیسے ہی سب وے سے باہر نکلا تو اس عمارت کی ساخت نے دور سے بتا دیا کہ یہ مسجد ہے۔ مسجد میں بڑی تعداد میں نمازی موجود تھے۔ باہر لان میں بھی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ جبکہ مسجد کے ہال سے دو سیڑھیاں اس بالکنی کی طرف جا رہی تھیں جن میں خواتین کے لیے نماز کی ادائیگی کا انتظام تھا۔ یہاں کافی خواتین بھی موجود تھیں۔

مسجد عربوں کے زیرِ انتظام تھی۔ خطبہ گو انگریزی میں تھا مگر عربی طرز پر تھا۔ یعنی ہماری

طرح پہلے اردو میں تقریر اور بعد میں ''اصل'' عربی خطبے والا معاملہ نہ تھا۔جس کا مطلب اکثر عوام اور بعض اوقات مولوی صاحب کو بھی نہیں معلوم ہوتا۔ بلادِ عرب میں خطبے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے خطبے میں امام صاحب کوئی وعظ و نصیحت کی بات کہتے ہیں اور دوسرے میں زیادہ تر دعائیں کی جاتی ہیں۔یہی انداز یہاں اختیار کیا گیا تھا۔صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلا خطبہ انگریزی میں تھا اور دوسرے میں عربی میں دعائیں کی گئی تھیں۔

امریکا میں اسلام کا فروغ

امریکا میں اسلام سب سے زیادہ تیز رفتاری سے پھیلنے والا مذہب ہے۔اس ملک میں جتنے مذاہب ہیں، حالیہ برسوں میں ان میں سب سے زیادہ ترقی اسلام کو حاصل ہوئی ہے۔ امریکا میں قیام کے دوران ایک رپورٹ پڑھی جس کے مطابق امریکا میں مسلمانوں کی تعداد 80 لاکھ ہے۔بعض اندازوں کے مطابق مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ مسلمانوں میں پاکستانی مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ مجموعی طور پر 30 فیصد مسلمانوں کا تعلق جنوبی ایشیا، 30 فیصد کا افریقہ اور 25 فیصد کا عرب مما لک سے ہے۔مسلمانوں کی تعداد میں ایک طرف مہاجرین اضافہ کررہے ہیں اور دوسری طرف نومسلم۔ ہر سال تقریباً 20 ہزار امریکی اسلام قبول کرتے ہیں۔ان میں سے چودہ ہزار کا تعلق سیاہ فام لوگوں سے ہوتا ہے۔مساجد کی تعداد میں گزشتہ چھ برسوں کے مقابلے میں 25 فیصد اضافہ ہوا ہے اور ان کی تعداد 2100 سے بڑھ گئی ہے۔اس میں چھوٹی اور نئی مساجد شامل نہیں۔ جمعہ کی نماز کے لیے خطبے میں انگریزی اور عربی کا استعمال ہوتا ہے۔ان مساجد میں ہفتہ وار درس کا انتظام بھی ہوتا ہے۔21 فیصد مساجد میں مستقل طور پر قرآن کریم اور فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

یہ مساجد اسلام کے فروغ میں اہم کردار ادا کررہی ہیں۔اس کا ایک نمونہ میں نے جمعہ کی

نماز میں دیکھا۔نماز ختم ہوئی تو امام صاحب نے ایک عیسائی مرد وعورت کے قبولِ اسلام کا اعلان کیا۔حاضرین کی بڑی تعداد نے اس محفل میں شرکت کی ۔ یہ دونوں سیاہ فام تھے جنہیں کلمہ پاک پڑھایا گیا اور تمام حاضرین نے ان کے ساتھ اس کو دہرایا۔ بعد میں سب لوگوں نے ان کو جا کر مبارکباد دی۔اس دوران میں سوچ رہا تھا کہ امریکا میں قبول اسلام کی شرح سیاہ فام افراد میں زیادہ ہے۔شاید اس کا سبب اسلام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور مساوات کا تصور تھا۔مثلاً نماز کو ہی لے لیں۔اس وقت اس مسجد میں درجنوں رنگ ونسل کے لوگ جمع تھے مگر دین کے رشتے سے وہ سب بھائی بھائی تھے۔خطبے کے دوران یہ سب لوگ بلا ترتیب بیٹھے تھے مگر جیسے ہی خدا کے حضور کھڑے ہونے کا وقت آیا چند لمحوں میں بغیر کسی خارجی کوشش کے یہ انتہائی ترتیب سے کھڑے ہو گئے۔ہم مسلمان اس منظر کو دیکھ دیکھ کر عادی ہو چکے ہیں مگر ایک غیر مسلم کی نگاہ میں، خصوصاً اگر اس کا تعلق معاشرے کے کسی پسماندہ طبقے سے ہے تو یہ منظر بہت غیر معمولی ہوگا۔اقبال نے کیا خوب کہا تھا۔

بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

اسلام کی جانب راغب خاتون

مسجد میں قبول اسلام کی اس محفل کے دوران میرے ذہن میں بار بار یہ سوال سر اٹھا رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے کہ قبولِ اسلام کی شرح سفید فام لوگوں میں کم ہے۔سیاہ فام لوگوں میں قبولِ اسلام کی شرح کے زیادہ ہونے کی وجہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔جبکہ سفید فام لوگوں میں فروغِ اسلام کی کمی کا ایک سبب شاید یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کو اعلیٰ علمی بنیادوں پر پیش نہیں کیا جا رہا۔ان کی ذہنی سطح کے اعتبار سے ضروری لٹریچر اس بڑے پیمانے پر دستیاب نہیں جیسا کہ ہونا چاہیے۔

مسجد سے نکلتے وقت ایک واقعہ پیش آیا جس سے میرے اس خیال کی تصدیق ہوئی۔

مسجد سے نکل کر میں باہر لگے ہوئے بک اسٹالوں کی طرف بڑھا۔ان پر اردو، انگریزی اور عربی میں اسلامی کتب موجود تھیں۔اتنے میں ایک اسٹال پر ایک جوان سفید فام خاتون کو دیکھا۔ وہ اسلامی کتابیں دیکھ رہی تھیں۔ایک عربی نوجوان ان سے گفتگو کر رہا تھا۔ میں چونکہ ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا اس لیے ان کی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ یہ لڑکی اسلام کی طرف راغب ہے اور جمعہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر اپنے آفس سے اٹھ کر آتی ہے۔ یہ عیسائی ہے مگر اپنے مذہب سے مطمئن نہیں۔اس نوجوان سے اس کا تعارف بک اسٹال پر ہوا جہاں وہ اسلام سے متعلق کچھ کتابیں دیکھ رہی تھی۔نوجوان نے اس لڑکی کو قرآن پڑھنے کا مشورہ دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی۔اس کے بعد میں نے بک اسٹال پر موجود کتابیں دیکھیں۔ وہاں زیادہ تر کتابیں مسلمانوں کے اعتبار سے تھیں اور اردو یا عربی میں تھیں۔ بلکہ بعض تو ایسی تھیں کہ غیر مسلم انہیں نہ ہی پڑھیں تو بہت اچھا ہے۔انگریزی میں اہل مغرب کے ذہنی پس منظر کے اعتبار سے لکھی گئی دعوتی نوعیت کی کوئی کتاب وہاں مجھے نظر نہیں آئی۔حق ہر دور میں حق ہوتا ہے مگر اسے ہر دور کے معیاری اسلوب کے اعتبار سے پیش کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اس لڑکی کے لیے خدا سے دعا کی کہ وہ اسے ہدایت دے اور راہ حق پر اس کی مدد کرے۔

نیویارک کا حسین ترین نظارہ

نیویارک شہر کا ایک مکمل اور بھرپور نظارہ فراہم کرنے کے متعدد ذرائع دستیاب ہیں۔ایک شہر کی کسی بلند عمارت سے۔ دوسرا نظارہ ہیلی کاپٹر سروس کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔اس سروس کے ذریعے سے شہر کے بعض حصوں یا پورے شہر کا فضائی منظر دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ

پانی پر تعمیر شدہ پلوں سے بھی یہ نظارہ ممکن ہے۔ ہیلی کاپٹر میں تو میں بیٹھا نہیں البتہ دیگر دو طریقوں سے میں نیویارک کو دیکھ چکا تھا۔ مگر ایک روز اتفاقیہ طور پر نیویارک کو ایک ایسی جگہ سے دیکھا جس سے اس کی خوبصورتی کا غیر معمولی نظارہ سامنے آیا۔

اتوار کا دن تھا اور فہیم بھائی کی چھٹی تھی۔ ہم شام کے وقت گھر سے نکلے۔ کوئی خاص جگہ ذہن میں نہیں تھی۔ فہیم بھائی کئی دنوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ ساؤتھ فیری (Ferry) کی طرف بھی جاؤ۔ یہ دراصل بحری جہازوں کی وہ سروس ہے جو مین ہٹن سے اسٹیٹن آئی لینڈ تک مسافروں کو لاتی لیجاتی ہے۔ ابھی تک مجھے وہاں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں روز گھر سے نکلتا مگر کبھی کسی قابل دید جگہ چلا جاتا اور کبھی شہر میں مٹر گشت کرتا رہتا۔ اس روز جب فہیم بھائی کے ساتھ گھر سے نکلا تو فیری کی طرف جانے کا فیصلہ ہوا۔ ہم ٹرین سے مین ہٹن کے سب سے آخری جنوبی اسٹیشن پر پہنچے۔ یہ سمندر سے بالکل متصل سب وے ہے جہاں وہ پورٹ واقع ہے جس سے فیری چلتی ہے۔

میں اس سے قبل کشتیوں پر تو بیٹھا تھا لیکن بحری جہاز پر سواری کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ یہ ایک دو منزلہ جہاز تھا۔ اس کے گراؤنڈ فلور پر مین ہٹن سے آنے والی گاڑیاں چڑھ رہی تھیں جبکہ اوپر نیچے کی تمام منزلوں پر لوگ سوار تھے۔ ہم جہاز میں بیٹھنے والے آخری افراد میں سے تھے جس کے بعد جہاز چل پڑا۔ ہم اوپر کی منزل پر گئے اور جہاز کے عقبی عرشے پر جا کر کھڑے ہوگئے۔ جہاز میں کئی سو افراد تھے۔ مگر یہ زیادہ تر روز کے آنے جانے والے لوگ تھے اس لیے اندر بیٹھے تھے۔ عرشے پر ہمارے جیسے سیاح ہی کھڑے ہونے کی ہمت کر سکے۔ کیونکہ انتہائی ٹھنڈی اور تیز سمندری ہوا میں کھڑا ہونا آسان نہ تھا۔

اس وقت سورج غروب ہوئے تقریباً آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ چاند اپنے پورے

دنوں میں تھااور پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔سمندر کے پرسکون پانی میں اس کا دلکش عکس بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ نیو یارک ایک بڑا بین الاقوامی شہر ہے جس کے متعدد ایئر پورٹس ہیں۔ساتھ میں ریاست نیو جرسی کے شہر نیو آرک کا ایئر پورٹ بھی قریب ہے۔لہٰذا پورے سفر میں درجنوں ہوائی جہاز جگنوؤں کی طرح آسمان میں ہر سمت اڑتے نظر آئے۔ کیونکہ یہاں ہر منٹ میں ایک ایئر پورٹ پر نجانے کتنے جہاز اترتے اوراڑتے ہیں۔

یہ سارے مناظر ہی اپنی جگہ بہت پر کیف تھے۔مگران سب سے بڑھ کر جس منظر نے ہمیں اور دیگر سیاحوں کو اپنے اندر جذب کرلیا وہ مین ہٹن کی فلک بوس عمارتوں کی روشنیاں اور جگمگاہٹ تھی۔ فیری مین ہٹن سے ہی روانہ ہوئی تھی۔قریب سے بھی ان عمارتوں کی روشنیاں بڑی دیدہ زیب لگ رہی تھیں۔مگر جیسے جیسے جہاز ساحل سے دور ہوتا گیااور یہ بلند عمارتیں آنکھ کے تل میں سماتی گئیں یوں محسوس ہونے لگا کہ گویا ہم جنتِ ارضی کا نظارہ کررہے ہیں۔عروس البلاداور روشنیوں کا شہر جیسے الفاظ جو ابھی تک نجانے کتنے شہروں کے بارے میں سنے اور پڑھے تھے، پہلی دفعہ ان کی کوئی حقیقی تعبیر دیکھی۔

اس پورے منظر کی اصل خوبصورتی یہ تھی کہ جہاز چونکہ بڑا تھا اس لیے کشتی کی طرح ہچکولے کھائے بغیرآہستگی سے ساحل سے دور ہٹتا چلا گیا۔جس کے ساتھ یہ عمارتیں اور یہ پورا منظر بہت خاموشی اور آہستگی سے ہماری نگاہوں میں سماتا چلا گیا۔فہیم بھائی نے کہا کہ نیو یارک کا یہ رخ انھوں نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔حسنِ فطرت اورانسانی ہنر کے امتزاج نے عرشہ پر موجود ہر شخص کو متاثر کیا اور لوگ دھڑا دھڑ اس منظر کے فوٹو لینے لگے۔جبکہ بعض لوگوں نے مووی بھی بنائی۔بعد میں جب میں اپنے بھائی عرفان اورعزیز بھائی کے ساتھ آیا تو اس وقت عرفان بھائی نے بھی اس منظر کی مووی بنائی تھی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ہماری فیری اسٹیٹن آئی لینڈ کے کنارے جا کر رکی۔ جس کے ساتھ ہی لوگ دھڑا دھڑ جہاز سے اترنے لگے۔ نیچے سے گاڑیاں بھی نکل کر جا رہی تھیں۔ ہم اوپر سے کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے۔ جب جہاز خالی ہو گیا تو یہ عمل برعکس انداز میں شروع ہو گیا یعنی لوگ اور گاڑیاں جہاز میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ ہمارے جیسے لوگ چند ہی تھے جو جہاز میں پہلے سے موجود تھے۔ چند منٹ بعد فیری وسل دے کر واپس روانہ ہو گئی۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے ہم جہاز کے اگلے حصے میں آئے تھے جو واپسی کے سفر میں اب پچھلا حصہ بن چکا تھا۔ ہم دوبارہ وہیں آ گئے تا کہ مین ہٹن کی روشنیاں دوبارہ دیکھ سکیں جو اس وقت کافی دور تھیں۔

ہمارا جہاز اسٹیچو آف لبرٹی کے پاس سے بھی گزرا جو کہ امریکی عوام کے لیے فرانس کا تحفہ تھا۔ اس پر بھی سبز رنگ کی روشنیاں تھیں جن میں مشعل بردار مجسمۂ آزادی دور سے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ مگر مین ہٹن کی روشنیوں کے سامنے اس کی حیثیت ماند پڑ گئی تھی۔ ویسے اس کی اپنی خصوصی فیری ساحل پر واقع بیٹری پارک کے پاس سے چلتی تھی۔ فہیم بھائی پہلے دن مجھے سیدھے یہیں لائے تھے۔ یہ فیری مسافروں کو اس جزیرے پر لا کر اتارتی تھی جس پر یہ مجسمہ نصب ہے اور وہ اوپر تک چڑھ سکتے تھے۔ مگر اس وقت یہ فیری بند تھی۔ دوسری سمت ویریزانو برج تھا۔ جو اسٹیٹن آئی لینڈ کو بروکلن کے ذریعے بقیہ شہر سے ملاتا ہے۔ اس پر جلتی روشنیاں بھی بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔

بہر حال آج کی رات مین ہٹن کی روشنیاں ہر چیز پر بازی لے گئیں۔ گویا وہ کوئی طلسم کدہ تھا یا پرستان کا نظارہ جس کی آسمان تک بلند محلوں جیسی عمارات دور سے جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ اس وقت تک انتہائی ٹھنڈی ہوا میں دیر تک کھڑے رہنے سے میرا منہ سن ہو گیا تھا۔ مگر اندر جا کر بیٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں اس کے بعد بھی کئی دفعہ یہاں آیا۔ رات میں بھی اور دن میں بھی۔

مگر جیسا اچھا منظر اس روز دیکھا تھا دوبارہ نہیں دیکھا۔ کبھی چاند نہیں تھا اور کبھی روشنیاں کم تھیں۔ پھر پہلی دفعہ تو پہلی دفعہ ہی ہوتی ہے۔ اور جیسا کہ اوپر کہیں لکھا ہے اس عیب سے پاک تو صرف خدا کی جنت ہوگی جہاں ہر دفعہ پہلی دفعہ ہی ہوگی۔

ٹائمز اسکوائر اور فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ

نیو یارک کا تذکرہ ٹائمز اسکوائر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ امریکا دنیا کا مرکز ہے، نیو یارک امریکا کا، مین ہٹن نیو یارک کا اور ٹائمز اسکوائر مین ہٹن کا مرکزی مقام ہے۔ میں یہاں بار بار آیا۔ کچھ اس لیے بھی کہ یہ مرکزِ شہر میں واقع ہے۔ راستے میں کہیں آتے جاتے یہاں آنا آسان ہے۔ یہ حقیقی معنوں میں نیو یارک کے بین الاقوامی شہر کا دل ہے۔ یہاں ہر ملک، رنگ اور نسل کے لوگ دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ ٹائمز اسکوائر کا اصل حسن رات میں ظاہر ہوتا ہے جب ہر طرف رنگ و روشنی کا سیلاب آ جاتا ہے۔ یہاں بہت بڑے بڑے اشتہاری اسکرین لگے ہوئے ہیں جن پر چلتی ہوئی اشتہاری فلمیں دور سے نظر آ جاتی ہیں۔ بعض اسکرین ایسے بھی دیکھے جن پر تازہ ترین خبریں مسلسل نشر ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے سائن بورڈز بھی روشن رہتے ہیں۔ دن کے وقت ان کو دیکھنے سے کوئی خاص تاثر نہیں ابھرتا۔ البتہ رات کو جب دیکھا تو بہت خوبصورت لگا۔ حال یہ ہے کہ فٹ پاتھ پر بھی انہوں نے سیمنٹ کے مسالے میں چمکدار ذرے (Glitter) ملا کر بچھا رکھے ہیں۔ رات کو جب ہر طرف روشنی پڑتی ہے تو یہ فٹ پاتھ بھی جگمگا اٹھتی ہے۔ غرض رات میں پورا علاقہ بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

یہیں نئے سال کی تقریب ہوتی ہے۔ جس میں شرکت کے لیے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتی ہیں اور دنیا بھر سے لاکھوں سیاح نیو یارک آتے ہیں تو اس علاقے کی رونق دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں بعد میں جب نیو یارک

آیا تو ٹائمنر اسکوائر بھی آیا۔اس وقت یہاں کی رونق واقعی دیکھنے کے لائق تھی۔ سنا تھا کہ یہ علاقہ منشیات فروشی ،عریاں نگاری اور بدکاری کا بڑا اڈہ تھا۔مگر نیویارک کے موجودہ میئر کی کوششوں سے یہ علاقہ ان لعنتوں سے پاک ہو چکا ہے۔تاہم ابھی بھی یہ دھندا کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے ۔ایک روز میں وہاں سے گزر رہا تھا کہ ایک سیاہ فام نوجوان نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "Hey man do you want girls ?"اس کے بعد وہ لڑکیوں کی تفصیلات بتا تا رہا مگر میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ایسے موقعوں پر پیچھے مڑ کے دیکھنے سے آدمی اکثر پتھر کا ہو جاتا ہے۔

اسی جگہ فورٹی سیکنڈ اسٹریٹ ہے جہاں تھیٹرز اور سینما ایک قطار میں واقع ہیں۔امریکا میں سینما کا نظام بھی عجیب ہے۔عزیز بھائی نے مجھے بتایا کہ یہاں سینما میں ایک وقت میں بہت ساری فلمیں چلتی ہیں۔جن کے لیے الگ الگ ہال ہوتے ہیں۔بعض اوقات تو ایک ہال میں پانچ دس افراد ہی بیٹھ کر ایک فلم دیکھ رہے ہوتے ہیں۔اسی اسٹریٹ پر سینما کی قطار کے بیچ میں مادام تساؤ کا مومی عجائب گھر ہے۔ میں پہلی دفعہ گیا تو یہ زیرِ تعمیر تھا۔ بعد میں آیا تو اس کا افتتاح ہو چکا تھا۔ میں نے اس میں جانے کا ارادہ کیا کیونکہ بچپن سے اس کا بڑا تذکرہ سنا تھا۔مگر اس روز وہاں کوئی پرائیویٹ پارٹی ہو رہی تھی جس کی بنا پر یہ بند تھا۔

عرفان بھائی کی آمد اور میری روانگی

فہیم بھائی ،عزیز بھائی اور نگہت باجی سب لوگوں کا اصرار تھا کہ میں امریکا کی دیگر جگہیں بھی دیکھنے جاؤں۔خاص طور پر فلوریڈا کے خوبصورت ساحل،ڈزنی لینڈ یا ڈزنی لینڈ کی طرز پر ہی بنے ہوئے نیویارک سے قریب واقع سکس فلیگ (Six Flags) جانے کے لیے انکا بہت اصرار تھا۔اسکے علاوہ اور دیگر کئی ریاستوں میں میرے قریبی دوست اور احباب موجود تھے جن کا اصرار تھا کہ میں ان کے پاس بھی آؤں۔مگر میں پاکستان سے نکلنے کے بعد ایک طرح سے مسلسل

حالتِ سفر میں تھا اور اب ذرا کچھ ٹھہراؤ چاہتا تھا۔اس لیے کینیڈا واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا......

ٹرین میں بیٹھنے سے قبل میرا ٹکٹ اور پاسپورٹ چیک ہوئے جبکہ کینیڈا سے آتے وقت ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ اسی طرح کینیڈین بارڈر پر بھی ٹرین بہت دیر تک رکی اور بہت سختی کے ساتھ چیکنگ ہوئی۔ نجانے اس کی وجہ کیا تھی۔ٹرین کی روانگی کا وقت سات بجے تھا۔ میں اندر جا کر بیٹھا تو بے اختیار لمحے بھر میں میرے سامنے اپنے قیام کا پورا عرصہ گزر گیا۔ جب میں آیا تھا تو ہر چیز کتنی اجنبی اور غیر مانوس لگ رہی تھی۔لیکن میں اس مختصر عرصے میں یہاں اتنا گھوما کہ ہر چیز مجھے اپنی اپنی لگنے لگی ۔ یہاں کا پورا نظام میں نے بہت جلدی سمجھ لیا اور اس سے مانوس ہوگیا ۔جب مانوس ہوا تو واپسی کا وقت آ گیا۔

یہی کہانی اس دنیا میں آنے والے ہر انسان کی کہانی ہے۔ہم اس دنیا میں آتے ہیں۔لوگ ہمارے منتظر ہوتے ہیں۔ہمارے آنے پر خوش ہوتے ہیں۔ جیسے میری بہن ، بہنوئی اور بھانجیاں میرے آنے پر خوش تھے۔پھر یہ اجنبی دنیا ہمارے لیے مانوس ہوتی چلی جاتی ہے۔جیسے یہ شہر میرے لیے ہوگیا تھا۔ پھر ایک روز ہم واپس ہو جاتے ہیں۔جیسے میں واپس ہو رہا ہوں۔ چاہنے والے روتے ہوئے پیچھے رہ جاتے ہیں۔جیسے میری بہن میری روانگی کے وقت رو رہی تھیں اور عزیز بھائی اور فہیم بھائی اسٹیشن تک چھوڑنے آئے تھے۔اور اب جب میں ٹرین میں تنہا بیٹھا ہوں تو سب خواب لگ رہا ہے۔

وائے ناکامی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ٹرین آہستگی سے روانہ ہوئی۔آتے وقت تو سارا وقت مباحثے میں گزر گیا تھا۔مگر واپسی

میں اس بہار کا نظارہ دیکھتا گیا جو اپنے جوبن پر آچکی تھی اور قدم قدم پر سبحان اللہ کہنے کا مقام تھا۔ ٹرین نیویارک سے کینیڈا کی طرف شمال کی سمت میں روانہ ہوئی۔ تقریباً دوسو میل تک دریائے ہڈسن ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کے پار سبزے سے لدے درخت اور درختوں سے ڈھکے پہاڑ تھے۔ عجیب دل آویز نظارہ تھا۔ نیلا آسمان، سفید و سیاہ بادل، سرسبز و شاداب پہاڑ اور مٹیالے دریا کا بہتا پانی۔ لگتا تھا کہ کائنات کے سارے رنگ انہی چند رنگوں میں سما گئے ہیں۔

نیویارک اسٹیٹ کے دارالخلافہ البنی (Albany) سے ٹرین مغرب کی سمت مڑ گئی۔ یہاں سے دریا کا ساتھ تو ختم ہوا لیکن سبزے اور پہاڑوں کا عالم وہی رہا۔ البتہ کہیں کہیں جھیلیں آجاتیں جن کا رنگ ہڈسن کے مٹیالے پانی کے برعکس گہرا سبز تھا۔ جہاں یہ جھیلیں نہ ہوتیں وہاں سرسبز میدان آجاتے۔ آٹھ نو گھنٹے بعد ٹرین نیاگرا فال کے بارڈر پر پہنچی جہاں دو گھنٹے کھڑے ہونے کے بعد ہم کینیڈا کی حدود میں داخل ہوئے۔ اس کے مزید دو گھنٹے بعد ٹرین ٹورنٹو کے یونین اسٹیشن پہنچی تو شام ہورہی تھی۔ میرا دل اداس تھا۔ مگر زندگی خوشی اور غم سے بے نیاز اپنے حساب سے سفر کرتی ہے۔ آج اس سفر کا ایک اہم باب اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ فالحمدللہ رب العالمین۔

کینیڈا: لوگ، حالات اور زمین

کلچرل لنک (Cultural Link)

کینیڈا کی حکومت نے ایسے کئی ادارے قائم کر رکھے ہیں جو نئے آنے والوں کو یہاں سیٹ ہونے میں ہر ممکن مدد فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح کے اداروں کے پتے اور فون نمبرز ان بروشرز میں دستیاب ہوتے ہیں جو ایئرپورٹ پر دیے جاتے ہیں۔ کلچرل لنک بھی ایک ایسا ہی ادارہ ہے جہاں نئے آنے والوں کو مختلف خدمات بلا معاوضہ پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً لوگوں کو باہم متعارف کرانا، انگریزی کی تعلیم، ٹوفل کی تیاری، لیگل سروس، جاب ڈھونڈنے سے متعلق ہر طرح کی تیاری وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہاں فون، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور اخبارات کی سہولتیں بھی مفت دستیاب ہیں۔

میں نے اپنے قیام کے دوران یہاں کے متعدد پروگراموں میں داخلہ لیا۔ جس سے مجھے کافی فائدہ ہوا۔ مزید براں یہ کہ مختلف ملکوں کے لوگوں، ان کے کلچر اور معاملات سے آگاہی حاصل ہوئی۔ ان میں چین، بنگلہ دیش، ایران، مصر، شام، میکسیکو، برازیل اور دیگر کئی ملکوں کے لوگ شامل تھے۔ یہاں میرا ایک بہت اچھا دوست بنا۔ اس کا نام عبدالطیف تھا اور اس کا تعلق شام سے تھا۔ تاہم وہ اور اس کا خاندان مستقلاً سعودی عرب میں مقیم تھے۔ دیگر کئی ملکوں سے تعلق رکھنے والے خواتین و حضرات سے بھی اچھی دعا سلام ہوگئی۔ متعدد مقامی کینیڈین لوگوں سے بھی

یہیں کے حوالے سے دوستی ہوئی۔ جن میں سب سے نمایاں شخص ڈینس تھا۔ اس سنٹر کی ایک سروس (Host Program) کے نام سے تھی۔اس میں کوئی مقامی شخص رضا کارانہ طور پر نئے آنے والے کو مقامی کلچر، اقدار اور دیگر معاملات سے آگاہ کرتا تھا۔ڈینس سے اسی حوالے سے دوستی ہوئی۔ہم وقفے وقفے سے ملتے رہے اور وہ مجھے مختلف معاملات میں رہنمائی دیتا رہا۔ میں نے کینیڈا کی زندگی اور لوگوں کے بارے میں کئی چیزیں اس کے ذریعے جانیں۔

ہمارے ویگن والے اور میری مسلمانی غیرت

ایک روز میں کلچرل لنک سے واپس آرہا تھا۔ڈاؤن ٹاؤن پہنچ کر ٹرین میں بیٹھنے کے لیے میں سب وے میں گیا۔ یہ سب وے وہ انٹرسیکشن تھا جہاں دو لائنیں آپس میں ملتی ہیں۔دفاتر کی چھٹی کا وقت تھا اور اس وقت اگر کسی وجہ سے ایک ٹرین چند منٹ بھی لیٹ ہو جائے تو لوگوں کا جم غفیر جمع ہو جاتا ہے۔اس وقت یہی صورتحال تھی اور کافی رش تھا۔ یہ لوگ ہر جگہ لائن بنا لیتے ہیں مگر سب وے پر لائن بنانا عملاً ممکن نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسٹیشن پر ٹرین صرف چند لمحوں کے لیے رکتی ہے۔ایسے میں اگر لائن بنائی جائے گی تو اکثر لوگ ٹرین میں سوار نہیں ہوسکیں گے۔اس کی جگہ لوگ تھوڑی تھوڑی دور پھیل کر کھڑے ہوتے ہیں۔ جب ٹرین آتی ہے تو پہلے اترنے والے اترتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف دروازوں کے سامنے کھڑے لوگ ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ جب میں نے رش کی یہ صورتحال دیکھی تو سوچا کہ آج تو خوب مارا ماری ہوگی۔ کیونکہ چھٹی کے اوقات میں تو ٹرین پچھلے اسٹیشن سے ہی بھر کر آتی ہے۔ایسے میں جو تھوڑی بہت جگہ ہوگی اس کے لیے سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں امیدواروں کی موجودگی میں ''عقابی شان'' سے جھپٹنا ہوگا۔اور زمانۂ طالبعلمی کے اس معرکے کی یاد تازہ ہو جائے گی جو صدر کے مرکزی علاقے

سے، رش کے اوقات میں، ویگن میں بیٹھتے وقت برپا ہوتا تھا۔ لوگ سکون سے کھڑے تھے۔ مگر میں مذکورہ بالا خیال کے تحت آہستہ آہستہ لوگوں کے بیچ سے کھسکتا ہوا آگے پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں ٹرین آئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب لوگ نعرہ تکبیر بلند کر کے ٹرین پر ٹوٹ پڑیں گے۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ پہلے اترنے والوں کو آرام سے اترنے دیا گیا۔ لیکن ٹرین پہلے ہی اتنی بھری ہوئی تھی کہ بہت کم جگہ بن سکی۔ میرے آگے کھڑے لوگ بغیر کسی دھینگا مشتی کے ایک ایک کر کے ٹرین میں چڑھنا شروع ہو گئے۔ میرے ساتھ کھڑی ہوئی ایک لڑکی آگے بڑھی تو پیچھے کھڑی ایک خاتون تیزی سے آگے بڑھیں اور ٹرین میں چڑھ گئیں۔ اس کے بعد وہ لڑکی چڑھی اور اسکے پیچھے میں بھی سوار ہو گیا۔

میں ابھی تک اس خیال میں تھا کہ میرے پیچھے کچھ نہیں تو دس بیس افراد لازماً دھکا مار کر اندر گھس جائیں گے۔ اس معاملے میں میری تربیت کراچی کے ان ویگن والوں کے ہاتھوں ہوئی تھی جن کا نصب العین اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

"In my van there is always a place for another man"

لہٰذا ان کے حساب سے ابھی ٹرین میں کافی ''گنجائش'' تھی۔ مگر مقامی لوگوں کے اعتبار سے جگہ ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ لڑکی اگلی خاتون سے اتنا کہہ کر اتر گئی کہ تمہیں پتا ہے تم نے کیا کیا ہے؟ تم مجھے کراس کر کے اوپر چڑھی ہو۔ اس کے اترنے سے میرے لیے آرام سے کھڑے ہونے کی گنجائش ہو گئی۔ مگر میں دل میں شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ اسٹیشن پر کھڑے لوگوں میں سے بمشکل دو فیصد لوگ ہی ٹرین میں سوار ہو سکے ہوں گے۔ میں ان سب کو کراس کر کے ٹرین میں چڑھا تھا۔

ٹرین چل پڑی اور میں خاموشی سے کھڑا اس جم غفیر کو دیکھنے لگا جو انتہائی سکون سے کھڑا

اگلی ٹرین کا انتظار کر رہا تھا۔ میرا احساسِ ندامت بڑھا تو میری مسلمانی غیرت کو جوش آیا۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ یہ لوگ اخلاقی طور پر اس قابل نہیں کہ ٹرین میں گھس گھس کر کھڑے ہوں۔ کیونکہ اس طرح خواتین سے بدتمیزی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ ان کی خوبی تھوڑی ہے۔ یہ تو ان کی پست کرداری کی دلیل ہے۔ پھر میں اپنی ان عظیم روایات کے تصور میں کھو گیا جن کے تحت عید تہوار پر شاپنگ کے لیے نکلی خواتین کو رش کا فائدہ اٹھا کر تنگ کیا جاتا ہے اور نہ کالج جانے والی طالبات کو راستے میں پریشان کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس احساسِ جرم سے مجھے نجات مل گئی جو ٹرین کی چھک چھک کے ساتھ مجھے کچوکے لگا رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ ہماری وہ لیڈر شپ ہمارے لیے کتنی بڑی نعمت ہے جو اپنی ہر غلطی اور خطا کا ذکر آنے پر ہمیشہ دوسروں کی برائیاں نمایاں کرنے لگتی ہے۔ یہ اندازِ فکر نہ ہو تو ہمارا ضمیر ہمیں مار ہی ڈالے۔

کینیڈا: رنگ اور موسم

میں امریکا کے لیے روانہ ہوا تو درخت مکمل طور پر گنجے تھے۔ امریکا پہنچا تو وہاں آمدِ بہار کا سماں تھا۔ درختوں پر کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ میرے مہینے بھر کے قیام کے دوران یہ درخت دیکھتے ہی دیکھتے ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ میں جب واپس لوٹا تو کینیڈا میں بھی بہار اپنا رنگ جما چکی تھی۔ ٹورنٹو میں درختوں کی کثرت ہے اس لیے بہار کی اثر آفرینی امریکا کے مقابلے میں کہیں زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا تاثر کچھ اس لیے بھی زیادہ تھا کہ خشک درختوں کی جن وادیوں کو میں چھوڑ کر گیا تھا واپسی پر ان میں سبزے کی وہ بہار دیکھی کہ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ ان لوگوں کا ارادہ تو یہ ہے کہ آنے والے سالوں میں ٹورنٹو کو پارک سٹی بنا دینگے۔ یعنی اتنے درخت لگائیں گے کہ لوگوں کو اس کے پارک ہونے کا گمان ہو گا۔ میرے حساب سے تو یہ ابھی بھی پارک سٹی ہے۔

اس خطے میں سارے موسم بھرپور طریقے سے آتے ہیں۔ صرف گرمی کا دورانیہ اور شدت ذرا کم ہوتی ہے۔ مگر یہ کمی ہمارے حساب سے ہوتی ہے۔ ورنہ آپ اندازہ کریں کہ جو لوگ زیادہ تر منفی درجۂ حرارت میں رہنے کے عادی ہوں ان کے لیے تیس سے اوپر گرمی کا مطلب کیا ہوتا ہوگا۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ جیسے ہی گرمی اس مقام پر پہنچی لوگ اے سی، بیچ اور پول میں بالترتیب بیٹھ، لیٹ اور کود گئے۔ تاہم جب گرمی کا مختصر دورانیہ ختم ہونے کو آتا ہے اور خزاں کے سائے ڈیرے ڈالنے لگتے ہیں تو حسنِ فطرت کچھ اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ قلم اس کے بیان سے عاجز ہے۔ میں یہ منظر براہِ راست خود تو نہیں دیکھ سکا البتہ تصویروں سے اور لوگوں کی زبانی اس کا جو نقشہ سامنے آیا وہ بے حد حسین تھا۔ آمدِ خزاں پر تمام درختوں کے پتے، گرنے سے قبل، اپنا رنگ بدل لیتے ہیں۔ اس وقت یہ درخت سبز رنگ کی چادر اتا کر سرخ، پیلے، گلابی اور کتھئی رنگ کا لباس اس تنوع کے ساتھ زیب تن کرتے ہیں کہ انسان دیکھے اور بے اختیار سبحان اللہ کہہ اٹھے۔

تھوڑے عرصے میں درختوں کی شاخیں پتوں کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیتی ہیں۔ یہ پتے جھڑ جاتے ہیں اور ایک طویل وقت کے لیے برف کا سفید رنگ ہر چیز کی طرح ان درختوں کو بھی ڈھانپ لیتا ہے۔ سردی کے اس طویل وقفے کے بعد، جس میں درخت ننگے رہتے ہیں اور انسان لدے پھندے، بہار لوٹ کر آتی ہے۔ لیکن بہار کی آمد سے قبل ہی یہ لوگ خود پر بہار طاری کرلیتے ہیں۔ یہ درختوں پر زبردستی پتے تو نہیں اگا سکتے لیکن ہر جگہ گھاس کا سبز قالین بچھا دیتے ہیں اور اس طرح بچھاتے ہیں کہ میں کوشش کے باوجود ٹورنٹو میں کوئی ایسا قطعۂ زمین نہیں ڈھونڈ سکا جو سبز نہ ہو۔ میری نگاہیں مٹی کا رنگ دیکھنے کے لیے ترس گئیں۔ فٹ پاتھ اور سڑک کے علاوہ ہر جگہ گھاس لگی ہوئی تھی۔ یہ چونکہ میرے آنے سے ذرا قبل لگی تھی اس لیے میں عرصے

تک اسے اگی ہوئی گھاس سمجھتا رہا۔مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اگی ہوئی نہیں بلکہ لگی ہوئی گھاس ہے۔

اس کے بعد فطرت کے خاموش ہاتھ چپکے چپکے درختوں کو رنگوں سے سجانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ رنگ سبز کے علاوہ سرخ، سفید، گلابی وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ میں نے پھولوں کے رنگ تو دیکھے تھے مگر پتوں کے اتنے رنگ یہیں آ کر دیکھے۔ مجھے یہ بہار اس لیے بھی بہت پسند آئی کہ ساری زندگی میں نے کراچی اور جدہ کے گرم ساحلی علاقوں میں گزاری۔ جہاں تین ہی موسم آتے ہیں۔ بہت گرمی، کم گرمی اور چند دنوں کی سردی۔ جدہ میں تو یہ چند روزہ سردی بھی نہیں آتی۔ میں نے کبھی بہار کا روپ دیکھا نہ خزاں کی ویرانی۔

یہ بہار اپنی جگہ مگر مئی کے آخر میں جب دنیا بھر میں لوگ سردی کو الوداع کہہ چکے ہیں یہاں ابھی تک جیکٹس جان کا روگ بنی ہوئی ہیں۔ یہ جیکٹس سردی میں استعمال کی جانے والی اپنی بہنوں سے ہلکی ہوتی ہیں اور اصطلاحاً اسپرنگ جیکٹس کہلاتی ہیں۔ ویسے یہاں اسپرنگ میں جتنی سردی پڑتی ہے میں نے تو اپنی طرف سخت جاڑے میں بھی ایسا حال نہیں دیکھا۔ گو درجۂ حرارت پندرہ ڈگری تک آ جاتا ہے مگر ٹھنڈی ہوا اس کی تاثیر کو لوگوں تک پہنچنے نہیں دیتی۔ یہاں جولائی اگست گرمی کے مہینے ہوتے ہیں جس کے بعد خزاں کے ساتھ ہی اسی بہار جیسی سردی اپنا ڈیرا ڈال دیتی ہے یہاں تک کہ شدید سردی کی لہر اسکی جگہ لے لیتی ہے۔

نکاح، زنا اور پلے بوائے زندگی

میرے امریکا قیام کے دوران ایک مقدمے کی روداد بڑے تواتر سے میڈیا پر نشر ہو رہی تھی جس سے مغربی زندگی کا ایک دلچسپ تضاد سامنے آیا۔ امریکی ریاست یوٹا کے 53 سالہ ایک شخص ٹام گرین پر الزام تھا کہ اس نے پانچ شادیاں کی ہیں جن سے اس کے انتیس بچے ہیں۔ خیر

مقدمہ انتیس بچوں پر نہیں پانچ بیویوں پر تھا۔ کیونکہ ریاست کے قانون کے مطابق ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا جرم ہے جس پر قید کی سزا ہے۔ میں کینیڈا لوٹا تو مقدمہ چل رہا تھا۔ بعد میں ملزم کو 25 سال کی سزا ہو گئی جسے اپیل کے بعد 5 سال کر دیا گیا۔ ایک روز بس میں جاتے ہوئے اس مقدمے کے حوالے سے ایک دلچسپ آرٹیکل پڑھا۔

مضمون نگار نے یہ نکتہ اٹھایا کہ ٹام گرین اس بنا پر معتوب ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ شادیاں کر رکھی ہیں۔ جبکہ اسی امریکی معاشرے میں مردوں کا ایک بیوی کے ہوتے ہوئے کئی کئی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھنا عام بات ہے۔ اس نے مثال کے طور پر (HUGH HEFNER) کا نام لیا۔ یہ ایک عمر رسیدہ شخص ہے جس نے پچاس کی دہائی میں بدنامِ زمانہ (ہمارے اعتبار سے) اور مقبول عام (ہمارے اور مغرب دونوں کے اعتبار سے) عریاں میگزین پلے بوائے کا اجرا کیا تھا۔ یہ میگزین آج بھی لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں ماہانہ شائع ہوتا ہے۔ مغرب کو پلے بوائے زندگی کا تصور اسی شخص نے دیا تھا۔ اب تو یہ صاحب ریٹائر زندگی گزار رہے ہیں اور میگزین کی نگرانی ان کی بیٹی کر رہی ہے مگر موصوف پلے بوائے زندگی سے ابھی تک ریٹائر نہیں ہوئے۔ کیلیفورنیا میں ان کا عظیم الشان محل پلے بوائے مینشن کے نام سے موجود ہے۔ جہاں یہ ان حسین و نوجوان خواتین کے جھرمٹ میں (ویاگرا کے سہارے سہی) رنگین زندگی گزار رہے ہیں جو عمر میں ان کی نواسیوں کے برابر ہیں۔

اس شخص نے اپنے رسالے کو مقبول بنانے کے لیے پلے بوائے طرزِ زندگی کو مغربی معاشرے میں رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ پلے بوائے زندگی کی صحیح ترجمانی فارسی کا مصرعہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کرتا ہے۔ اس عیش میں سرِ فہرست خوبصورت اور نوجوان خواتین ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے محل میں ہر روز نت نئے انداز میں پارٹیوں کا اہتمام کیا جاتا

ہے۔جن میں امریکی معاشرے کے سرکردہ افراد، میڈیا اور شو بز کی معروف شخصیات اور سیاسی و کاروباری طبقات سے تعلق رکھنے والے اہم لوگ شریک ہوتے ہیں۔ان کی تفریحِ طبع کے لیے شہرت اور پیسے کی متلاشی وہ لڑکیاں بھی وہاں موجود ہوتی ہیں جن کا کل سرمایہ ان کا نسوانی حسن ہوتا ہے۔ پلے بوائے میں عریاں ماڈلنگ کے علاوہ یہ ان مہمانوں کو ''خوش'' کرنے کا کام بھی سرانجام دیتی ہیں۔خود ہیفنر کی اس وقت آٹھ گرل فرینڈز ہیں۔ یہی مضمون نگار کا نقطۂ نظر تھا کہ پانچ بیویاں رکھنا جرم ہے مگر آٹھ گرل فرینڈز رکھنا جرم نہیں؟

سی این ٹاور- دنیا کی چھت

میرا ارادہ تھا کہ وقفے وقفے سے یہاں کی قابلِ دید جگہوں کو دیکھوں۔اس سلسلے میں میرا پہلا انتخاب سی این ٹاور تھا۔ ہر شہر کی ایک پہچان ہوتی ہے مثلاً پیرس کی پہچان ایفل ٹاور ہے یا جیسے کراچی کی پہچان مزارِ قائد۔ٹورنٹو کی پہچان سی این ٹاور (CN Tower) ہے۔ٹورنٹو کی جب کوئی تصویر آپ کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے گی تو اس میں یہ ٹاور ضرور نمایاں ہوگا۔ اس میں جانے سے قبل مجھے علم نہیں تھا کہ یہ اس وقت تک دنیا کی سب سے بلند تعمیر تھی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ عام طور پر بلند عمارتوں کی جب بات آتی ہے تو صرف انہی عمارتوں کا تذکرہ ہوتا ہے جنہیں رہائشی یا کاروباری عمارت کی حیثیت حاصل ہو۔جبکہ یہ کوئی عمارت نہیں بلکہ ایک ٹاور ہے۔مگر اپنی بلندی کے اعتبار سے یہ اس وقت تک دنیا کی سب سے اونچی تعمیر تھی۔کینیڈا ویسے بھی دنیا کی چھت کہلاتا ہے کیونکہ یہ قطب شمالی سے بالکل متصل ہے۔آپ کو اس بات کا اندازہ اس وقت ہوگا جب آپ کسی گول کرہ کی شکل میں زمین کا نقشہ دیکھیں گے۔اس کی تعمیر 14 ماہ میں پوری ہوئی اور اس کا افتتاح 26 جون 1976ء کو ہوا۔اس سال اس ٹاور کی سلور جوبلی ہے۔

میں نے یہاں جانے کا فیصلہ ایسے وقت میں کیا جب میں دن اور رات دونوں میں شہر کا

نظارہ کرسکوں۔ان دنوں سورج سوا نو بجے غروب ہوتا ہے اس لیے میں سات بجے تک وہاں پہنچ گیا۔گرمیوں کی چھٹیاں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں اس لیے سیاحوں کا زیادہ ہجوم نہیں تھا۔اس کے علاوہ یہ چھٹی کا دن نہ تھا اس لیے بھی رش کم تھا۔اس ٹاور کی اونچائی 553 میٹر ہے۔اس کی پہلی مشاہدہ گاہ 351 میٹر کی بلندی پر ہے جسے لک آؤٹ (Look Out) کہتے ہیں۔ یہاں تک جانے کا ٹکٹ سترہ ڈالر کا تھا۔جبکہ دوسری 447 میٹر بلند ہے اور اسکائی پوڈ (Sky Pod) کہلاتی ہے۔ اس تک جانے کے لیے اضافی طور پر سات ڈالر دے کر چوبیس ڈالر کا ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔میں نے یہی ٹکٹ لیا۔بیسمنٹ میں ایک چھوٹا مگر خوبصورت سا شاپنگ سنٹر بنا ہوا ہے۔جبکہ لفٹ میں بیٹھنے سے قبل ایک راہداری میں سی این ٹاور سے متعلق کافی معلومات دی گئی تھیں۔میں نے ان تمام چیزوں کو واپسی پر تفصیلاً دیکھا۔

ٹکٹ چیک کروا کر لفٹ میں بیٹھا تو لفٹ آپریٹر خاتون نے بتایا کہ لفٹ کی رفتار پندرہ میل یا بائیس کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اور یہ ایک لمحے میں ستائیس فٹ کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔اس کا اندازہ تو ویسے ہی ہو رہا تھا کیونکہ لفٹ چلی تو کان میں اسی طرح کا دباؤ پڑا جیسے جہاز کے اڑتے وقت محسوس ہوتا ہے۔لفٹ شیشے کی تھی جس سے اوپر جاتے ہوئے پورے شہر کا نظارہ ممکن تھا۔لفٹ نے صرف 58 سکنڈ میں مسافروں کو اوپر پہنچا دیا۔

لک آؤٹ (Look Out)

لفٹ سے اتر کر میں نے گھوم پھر کر تمام جگہوں کا جائزہ لیا۔ایسا کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس جگہ کا ایک نقشہ نگاہوں میں آ جاتا ہے جس کے بعد انسان ہر چیز کو اپنے وقت اور دلچسپی کے حساب سے دیکھ سکتا ہے۔ میں جس حصے پر اترا اس کا نام لک آؤٹ (Look Out) ہے۔ اس کے دو فلور ہیں۔ پہلے فلور پر ایک ریسٹورنٹ ہے جس کا نام ہورائزن کیفے (Horizon

(Café ہے۔ یہ ریسٹورنٹ گھومنے والا(Revolving) ہے۔ اس میں ایک شراب خانہ اور ایک ڈانسنگ فلور بھی ہے۔ لک آؤٹ دائرے کی شکل میں بنا ہے اور اس کے تمام اطراف شیشے لگے ہوئے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بورڈ لگے ہیں جن پر شہر کے اہم مقامات کی تفصیل درج ہے۔ اس وقت شام کا جھٹپٹا ہو رہا تھا۔ گو کہ کہر نہیں تھی مگر ہلکی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس بنا پر دور تک کا منظر واضح نہیں تھا۔ وگرنہ یہاں سے نیا گرا فالز کا اڑتا ہوا پانی بھی نظر آتا ہے۔ بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ شہر کا نظارہ ہو رہا تھا وگرنہ جس روز میں آیا تھا اس روز میں نے سی این ٹاور کو اس طرح دیکھا تھا کہ اس کا پورا اوپری حصہ دھند میں اوجھل تھا۔ بعد میں بھی کئی دفعہ شہر آتے جاتے سر کٹے سی این ٹاور کا نظارہ کیا۔

اس کے نیچے ایک اور فلور ہے۔ یہی اصل مشاہدہ گاہ ہے۔ میں سیڑھیوں سے اتر کر نیچے گیا۔ اس کے وسط میں لفٹ کی جگہ ہے اور ساتھ میں واش رومز ہیں۔ یہ بھی مکمل طور پر شیشے سے ڈھکا ہوا ہے۔ لیکن شیشے کی اس دیوار سے دو دروازے نکلتے ہیں۔ جن سے باہر نکل کر ایک گول راہداری آتی ہے جو مضبوط جالیوں سے مکمل طور پر بند ہے۔ ان جالیوں سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ باہر کا نظارہ بڑا اچھا لگتا ہے۔ لیکن عین سردیوں میں یہاں آنے کی ہمت کوئی نہیں کرتا ہوگا۔ اُسوقت صرف شیشوں کے پیچھے ہی سے نظارہ ممکن ہوتا ہوگا۔

گلاس فلور (Glass Floor)

میں راہداری سے گھوم کر واپس اندر گیا تو سامنے ایک بڑی ہی دلچسپ چیز نظر آئی۔ لفٹ کے داہنی طرف فرش کے ایک حصے کو شیشے سے بنایا گیا تھا جس سے کئی سو میٹر نیچے کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس شیشے پر کھڑے ہو کر وڈیو یا فوٹو بنوا رہے تھے۔ دور سے اس کا کوئی خاص تاثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مگر جب میں خود شیشے پر جا کر کھڑا ہوا تو نیچے دیکھ کر

پورے جسم میں خوف کی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ میں فضا میں کھڑا ہوں اور زمین تک کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

جب میں ٹورنٹو آیا تھا تو ارشد نے مجھے اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ کسی مہمان کو اگر یہاں اس طرح لائیں کہ اس کا دھیان سامنے کے مناظر کی طرف رکھا جائے اور گفتگو میں اسے محسوس نہ ہو کہ وہ شیشے پر آ کر کھڑا ہو گیا ہے، پھر ایک دم اس سے کہا جائے کے نیچے دیکھو تو عین ممکن ہے کہ اس کا ہارٹ فیل ہو جائے۔ یہاں ویسے بھی کمزور دل والے خواتین و حضرات کو سوچ سمجھ کر آنا چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ شیشے پر جا کر کھڑے ہونے والے لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اس پر چڑھ رہے ہیں۔ اگر یہ فرش خالی پڑا ہوتا تو کوئی بھی دوانچ موٹے اس شیشے پر آنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ابھی بھی کئی لوگ کنارے پر کھڑے ہی نظارہ کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک لڑکا شرارت میں اس شیشے پر زور سے اچھلا تو خواتین چیختی ہوئی بھاگیں۔

اسکائی پوڈ (Sky Pod)

یہ اس مشاہدہ گاہ کا نام ہے جو مزید سو میٹر بلند ہے۔ یہاں جانے کے لیے ریسٹورنٹ والے فلور سے ایک اور لفٹ چلتی ہے۔ میں اوپر آ کر اس لفٹ کے ذریعے یہاں تک پہنچا۔ یہ دنیا کی بلند ترین مشاہدہ گاہ ہے۔ یہ بھی ایک گول دائرے کی شکل میں ہے مگر کافی تنگ ہے۔ یہاں ایک وقت میں صرف ساٹھ آدمی آسکتے ہیں۔ اگر آپ سی این ٹاور کی تصویر دیکھیں تو آپ کو اس میں اوپر کی طرف ٹیوب کی شکل کے دو دائرے نظر آئیں گے۔ پہلا بڑا دائرہ تو آؤٹ لک ہے اور دوسرا چھوٹا اور زیادہ بلندی پر واقع یہی اسکائی پوڈ ہے۔ یہاں سے بہت دور تک نظارہ کرنا ممکن ہے۔ مگر شام کی مدھم روشنی اور دھند کی بنا پر حدِ نگاہ کافی کم ہو گئی تھی و گرنہ یہ بہت خوبصورت نظارہ فراہم کرتا۔ یہ بھی تمام اطراف سے شیشوں سے بند ہے۔

میں اوپر پہنچا تو دو انڈین نوجوان ایک کورین لڑکی سے زبردستی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ان کا مکالمہ کافی دیر تک جاری رہا۔ جب وہ لڑکے اس لڑکی کے گھر کا پتا معلوم کرنے پر مصر ہوگئے تو تنگ آکر وہ بولی، ''آپ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟''۔ ویسے میں نے یہاں اپنے قیام کے دوران جنوب ایشیائی اور عرب لوگوں کو خواتین کے معاملے میں بڑا ہی ندیدہ دیکھا۔جبکہ دیگر لوگ ہماری طرح نہ تو خواتین کو گھور کر دیکھتے ہیں اور نہ اجنبیوں سے بلا وجہ زیادہ بات چیت کرتے ہیں۔بعد میں میری اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا کہ بھوکوں کے منہ میں ہی پانی آتا ہے۔ جہاں ہر وقت لنگرِ عام چل رہا ہو وہاں بدہضمی تو ہوسکتی ہے ندیدہ پن نہیں۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ تربیت اور اقدار کا معاملہ ہے۔مغرب میں عفت وحیا کا جو معاملہ بھی سہی،خواتین کو گھور کر دیکھنا یا زبردستی تعلقات پیدا کرنا برا سمجھا جاتا ہے اور ابتدا سے یہی تربیت کی جاتی ہے۔جبکہ ہمارے ہاں خواتین کو گھور کر دیکھنا مردانہ شان کا تقاضہ سمجھا جاتا ہے۔ہم اپنے بچوں کو کم ہی یہ بتاتے ہیں کہ خواتین کو دیکھ کر آنکھیں نیچی رکھنا ان کی مذہبی ذمہ داری ہے۔

شہر کا منظر

اس جگہ بھی اور نیچے بھی دوربینیں لگی ہوئی ہیں جن میں سکے ڈال کر دور تک نظارہ کیا جاسکتا ہے مگر اس وقت دھند کی بنا پر یہ ممکن نہ تھا۔البتہ شہر کا منظر بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ٹورنٹو کا شہر انٹاریو جھیل کے شمال میں واقع ہے۔ یہ جھیل دوسری چار مزید جھیلوں سے مل کر دنیا میں میٹھے پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ بناتی ہے۔اپنی وسعت میں یہ ایک سمندر سے کم نہیں۔ یہ نہ صرف شہر کو پانی فراہم کرتی ہے بلکہ ملک کے دیگر علاقوں اور امریکا سے بحری رابطے کا ذریعہ بھی ہے۔اس کے ذریعے سالانہ 150 بلین ڈالر کی تجارت ہوتی ہے۔سی این ٹاور جھیل سے متصل مرکزِ شہر کے

علاقے میں جھیل کے کنارے واقع ہے۔

اس ٹاور سے ایک طرف تا حدِ نظر پھیلا جھیل کا پانی، اس میں بکھرے چھوٹے چھوٹے سرسبز جزیرے، اس پر چلتی کشتیاں اور فضا میں اڑتے جہاز سب مل کر اس منظر کو بہت خوبصورت بنا رہے تھے۔ دوسری طرف دور تک پھیلا ٹورنٹو کا وسیع وعریض شہر اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ شیشوں کے پاس ساتھ لگی رہنما گائڈ میں شہر کے تمام اہم مقامات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ جن میں فیشن ڈسٹرکٹ، انٹرٹینمنٹ ڈسٹرکٹ، فائننشل ڈسٹرکٹ اور دیگر کئی علاقے شامل تھے۔ ان میں نمایاں طور پر صرف فائننشل ڈسٹرکٹ کا علاقہ ہی نظر آ رہا تھا۔ جس کا سبب اس کی بلند وبالا عمارات تھیں۔ جب رات ہوگئی تو پورا شہر جگمگا اٹھا۔ عمارتوں کی روشنیاں، شاہراہوں کی اسٹریٹ لائٹس اور ان پر دوڑتی گاڑیوں کی متحرک روشنیاں سب مل کر بہت خوبصورت منظر پیش کرنے لگیں۔

پارٹی ٹائم اور اقبال

میں واپس نیچے آیا تو لفٹ نے گلاس فلور کے پاس اتارا۔ میں ریسٹورنٹ والے فلور پر چلا گیا۔ اس وقت وہاں کا ماحول بڑا بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ یہاں کوئی پارٹی شروع ہوچکی تھی۔ ریسٹورنٹ کے ایک حصے پر ایک بورڈ لگا دیا گیا تھا کہ یہ حصہ پرائیوٹ فنکشن کے لیے مخصوص ہے۔ پہلے جو دھیما میوزک بج رہا تھا وہ اب زوردار ساز میں تبدیل ہو چکا تھا۔ رنگ، خوشبو اور حسن کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں خوبصورت لباس زیب تن کیے، ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے لفٹ سے نکل نکل کر پارٹی میں شریک ہونے کے لیے باہر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ڈسکو میں جا کر ڈانس کر رہے تھے اور کچھ چاروں طرف پھیل کر خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

نوجوان زیادہ تر سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھے جوان کے سفید رنگ پر بڑا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ باقی خواتین کے معاملے میں بس یہ ہی عرض کرسکتا ہوں کہ اِدھر مغرب میں مرد جتنے ستر پوش کپڑے پہننے کا اہتمام کرتے ہیں خواتین کا لباس اتنی ہی متضاد کیفیات کا حامل ہوتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے دن خواتین نے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا تھا۔ سینڈل سے لیکر ہیئر اسٹائل تک سب پر پوری محنت کی گئی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ ہمارے شاعرِ مشرق جب یورپ گئے تو غالباً میری ہی طرح ایسی کسی پارٹی میں بن بلائے چلے گئے ہوں گے اور واپسی پر اپنے یہ اشعار لکھے ہوں گے۔

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب

بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بررکاب

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا

مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

اس سے پہلے کہ میرا سفینہ ڈوبتا یا کوئی حجاب حائل ہوتا میں نے مغرب کی نماز کا ارادہ کیا۔ ویسے اقبال کی اسی غزل کا ایک شعر بھی ہے۔

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی

اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

میں مذکورہ بالا سجدہ تو نہیں کرسکتا تھا۔ البتہ یہ میری خواہش تھی کہ آسمان وزمین کے بیچ میں کھڑے ہوکر خدا کے آگے ضرور گر پڑوں۔ واش روم جا کر وضو کیا۔ بڑی مشکل سے ایک گوشۂ عافیت تلاش کر کے نماز پڑھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کا مفہوم ہے۔ ''یا اللہ ہر بلندی پر تو ہی بلند ہے اور ہر حال میں تو ہی قابلِ تعریف ہے''۔ میری یہ نماز اسی حقیقت کا اعتراف تھی۔

اقبال بھی لندن میں نماز کے ذریعے مغربی تہذیب کے اس دھوکے سے بچے تھے اور لندن میں یہ غزل کہی تھی۔

گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر
تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

مغربی تہذیب کی طاقت

اس روز مجھے مغربی تہذیب کی طاقت کے اس پہلو کو بغور دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک عالم اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھ کر مغربی تہذیب کے خلاف کوئی تنقید لکھ دے یا کوئی واعظ منبر پر کھڑے ہو کر مغرب کو برا بھلا کہہ دے۔ ان کی دو چیزیں ایسی ہیں جن کی بنا پر ایک عام انسان اس میں غیر معمولی کشش پاتا ہے اور کشاں کشاں اس کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔ ایک ان کا رفاہی نظام جس میں معاشرے کے محروم طبقات کو اسباب زندگی پہنچانے کا پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ مفت علاج اور تعلیم، بیروزگاروں اور بچوں کے لیے ماہانہ وظیفہ، معذور اور محروم طبقات کے لیے خصوصی سہولیات، خواتین اور کمزور طبقات کے حقوق کا خصوصی تحفظ اس رفاہی نظام کی چند خصوصیات ہیں۔

دوسرا پہلو وہی ہے جو اس وقت میرے سامنے تھا۔ یعنی مادی زندگی کی فتوحات اور عیش و عشرت کی فراوانی۔ زمین سے نصف کلومیٹر بلند جس ٹاور پر میں کھڑا تھا اسے جدید فنِ تعمیر کا شاہکار کہا جاتا اور سات جدید تعمیراتی عجائبات میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک طرف شہر کی روشنیاں نگاہوں کو خیرہ کرتیں تو دوسری طرف ساحل کی ٹھنڈی ہوا وجود کو سرشار کرتی۔ پھر شراب

وشباب، سازوآواز، رقص وموسیقی، رنگ وخوشبو، حسن ودلکشی اور مستی وجوانی کا کچھ ایسا میلہ لگا تھا کہ کون کافر اس صنم کو سجدہ نہیں کرتا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کو فکری طور پر شکست دینا اتنا آسان نہیں جتنا ہم نے سمجھ رکھا ہے۔ یہ انسان کے سطحی جذبات کو اتنے اعلیٰ درجہ پر مخاطب کرتی ہے کہ وہ اس کے اثر سے خود کو نہیں بچا سکتا۔ جب تک انفارمیشن ایج شروع نہیں ہوئی تھی ہم اس کے شر سے بچے ہوئے تھے۔لیکن اب ذرائع ابلاغ کی تلوار لے کر اس نے ہم پر فیصلہ کن حملہ کردیا ہے۔ ہمارے اسلحہ خانے میں ایک ہتھیار بھی ایسا نہیں جو اس کے مقابلے میں ہم پیش کرسکیں۔ بجز عقیدۂ آخرت کے۔ بدقسمتی سے فی الوقت یہ عقیدہ صرف قرآن میں پایا جاتا ہے۔ جب تک یہ عقیدہ قرآن سے نکل کر ہماری فکر، عمل، سوچ، رویے اور معاملات میں نہیں آتا مغربی تہذیب دنیا کی غالب تہذیب رہے گی۔

لفٹ اور دھماکہ

تین چار گھنٹے یہاں گزارنے کے بعد میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ واپسی میں لفٹ میں بیٹھا تو شہر کا منظر نیچے اترتی لفٹ سے دیکھا۔ ہم تیزی سے پھسلتے ہوئے نیچے چلے آرہے تھے۔ زمین لمحہ بہ لمحہ قریب ہورہی تھی۔ لفٹ ہلکی ہوئی مگر اتنی نہیں کہ زمین تک پہنچتے پہنچتے رک جائے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے محسوس ہوا کہ لفٹ دھماکے سے زمین سے ٹکرائے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ دراصل لفٹ زیرِ زمین چلی گئی تھی۔ لفٹ نے مسافروں کو نیچے واقع شاپنگ سنٹر میں اتارا تھا تاکہ دکانداروں کا بھی کچھ بھلا ہوجائے۔ خیر موجودہ مالی حالات میں

مجھ سے تو انہیں یہ بھلا کسی صورت نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر راہداری میں آ گیا۔ یہاں مانیٹرز پر اس ٹاور اور دنیا کی دیگر بلند عمارات کے متعلق کافی تفصیلات دی گئی تھیں۔ مسجدوں کے میناروں کا بھی خاص طور پر تذکرہ تھا۔ بعض معلومات بڑی دلچسپ تھیں۔ مثلاً یہ ٹاور 419 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے آنے والے طوفان کو بھی سہہ سکتا ہے۔ یہ 18 انچ تک اپنے مرکز سے اِدھر اُدھر جھول سکتا ہے۔ دیگر اہم معلومات میں پیچھے درج کر چکا ہوں۔

لمبے بالوں والیاں

یہاں تقریباً تمام خواتین بہت چھوٹے بال رکھتی ہیں۔ مردوں کی داڑھیاں نہیں ہوتیں۔ دونوں کے کپڑے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یعنی پینٹ کے ساتھ شرٹ یا بنیان۔ ان حالات میں اپنی نگاہوں کو اچھا خاصا گنہگار کیے بغیر یہ پتا چلانا مشکل ہوتا ہے کہ برابر میں مرد کھڑا ہے یا عورت۔ خدا خدا کر کے جب گرمیاں آئیں اور خواتین کے کپڑے ان کے بالوں کے سائز کے ہو گئے تب کہیں جا کر اس تحقیقاتی مشن سے نجات ملی۔ لیکن میں سوچ رہا تھا کہ سخت سردیوں میں جب لوگ ''بنڈل اپ'' ہو کر یعنی کپڑوں سے لد کر گھروں سے نکلتے ہوں گے تو انسانی مساوات کا وہ اعلیٰ نمونہ قائم ہوتا ہوگا کہ مرد و زن کی آخری ظاہری تمیز بھی مٹ جاتی ہوگی۔ اس کے بعد کسی بھی اجنبی سے گفتگو کا آغاز کرتے وقت بڑے شش و پنج سے گزرنا پڑتا ہوگا کہ سر کہہ کر گفتگو کا آغاز کریں یا میڈم۔ میرے لیے یہ چیز اس لیے بھی مسئلہ تھی کہ میں یہاں کی تہذیب اور لوگوں کو سمجھنے کے لیے پاس بیٹھنے والوں سے گفتگو کرتا رہتا تھا۔

خواتین کے چھوٹے بالوں سے یاد آیا کہ اپنے مشرق میں لمبے بال ہمیشہ حسن کی علامت قرار دیے گئے ہیں۔ یہاں کینیڈا میں پہلی دفعہ بس میں ایک لمبے بالوں والی خاتون کو دیکھا تو بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ کوئی خاتون لمبے بالوں کے ساتھ ابھی تک نظر نہیں آئی تھیں۔ خیال آیا

کہ کم ہی سہی لیکن یہاں کی خواتین بھی لمبے بال رکھتی ہیں اور مغرب میں کچھ لوگ تو ہیں جو اس مشرقی اندازِ حسن کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جب ان خاتون کا اسٹاپ آیا اور وہ اپنی نشست سے اٹھیں اور میری طرف رخ کیا تو پتا چلا کہ میری ممدوح کوئی خاتون نہیں ایک حضرت تھے۔ بعد میں تواتر کے ساتھ جب ایسے ہی واقعات پیش آئے تو میں نے ایک کلیہ اخذ کرلیا کہ لمبے بالوں کے ساتھ جب کوئی نظر آئے گا تو وہ کوئی موصوفہ نہیں سو فیصد موصوف ہوں گے۔

سردی جو جا کر نہیں دیتی

جون کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ دنیا بھر میں موسم معتدل بلکہ اکثر جگہ گرم ہو چکا ہے۔ جبکہ یہاں کافی تیز ٹھنڈ ہے۔ پچھلے دنوں ٹھنڈ میں ذرا فرق پڑا تھا جس کی بنا پر ہیٹر بند کردیے گئے تھے۔ مگر دو دن بعد سردی کی وہ لہر آئی کہ دوبارہ ہیٹر کھولنے پڑ گئے۔ یہاں فلیٹس میں ہیٹنگ کا نظام مرکزی ہوتا ہے جس کا کنکشن گھر کے ہر کمرے میں آرہا ہوتا ہے۔ نئے فلیٹوں میں یہ سہولت ہے کہ لوگ ٹمپریچر اپنی مرضی سے سیٹ کرسکتے ہیں کیونکہ ان کے ہر کمرے میں اسے سیٹ کرنے والا تھرمواسٹیٹ سسٹم دیا ہوتا ہے۔ تاہم کامران کے گھر میں یہ سہولت نہ تھی۔ ایک خاص درجے کی حرارت قائم کردی جاتی اس کے بعد سردی لگے یا گرمی یہ انتظامیہ کا مسئلہ نہ تھا۔ جن لوگوں کے جسم یہاں کی شدید سردی کو برداشت کرنے کے عادی تھے ان کے لیے تو مسئلہ نہ تھا مگر میرے جیسے نئے آنے والے کے لیے اس صورتحال سے نمٹنا اتنا آسان نہ تھا۔

جن دو دنوں میں ہیٹر بند ہوئے میرے لیے راتوں کو سونا مشکل ہو گیا۔ میں زمین پر سوتا تھا۔ سوتے وقت تو اتنی سردی نہیں ہوتی تھی مگر رات بھر میں درجۂ حرارت کافی نیچے آجاتا جس کے بعد سردی، کمبل اور گدے دونوں سے سرائیت کرکے مجھے آدبوچتی۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا۔ تیسرے دن جب ہیٹر کھلا تو میں آرام سے سویا۔ ویسے ہیٹر میں بھی ایک

بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہیٹر مسلسل چلتے چلتے کمرے سے نمی ختم کر دیتا ہے۔ جس کے بعد سانس لینے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔ نگہت باجی کی چھوٹی بیٹی عائشہ جس کی یہ پہلی سردیاں تھیں وہ اس بنا پر شدید بیمار پڑ گئی۔ کیونکہ ہیٹر مسلسل چلنے سے کمرے کی نمی ختم ہوگئی۔ وہ چھوٹی سی بچی کیا بتاتی کہ اسے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ آخر کار اس بیچاری کی سانس کی نالی میں انفیکشن ہوگیا۔ عام طور پر اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے کھڑکی کو تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ تازہ ہوا آتی رہے۔ یہاں پر میں یہی کرتا تھا کہ کمرے کی کھڑکی ذرا سی کھلی چھوڑ دیتا۔ اس کے نتیجے میں جو ٹھنڈ اندر آتی اسے بہر حال برداشت کرنا پڑتا۔

قیامت کیسے آئے گی؟

قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ قیامت کے ہولناک واقعات کی ایسی دل ہلا دینے والی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ انسان پڑھے تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ لیکن اول تو ہمارے ہاں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا رواج ہی نہیں اور جو تھوڑے بہت لوگ اسے سمجھ کر پڑھتے ہیں انہیں قیامت کوئی اہم چیز نہیں لگتی۔ وہ اسے بہت دور کی چیز سمجھتے ہیں۔ تاہم قرآن و حدیث میں قیامت کی جو نشانیاں بیان کی گئی ہیں ان میں سے کئی پوری ہو چکی ہیں۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ جو باقی ہیں ان کے پورا ہونے میں بھی اب بہت دیر نہیں لگے گی۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے کہ قیامت کس طرح آئے گی۔ قرآن میں اس کے وقوع کا جو نقشہ بیان کیا گیا ہے اس کے مطابق اچانک آنے والی یہ عالمی آفت زمین اور اہلِ زمین کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی۔ سمندر ابل پڑیں گے۔ پہاڑوں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ سورج، چاند، ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس آفت کا نقطۂ آغاز کسی سیارچے کا زمین سے ٹکرانا ہوگا۔ مجھے اس کا کچھ اشارہ سورۂ الذاریات کی آیت ۲۲ میں نظر آتا ہے: ''اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے

وعدہ کیا جارہا ہے (یعنی قیامت) آسمان میں ہے‘‘۔

میں نے یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ ایک روز ٹی وی پر ایک پروگرام دیکھا۔ جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ایسے کسی واقعے کا ہونا بعید نہیں بلکہ کم وبیش یقینی ہے۔ خلا میں بے گنتی اجرام فلکی گھومتے پھر رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے زمین کا رخ بھی کرتے رہتے ہیں مگر یہ اکثر بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہی یہ ان حفاظتی ڈھالوں سے رگڑ کھا کر، زمین تک پہنچنے سے قبل، ختم ہوجاتے ہیں جو کرۂ ارض کے اردگرد موجود ہیں۔ مگر بہت سی خلائی چٹانیں کافی بڑی بھی ہوتی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی زمین کا رخ کرلیا تو زمین کی فضا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ پروگرام میں بتایا گیا کہ اگر ایک کلومیٹر بڑی چٹان زمین سے آ کر ٹکراتی ہے، جو کہ بہت چھوٹا سائز ہے تو پچاس کروڑ ایٹم بموں کی طاقت کے برابر دھماکہ ہوگا۔ زمین سے مٹی کی ایک لہر اٹھے گی جو آسمان کو ڈھانپ لے گی۔ چاند سورج اور ستاروں سب کی روشنی اس میں ماند پڑ جائیگی۔ سمندروں سے ایسی لہریں اٹھیں گی کہ تمام ساحلی شہر اس میں بہہ جائیں گے۔ زمین پر سے حیات مکمل طور پر ختم ہوجائے گی۔ پروگرام کے مطابق آج سے ساڑھے چھ کروڑ سال قبل ڈائنا سور ایسے ہی کسی واقعے کے نتیجے میں ختم ہوئے تھے۔

اس میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ایسی کسی صورتحال سے بچنے کے لیے سائنسدان چوبیس گھنٹے خلا کی نگرانی کررہے ہیں۔ کیونکہ اگلے تیس سالوں میں ایک کلومیٹر طویل ایک چٹان زمین کا رخ کرسکتی ہے۔ ایسا ہوا تو وہ میزائل کے ذریعے ایٹم بم مار کر اسے تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر یہ بھی کوئی یقینی حل نہیں۔ میرے خیال میں اگر خدا نے اسی ذریعے کا انتخاب کیا تو زمین والوں کے سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ بلکہ جب میں سورۃ القمر پڑھتا ہوں جس کی پہلی آیت کہتی ہے ’’قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا‘‘ تو خیال آتا ہے کہ عجب

نہیں کہ خدا ایک دفعہ پھر چاند کے دوٹکڑے کردے۔ یا اس کا کوئی حصہ کسی وجہ سے بھی ٹوٹ کر اس سے جدا ہو جائے اور اپنے زور میں اس کی کشش سے آزاد ہو کر زمین کا رخ کر لے۔ چاند زمین سے اتنا قریب ہے کہ زمین والوں کو سنبھلنے کی مہلت بھی نہ ملے گی۔ واللہ اعلم۔ بہرحال بات یہ ہے کہ سورۃ المعارج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ اسے (قیامت کو) دور دیکھ رہے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں''۔اب جبکہ غیر مسلموں نے بھی اس قیامت کو دیکھنا شروع کر دیا ہے تو ہم مسلمان جو قطعیت سے جانتے ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا کیوں نہ ان سے پہلے اسے دیکھ لیں اور اس کی تیاری کر لیں۔

آخرت کے مراحل

آخرت کے دو بڑے مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہوگا جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جسے ہم اردو میں قیامت لیتے ہیں۔قرآن کی اصطلاح میں یہ قیامت کا دن نہیں۔قرآن اس مرحلے کے لیے مختلف نام استعمال کرتا ہے جو اس دن کی نوعیت کے اعتبار سے رکھے گئے ہیں۔مثلاً ''الساعۃ'' یعنی وعدے کی گھڑی، ''القارعۃ'' یعنی کھڑکھڑانے والی، ''الواقعۃ'' یعنی ہو کر رہنے والی وغیرہ۔ خدا نے جس آزمائش کے لیے انسان کو اس دنیا میں بھیجا تھا جب اس کے خاتمے کا وقت آئے گا تو انسانیت اور اس کے مسکن کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔مگر یہ کام اتنی سادگی سے نہیں ہوگا۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ واقعہ ہو کر رہے گا اور جب ہوگا تو بدترین تباہی کے ساتھ ہوگا۔یہی وہ مرحلہ ہے جس میں دنیا کی مکمل بربادی کا ہولناک نقشہ قرآن میں جگہ جگہ کھینچا گیا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں ''القیامۃ'' دوسرے مرحلے کا نام ہے۔یعنی وہ دن جب مردے زندہ کیے جائیں گے۔ اس مرحلے کے آغاز میں ایک دفعہ پھر صور پھونکا جائے گا اور پوری

انسانیت کو زندہ کر کے اللہ جل جلالہ اپنے حضور جمع کرے گا اور ان کے اچھے برے اعمال کا بدلہ دے گا۔ اسی مناسبت سے اسے یوم الحشر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یوم الحساب، یوم الدین اور دوسرے بھی کئی اور نام ہیں جو پہلے مرحلہ کی طرح صفاتی ہیں۔ یعنی نام یہ بتا رہے ہیں کہ اس دن کیا ہوگا۔

قرآن بالعموم ان دونوں مرحلوں کو ملا کر بیان کرتا ہے۔ اور غور کرنے پر ہی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ فلاں بات کس مرحلے سے متعلق ہے۔ قرآن سے ایک اور بات معلوم ہوتی ہے کہ قیامت (اردو والی، مراد پہلا مرحلہ ہے) کائناتی سطح پر نہیں آئے گی بلکہ ہماری دنیا تک محدود رہے گی۔ اس دن کی تباہی کے اثرات کے لیے قرآن نے ''السموات'' کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ''السماء'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ وہ دن انسانیت کی موت کا دن ہوگا اور انسانیت صرف اس کرہ ارض پر بستی ہے، پوری کائنات میں نہیں۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں مرحلوں کے درمیانی عرصے میں زمین و آسمانوں کو بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے گا۔ (جس دن زمین و آسمان تبدیل کر دیے جائیں گے اور لوگ اکیلے اور زبردست اللہ کے حضور حاضر ہو جائیں گے، ابراہیم 48:14)۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالباً پہلے مرحلے کے بعد جو وقفہ آئے گا - اور عین ممکن ہے کہ یہ کروڑوں اربوں سالوں پر محیط ہو - اس میں زمین کو جنت کا روپ دے دیا جائے گا۔ سورۃ الانبیاء کی آیت 105 اور سورۃ الزمر کی آیت 74 میں صراحت کی گئی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک بندے ہوں گے۔ جنتیوں کی اضافی سیرگاہیں آسمانوں پر ستاروں میں تیار کی جائیں گی۔ کیونکہ قرآن جنت کی وسعت زمین سے آسمان تک بتاتا ہے (آل عمران 133:3 اور الحدید 21:57)۔ دوسری طرف اسی لامحدود کائنات میں جہنم بنائی جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ نو دریافت شدہ بلیک ہولز ہی وہ جگہ ہوں۔ کیونکہ کہا

یہ جاتا ہے کہ کائنات کا اکثر حصہ انہی پر مشتمل ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسانوں کی اکثریت جہنم میں جائے گی۔

ممکنات کی دنیا

یہ تفصیلات قرآن کے اشارات پر مبنی ہیں اور اس بات کا پورا احتمال ہے کہ میں کسی جگہ غلطی پر ہوں۔ حقیقی علم تو صرف خدا کے پاس ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراؤں کہ جو آخرت ہماری زندگی میں آخری حد تک نا قابلِ تذکرہ ہے وہ اس کائنات میں ہونے والا سب سے بڑا واقعہ ہے اور اب رونما ہونے کے بالکل قریب ہے۔ ویسے تو آخرت پر ہمارا ایمان ہے اور ہم غیب میں رہتے ہوئے اسے مانتے ہیں لیکن میں نے یہ دکھایا ہے کہ اس عالمِ اسباب میں بھی وہ سارے امکانات ہیں جن سے قرآن کی بات درست ثابت ہوتی ہے۔

ہم جنت، جہنم اور قیامت کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ یہ بڑی انہونی سی باتیں لگتی ہیں۔ لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم ایک ایسی دنیا میں زندہ ہیں جہاں ہر چیز کبھی نہ کبھی بڑی عجیب اور انہونی ہوتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کا وجود آج سے صرف سو سال قبل کتنی انہونی بات تھی۔ میں نے یہاں خزاں رسیدہ مردہ درختوں کو موسمِ بہار میں زندہ ہوتے دیکھا۔ یہ بھی بڑی انہونی چیز ہے۔ بات یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات ہم روز دیکھتے ہیں تو ان کا انہونا اور عجیب ہونا محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن جس طرح یہ سب کچھ ہو رہا ہے اسی طرح ایک روز قیامت کی انہونی بھی ہو جائے گی۔ اور جب ہو گی تو کوئی جھٹلانے والا نہ ہو گا۔ میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ سارے اسباب و حالات تیار ہیں اور اپنے آقا کے فرمان کے منتظر ہیں۔ جس روز اس کریم کی نگاہوں کا رنگ بدلا کوئی نہیں ہو گا جو اس واقعے کو روک سکے، ٹال سکے، جھٹلا سکے۔

موت آ گئی قیامت آ گئی

ہم میں سے بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قیامت جس کا اوپر تذکرہ ہوا ان پر نہیں آئے گی۔ چلیں مان لیا نہیں آئے گی مگر موت تو آئے گی نا۔ ایک روایت جو ہے تو غریب مگر مفہوم اس کا ٹھیک ہے، اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ "من مات فقد قامت قیامۃ" یعنی جس کی موت آ گئی اس کے لیے قیامت آ گئی۔ بعض اوقات یہ موت اس طرح آتی ہے کہ دوسروں کے لیے بھی قیامت کی نشانی بن جاتی ہے۔ اتفاق سے جب میں یہ تحریر لکھ رہا ہوں اسرائیل میں ایک واقعہ پیش آیا جو کسی درجے میں قیامت سے مشابہ ہے۔ وہاں ایک شادی کی تقریب میں لوگ جمع تھے۔ عمارت کی تیسری منزل پر یہ اجتماع ہو رہا تھا۔ لوگ خوشی میں ناچ رہے تھے، میوزک بج رہا تھا، جامِ شراب گردش میں تھے کہ اچانک تیسری منزل کا فرش پھٹا اور لوگ ایک دم سے نیچے چلے گئے۔ اس تقریب کی وڈیو بھی بن رہی تھی اس لیے دنیا بھر کے ناظرین نے ٹی وی پر یہ منظر دیکھا کہ کس طرح لوگ مگن تھے اور اچانک زمین پھٹی اور پورے مجمعے کو نگل گئی۔ پیچھے صرف ڈھول اور چیخیں رہ گئیں۔ اس واقعے میں موت جس طرح تحیر اور یکبارگی کے ساتھ آئی ہے وہ کسی درجے میں قیامت کی یاددہانی ہے۔

بدلتے موسم کی حسین رت

کینیڈا کے موسم کی یہ خصوصیت ہے کہ گرمیوں کے چند دنوں کو چھوڑ کر پورے سال موسم کوئی بھی آئے، سردی کے جامے میں ہی آتا ہے۔ یہاں بہار کے موسم میں بارشیں بھی ہوتی ہیں مگر اس دفعہ کچھ دیر ہوگئی۔ تاہم مئی کے آخر میں ہلکی بارشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو جون کے وسط تک بہت تیز بارشوں میں تبدیل ہوگیا۔ ان بارشوں نے دم توڑتی سردی کو چند سانسیں اور عطا کر دیں۔ جب بادل سورج کو ڈھانپ لیتے تو درجۂ حرارت کافی کم ہو جاتا۔ ٹھنڈی ہوا

جب چلتی تو سردی کا مزید اثر محسوس ہوتا۔ بعض اوقات بہت تیز بلکہ گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش بھی ہوئی۔

ان بارشوں کے نتیجے میں ہر طرف سبزہ پھوٹ پڑا۔ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ لوگ فطرت کے ساتھ بڑا تعاون کرتے ہیں اور ہر جگہ گھاس کا فرش بچھا دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ اب ایک چیز اور اضافی طور پر نظر آئی۔ ہر عمارت کے سامنے رنگ برنگے پھول لگا دیے گئے۔ یہ پھول بھی گھاس کی طرح خاص طور پر منگوا کر لگائے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے ٹرکوں میں یہ پودے رکھ کر لائے جاتے اور تھوڑی دیر میں وہ جگہ گل وگلزار بنادی جاتی۔ یہ پھول اس قدر مختلف اور خوبصورت رنگوں کے ہوتے کہ انہیں دیکھ کر آنکھیں ہٹانے کا دل نہیں چاہتا تھا۔ پہلی دفعہ اقبال کے اس شعر کی حقیقی تعبیر دیکھی:

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار

اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

لیکن ایک بات ان پھولوں کے متعلق مجھے بعد میں پتا چلی۔ ایک صاحب نے میری توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ان پھولوں میں رنگ بہت ہوتے ہیں خوشبو نہیں ہوتی۔ شاید یہ مغرب کی مادی تہذیب کا اثر ہے جس نے فطرت کو بھی آلودہ کر دیا۔ مادیت میں رنگ تو ہوتا ہے مگر روحانیت کی خوشبو نہیں ہوتی۔ چند دنوں میں بارشوں کا یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ جون کے تیسرے ہفتے میں بادل چھٹنے لگے۔ دھوپ پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو گئی۔ میرے اعتبار سے موسم انتہائی خوشگوار ہو گیا۔ میں نے اپنے ایک کولیگ سے اس موسم کو خوشگوار کہا تو اس نے جواب دیا، "It is too hot"۔ گوروں کے لیے یہ گرمی کا جھٹکا تھا۔ ہر جگہ اے سی چلنے لگے۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا کہ بڑی مشکل سے قدرتی سردی سے جان چھوٹی تو مصنوعی سردی

کی زد میں آ گئے۔ حالانکہ موسم ابھی کوئی اتنا گرم نہیں ہوا تھا بلکہ رات کو ٹھنڈ ہو جاتی تھی۔ آپ اندازہ کریں کہ ابھی تک گھروں میں پانی بوائلر (Boiler) سے آ رہا تھا۔ دراصل یہاں پانی براہِ راست جھیل سے آتا تھا اور اتنا ٹھنڈا ہوتا تھا کہ گرم پانی کو ملائے بغیر اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہمارا بوائلر تین دن کے لیے خراب ہو گیا تو ایک مصیبت کھڑی ہو گئی۔ دو منٹ اس پانی میں ہاتھ ڈالنے کا مطلب یہ تھا کہ ہاتھ جم جائے۔ ویسے یہاں پانی مکس کرنے کے معاملے میں میرے ساتھ شروع میں بڑا مسئلہ ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پانی کس قدر ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس لیے میں حسب عادت تھوڑا سا گرم پانی کھول کر زیادہ ٹھنڈا پانی کھولتا تھا اور ہمیشہ پانی ٹھنڈا ہی آتا۔ کچھ دنوں میں اندازہ ہوا کہ اس تناسب کو الٹ دینا چاہیے پھر کہیں جا کر معتدل پانی آنے لگا۔

دوپہر کا حسن

خدا نے ہر چیز میں حسن رکھا ہے۔ مگر یہ حسن اسی وقت اپنا اثر دکھاتا ہے جب اسے نمو کے لیے تناسب کی زمین میسر آئے۔ دوپہر اپنی تپش کی بنا پر بالعموم پسند نہیں کی جاتی۔ لیکن ٹورنٹو میں موسمِ گرما کی آمد آمد ہے۔ ایسے میں دوپہر کے وقت جب سردی اور گرمی دونوں ایک دوسرے کی تعدیل کر دیتی ہیں اور سورج کی تپش اور ہوا کی ٹھنڈ میں سے کوئی بھی دوسرے کو پچھاڑ نہیں پاتی تو دوپہر کا حسن آخری درجے میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

مجھے شاید اس بات کا احساس اس لیے بھی ہوا کہ میں نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے دوپہر کا حسن ہی دریافت کیا تھا۔ یہ میرے بچپن کا ذکر ہے جب کراچی میں درخت اتنے ناپید نہیں ہوئے تھے۔ ٹریفک کا بے ہنگم شور رات کے پرسکون سناٹے کو منتشر کرتا اور نہ دوپہر کے خاموش تقدس کو پامال۔ بڑے بڑے صحن اور کھلے برآمدے نئی نسلوں کی خانہ آبادیوں کے نتیجے

میں بند کمروں میں نہیں بدلے تھے۔ یہ تب کا ذکر ہے جب گھروں میں فضا کی قاتل گاڑیاں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ البتہ حیات بخش درخت اور پودے ہر گھر میں ضرور ہوتے تھے۔ گھروں کی آرائش کے لیے ڈیکوریشن پیس (Decoration Pieces) کے بجائے کیاریاں بنانا اور گملوں میں پھول پودے لگانا معمول تھا۔

ایسے میں سردیوں کے دم توڑنے کے بعد جب گرمیوں کی دھوپ دبے پاؤں گھروں کے اندر داخل ہونے لگتی تو دوپہر کو ایک نئی زندگی ملتی۔ خاموشی کا ایک پردہ سا تن جاتا۔ لوگ گھروں میں محوِ استراحت ہوجاتے۔ گلیاں ویران ہوجاتیں۔ آگ کی گول ٹکیہ آسمان تو روشن کرتی مگر نیم کی ٹھنڈی چھاؤں زمین کو تپنے نہیں دیتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دھوپ کی حدت کو معدوم کردیتے۔ دھوپ کی تیزی میں درختوں کی چھاؤں سن فریم کا کام کرتی۔ سرسراتی ہوا درخت کے پتوں سے گزرتی تو لگتا کہ فطرت کوئی ازلی گیت گنگنا رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وقت بھی چلتے چلتے تھک گیا ہے اور درخت کی چھاؤں میں کچھ دیر سستانے بیٹھ گیا ہے۔ پرندوں کے سریلے نغمے اس کے لیے لوری کا کام کرتے جنہیں سنتے سنتے اسے نیند آجاتی۔ پھر شام کے ڈھلتے سائے جب دوڑتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتے تو ان کی آہٹ سے وہ ہڑبڑا کر اٹھتا اور اپنی راہ لیتا۔ اس دور میں زندگی مصنوعی چیزوں سے خالی تھی۔ ٹی وی کم تھا اور جتنا کچھ تھا وہ بھی دوپہر کو خاموش رہتا۔ گاڑیوں کا شور بڑی شاہراہوں تک محدود تھا۔ گھروں میں فون بھی شاذ ہوا کرتے اور ان کی گھنٹی فضا میں ارتعاش نہیں پیدا کرتی تھی۔ فون نہ ہونے سے لوگ رابطے میں نہیں تھے مگر دلوں کے رابطے اس طرح نہ ٹوٹے تھے جیسے آج ٹوٹ چکے ہیں۔ سہولتیں کم تھیں مگر سکون بہت تھا۔ آٹومیٹک مشینیں نہیں تھیں مگر پھر بھی وقت بہت ہوتا تھا۔ کمانے والا صرف ایک ہوتا مگر تنگی کی شکایت نہ تھی۔

پھر نہ جانے کس کی نظر اس سکون کو کھا گئی۔ گھروں میں مڈل ایسٹ کا پیسہ آنے لگا مگر ماؤں سے ان کے لال چھن گئے۔ خانہ آبادیاں ہوئیں، انسان بڑھنے لگے مگر درخت گھٹ گئے۔ گاڑیاں بڑھنے لگیں مگر دوپہر کی خاموشی مٹ گئی۔ تعلیم عام ہونے لگی مگر تہذیب رخصت ہونے لگی۔ پیسے کی فراخی ہوئی مگر قناعت کی دولت لٹ گئی۔ اور نہ جانے کیا کیا ہو گیا۔ آج کئی سالوں بعد ٹورنٹو کی ایک سنسان سڑک پر، دوپہر کے وقت درختوں کے سائے اور ہوا کے جھونکوں میں، مجھے وہی دوپہر یاد آ گئی تو آپ کو بھی اس یاد میں شریک کر لیا۔

انٹاریو سائنس سنٹر (Ontario Science Center)

میں نے انٹاریو سائنس سنٹر کی بہت تعریف سنی تھی۔ چنانچہ ایک روز وہاں کا ارادہ کیا۔ وہاں پہنچ کر داخلہ ٹکٹ کی تفصیلات معلوم کیں۔ یہ بارہ ڈالر کا تھا۔ ساتھ واقع اومنی میکس تھیٹر میں سائنسی موضوعات پر دستاویزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ اس کا ٹکٹ دس ڈالر تھا اور اگر دونوں کا ٹکٹ ایک ساتھ لیں تو سترہ ڈالر کا پڑتا۔ جبکہ جمعہ ہفتے کی رات دو فلمیں ایک ساتھ دکھائی جاتی تھیں اور ان کا ٹکٹ صرف بارہ ڈالر تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ ایک دفعہ میں فلمیں دیکھ لوں اور دوسری دفعہ سنٹر کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ اتنا بڑا سنٹر دیکھنے کے لیے کافی وقت چاہیے اور ساتھ میں اگر ایک گھنٹے کی فلم بھی دیکھنی ہو تو وقت کافی کم پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ میں ایک دفعہ جمعے یا ہفتے کو آ کر فلم اور دوسری دفعہ سکون سے سنٹر دیکھ لوں گا۔

اومنی میکس تھیٹر

اومنی میکس تھیٹر، انٹاریو سائنس سنٹر کا ایک حصہ ہے۔ یہاں آئی میکس (IMAX) فارمٹ میں فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ یہ دور جدید کی ایک ایسی ایجاد ہے جس میں دیکھنے والا حقیقت سے زیادہ حقیقی چیز دیکھتا ہے۔ اس میں نت نئی اختراعات ہو رہی ہیں جس کی بنا پر دیکھنے

والوں کا لطف بڑھتا چلا جارہا ہے۔ مثلاً ''تھری ڈی'' اثرات سے دیکھنے والا یہ تاثر لیتا ہے کہ اسکرین پر جو کچھ نظر آرہا ہے وہ حقیقی زندگی کی طرح سہ جہتی ہے۔ ایک اختراع یہ بھی ہوتی ہے کہ اسکرین گنبد کی طرح بنایا جاتا ہے۔ یہاں پر ایسا ہی کیا گیا تھا۔

پندرہ ملین ڈالر سے تعمیر شدہ یہ تھیٹر 320 سیٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ سیٹیں عام سینما کی طرح افقی سمت میں اوپر اٹھتی چلی گئی ہیں۔ اسکا اسکرین عام ٹی وی سے 4500 گنا بڑا ہے جو دیکھنے والوں کے دائیں بائیں، اوپر اور سامنے سب جگہ پھیلا ہے۔ اسکرین کا قطر 24 میٹر ہے۔ اس پر نظر آنے والی تصویر آخری حد تک واضح اور شفاف ہوتی ہے۔ ساؤنڈ سسٹم کو اسکرین کے ساتھ متعلق کرنے کے لیے چھ اسپیکر اسکرین کے اندر اس طرح لگائے گئے ہیں کہ یہ فلم چلتے وقت نظر نہیں آتے۔ مگر تاثر سو فیصد یہی بنتا ہے کہ آواز اسکرین سے آرہی ہے۔ نیویارک کے نیچرل ہسٹری میوزیم میں بھی (I'MAX) تھیٹر موجود تھا مگر میں اس کے بجائے اسپیس شو میں گیا تھا۔

سولر میکس (Solar Max)

یہاں سارا دن وقفے وقفے سے مختلف فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس وقت دو فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔ پہلی فلم سولر میکس تھی جو سورج سے متعلق تھی۔ سورج جو ہماری زمین کے لیے روشنی، حرارت اور توانائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، ہر دور میں انسانوں کی توجہ کا خصوصی مرکز رہا ہے۔ زمانۂ قدیم سے اسے بہت بڑا دیوتا مانا گیا ہے۔ جاپان میں تو آج تک بادشاہ کو سورج دیوتا کی اولاد یا اوتار مانا جاتا ہے۔ ماہ وسال کی گردش سے لے کر تہواروں تک میں سورج کا کردار بنیادی رہا ہے۔ فلم میں ان تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ دورِ جدید میں سورج پر کی جانے والی تحقیقات کا بھی احاطہ کیا گیا تھا۔ مثلاً سورج پر اٹھنے والے مقناطیسی طوفان وغیرہ۔ یہ بتایا گیا کہ زمین کے اردگرد ایسا مدافعتی نظام موجود ہے جو ان طوفانوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ

دیگر ستاروں پر ایسے طوفان اٹھتے ہیں کہ اگر وہ سورج پر اٹھیں تو زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوتا۔

فلم میں سورج کے بالکل قریبی اور حقیقی مناظر بھی دکھائے گئے۔ سورج سے اٹھنے والے آگ کے شعلوں کی ہیبت ناکی کو (IMAX) کے انتہائی تاثر انگیز ماحول نے بہت دہشتناک بنا دیا تھا۔ میں چونکہ معروف معنوں میں تفریحاً فلم دیکھنے نہیں آیا تھا اس لیے فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے غور و فکر کے عمل کو بھی جاری رکھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دورِ قدیم میں سورج پرستی کے اثرات کتنے ہمہ گیر تھے۔ ان کی ہی بنا پر سورج چڑھنے کے اوقات میں کوئی نماز نہیں رکھی گئی۔ نیز سورج طلوع و غروب کے وقت ساری نمازیں ممنوع ہیں۔ سورج کا قریبی منظر دیکھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ جہنم کی آگ کتنی شدید ہوگی جس کی دھمکی قرآن میں اللہ تعالیٰ کے نافرمانوں کو جگہ جگہ دی گئی ہے۔ یہ فلم عام ٹی وی پر شاید اتنی مؤثر نہ ہوتی مگر (IMAX) کے ماحول نے اس کی تاثیر کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔

انسان کا سفر (Journey of Man)

دوسری فلم انسان کے بارے میں تھی۔ اس میں انسانیت کا تہذیبی ارتقا ایک تمثیل کی شکل میں دکھایا گیا تھا۔ انسان کو ایک بچے سے ادھیڑ عمر شخص تک پہنچتے ہوئے دکھایا گیا۔ اس پوری فلم کی تھیم وہی تھی جس کو میں امریکا کے سفر میں نیچرل ہسٹری میوزیم کے تذکرے میں زیرِ بحث لا چکا ہوں۔ اس پر مجھے جو کچھ تنقید کرنی تھی میں وہاں کر چکا۔ جن قارئین کے ذہن میں وہ تازہ نہ ہو اسے ایک دفعہ پھر دیکھ لیں۔ بہر حال فلم کا خلاصہ یہ تھا کہ انسان نے نامعلوم سے اپنا سفر شروع کیا۔ پانی سے اس کی زندگی کی تخلیق ہوئی۔ پھر وہ جنگلوں میں آن بسا۔ بچپن میں خوف و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے جنگلوں میں اپنا وقت گزارا۔ اس سے مراد دورِ وحشت یا

دورِ شکار تھا۔ نوعمری کا زمانہ اس نے میدانی اور پہاڑی علاقوں میں گزارا۔ وہ تحیر، تجسس اور دریافت کی وادیوں میں گھومتا رہا۔ اشارہ زراعتی دور کی طرف تھا۔ اور آخر میں اس نے تہذیب و تمدن کا موجودہ محل تعمیر کرلیا۔ یعنی اس نے موجودہ صنعتی دور میں قدم رکھ دیا۔ اس پورے عرصے میں میرے ذہن میں وہ شعر گھومتا رہا جسے پیچھے بھی نقل کر چکا ہوں۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

یہ تو سائنس کا حال ہے۔ اگر فلسفے کی بھول بھلیوں پر مبنی کوئی فلم بنتی تو شعر میں بس اتنا فرق پڑتا۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

رہا سوال کہ ہم ہیں تو یہ بھی کیا معلوم

خوش قسمتی اور اتفاق

میں اس سوچ پر تنقید کر چکا ہوں۔ البتہ ایک اور پہلو پر یہاں توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ خدا کا انکار کر کے یا اس سے اعراض کر کے انسان کی جو بھی کہانی بنائی جائے گی اس میں دو پہلو بڑے نمایاں نظر آئیں گے۔ ایک اتفاق اور دوسرا خوش قسمتی۔ ان دونوں فلموں میں ان الفاظ کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا۔ میں انسان کی اس کہانی کو جو ارتقا کے نام پر پیش کی جاتی ہے ہمیشہ سائنس فکشن کہتا ہوں۔ ایک ایسی فلم جس کا اسکرپٹ مصنف نے گھر بیٹھے ناظرین کے ذہن اور خواہشات کے مطابق لکھ دیا۔ اس فلم کی طرح جس میں ہیرو اتفاقات اور خوش قسمتی کے سہارے اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ مگر ان واقعات کا حقائق کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس دور میں انسانوں کی جو کہانی، انکار خدا کے بعد گھڑی گئی ہے، وہ بھی پورے طور پر ایک

ایسی ہی کہانی ہے۔اس میں زندگی قدم قدم پر بخت واتفاق کی سیڑھیاں چڑھتی اورخوش قسمتی کے موڑ مڑتی نظر آتی ہے۔اس کہانی کا کل پیغام یہ ہے کہ ہم زمین کے باشندے ہیں جن کا سلسلۂ نسب جانوروں سے ہوتا ہوا ایٹموں تک جا پہنچتا ہے۔آج ہم کسی ستارے میں موجود ایٹم نہیں جیتے جاگتے انسان ہیں؛ تہذیب وتمدن تخلیق کرنے والے، احساس وشعور رکھنے والے، فکر وتدبر کرنے والے، ایجاد ودریافت کرنے والے، تو اس کی دو ہی وجوہات ہیں۔ اول اتفاق اور دوسری خوش قسمتی۔

یہ محض ایک اتفاق ہے کہ سورج ہم سے ایک خاص فاصلے پر ہے، یہ محض ایک اتفاق ہے کہ زمین پر پانی پایا جاتا ہے، یہ محض ایک اتفاق ہے کہ فضا میں آکسیجن موجود ہے، یہ محض ایک اتفاق ہے کہ اس دنیا میں دن ورات کا سلسلہ قائم ہے، یہ محض ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانوں میں مرد وزن ایک خاص تناسب سے پیدا ہوتے ہیں، یہ محض ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسان صاحبِ عقل وشعور ہستی ہے، یہ محض ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز آخری حد تک اسی اعتبار سے بنی ہے جیسی ہمارے وجود کی ضروریات ہیں۔ یہ اور ان جیسے انگنت اتفاقات ہیں جو اگر نہ ہوتے تو کارخانۂ ہستی وجود میں نہیں آتا اور آجاتا تو برقرار نہ رہ پاتا۔ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح اتفاق اور خوش قسمتی کے الفاظ اس کہانی میں استعمال ہوتے ہیں، اس کے بعد لغت میں ان کے معنی بدل دینے چاہییں۔

مجھے خیال آیا کہ میں اس عظیم الشان میوزیم پر ایک فلم بناؤں۔جس میں دکھاؤں کہ یہ ایک عظیم الشان سائنسی مرکز ہے۔ جو اتفاق سے اس شاندار عمارت میں قائم ہے۔ اتفاق سے عمارت میں کئی بڑے بڑے ہال وجود میں آگئے۔خوش قسمتی سے وہاں روشنی اور پانی کا بھی انتظام ہو گیا۔خوش قسمتی سے وہاں واش رومز بھی ہیں۔اور اتفاق سے سائنس کا شاہکار یہ تھیٹر بھی

یہاں بن گیا ہے۔ پھر یہ فلم اسی تھیٹر میں سارے سائنسدانوں اور ملحدوں کو بٹھا کر دکھاؤں اور کہوں کہ اب فرمایئے آپ کا کیا خیال ہے۔مگر پھر خیال آیا کہ اس طرح کے سنٹروں میں داخل ہونے سے پہلے ٹکٹ لینا پڑتا ہے اور اندر داخل ہوتے وقت اسے چیک کیا جاتا ہے۔اس کے بغیر کسی کو اندر داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔جس سے پتا چل جاتا ہے کہ یہ اتفاق نہیں ہے۔مگر خدا نے جو عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کا ٹکٹ لینا ضروری تو ہے مگر یہ اس وقت چیک ہوتا ہے جب آنے والا جانے لگتا ہے۔ یہاں قرآن کا کاؤنٹر بنا ہوا ہے۔ جہاں بڑا بڑا لکھا ہوا ہے کہ ایمان و عمل صالح کا ٹکٹ لیے بغیر یہاں گھومنے پر سزا ہے۔مگر وہ لوگ جن کی پیشانی پر مادیت کی صرف ایک آنکھ بنی ہوئی ہے وہ اس کی حقانیت پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ دل جو پتھر کے ہو چکے ہیں، یہاں سے لوٹتے وقت ان کا انجام وہی آگ ہوگی جو سورج میں دہک رہی ہے۔ جو دل آج پگھلنے کے لیے تیار نہیں وہ کل اس آگ میں موم کی طرح پگھلیں گے۔ جو آج خدا کے منکر ہیں وہ کل خدا کو ضرور مانیں گے۔آہ مگر اب مانا تو کیا مانا۔اب جانا تو کیا جانا۔اب سمجھا تو کیا سمجھا۔ٹکٹ خریدنے کا وقت تو گزر گیا۔ ہاں ایک بات اور بھی ہے جس کا فیصلہ میں قارئین پر چھوڑتا ہوں۔آپ ان لوگوں کے لیے کیا سزا تجویز کرتے ہیں جنہیں ٹکٹ کاؤنٹر پر ٹکٹ بیچنے کی ذمہ داری کے ساتھ کھڑا کیا گیا تھا مگر وہ کاؤنٹر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پہلوں کے لیے اگر آگ ہے تو دوسروں کے لیے پھول کیوں ہوں گے؟

سائنس سنٹر

سائنس سنٹر دیکھنے کے لیے کافی عرصے بعد آنا ہوا۔لیکن ترتیب برقرار رکھنے کے لیے یہیں تذکرہ کررہا ہوں۔ اس وقت تک گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں اس لیے کافی رش تھا۔شام چھ بجے یہ سنٹر بند ہو جاتا ہے اور اس وقت تین بج رہے تھے۔ میں ٹکٹ خرید کر اندر داخل ہوا۔اس

سنٹر کے کئی فلور تھے۔ گراؤنڈ فلور بی تھا۔ اس سے اوپر اے تھا۔ جبکہ نیچے زیرِ زمین سی، ڈی اور ای فلور تھے۔ میں یہ خیال کر رہا تھا کہ یہ نیویارک کے نیچرل ہسٹری میوزیم جیسی ہی چیز ہوگی۔ مگر اندازہ ہوا کہ یہ ایک بالکل مختلف نوعیت کی جگہ ہے۔ اُس میں معلومات کا عنصر زیادہ تھا۔ لاتعداد اشیا نمائش کے لیے رکھی ہوئی تھیں جبکہ یہاں سائنسی حقائق کو عملی انداز میں تجربات کے ذریعے واضح کیا گیا تھا۔ مثلاً نیوٹن کے قوانین، آواز کا خلا میں ختم ہوجانا، ساؤنڈ پروف کمرے کی ٹیکنیک وغیرہ۔

اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے ایک طویل راہداری تھی۔ جس میں زمین کے ابتدائی دور کے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ سب سے قدیم پتھر چار اعشاریہ چھ بلین سال پرانا تھا۔ اس کے بعد بتدریج نئے اور بعد میں تشکیل پانے والے پتھر زمانی ترتیب کے حساب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس راہداری میں چلتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ خدا اس دنیا کی زندگی کو کیوں اتنا مختصر کہتا ہے۔ جہاں اربوں سال کی کوئی اہمیت نہیں وہاں ساٹھ ستر سال کی انسانی زندگی کی کیا اہمیت ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں اپنی اس مختصر زندگی کو اربوں سال پر محیط کرلوں۔ چنانچہ اربوں سال پرانے ان پتھروں کو میں نے خدا کی توحید اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی اپنی شہادت پر گواہ ٹھہرالیا۔ مجھے امید ہے کہ کل قیامت کے دن میرے ایمان کی زندگی اربوں سال پر محیط ہوجائے گی۔

تعلیم اور تفریح ساتھ ساتھ

اس سنٹر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تعلیمی انداز میں سائنسی قوانین اور حقائق کو بڑے دلچسپ اور تفریحی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً کھیلوں کا ایک پورا سیکشن ہے جہاں مختلف کھیلوں کے ذریعے بہت سی باتیں بتائی گئی ہیں۔ فلکیات کے لیے ایک فلور کا پورا حصہ مختص ہے۔

اس کے علاوہ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور کمیونیکیشن کے بھی وسیع سیکشن ہیں۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ سائنس کے ہر شعبے سے متعلق اتنی زیادہ معلومات یہاں تھیں کہ مجھے وقت بہت کم لگا اور افسوس ہوا کہ میں صرف تین گھنٹے ہی یہاں گزار سکا۔ کافی چیزیں ایسی تھیں جنہیں تفصیل سے دیکھنا تھا مگر وقت ختم ہونے لگا۔ آخری سیکشن جو میں تفصیل سے دیکھ سکا وہ جسم انسانی سے متعلق تھا۔ یہ کافی معلوماتی تھا۔ مگر بعض معلومات خاص طور پر بالغان کے لیے تھیں مگر ان کے ذریعے سے یہاں آنے والے بچوں کی معلومات میں قبل از وقت اضافہ ہو رہا تھا۔

اس حصے میں مجھے سب سے زیادہ متاثر کن چیز انسانی پیدائش کے مراحل لگے۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی مختلف حالتوں کے نمونے یہاں محفوظ کیے گئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ انسان کبھی اس حالت میں بھی ہوتا ہے جسے دیکھ کر کراہیت تو آسکتی ہے مگر پیار نہیں۔ مگر ان حالتوں سے گزر کر انسان ایک ایسی شکل میں پیدا ہوتا ہے کہ دیکھنے والا دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھے۔ فتبارك الله احسن الخالقین ۔ قرآن میں خدا نے انسان کی تخلیق اور پیدائش کے مراحل سے بار بار یہ استدلال کیا ہے کہ انسان کو ہم نے پہلی دفعہ پیدا کیا ہے۔ ہمارے لیے قیامت کے دن اسے دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے۔ وہاں جا کر اس بات کی سچائی کو میں نے بہت اچھے انداز میں سمجھا۔

شراب نوشی کی لعنت

ایک روز کا ذکر ہے میں کامران کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کامران نے دروازہ کھولا تو پڑوس کی ایک خاتون تھیں جو پہلے کامران کے برابر والے فلیٹ میں رہتی تھیں مگر بعد میں اسی بلڈنگ میں اوپر شفٹ ہوگئی تھیں۔ وہ کافی خوفزدہ اور پریشان تھیں۔ انہوں نے کامران کو بتایا کہ کوئی شخص ان کے گھر میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کر رہا

تھا۔اس کے پاس چابی تھی جس سے وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔وہ بری طرح خوفزدہ ہوگئیں کیوں کہ وہ گھر میں اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ تنہا تھیں اوران کے شوہر گھر سے باہر تھے۔انہوں نے جلدی سے اپنی ایک جاننے والی خاتون کے گھر فون کیا۔انہوں نے اپنے ۱۶ سالہ بیٹے کوان کی مدد کے لیے بھیجا۔اتفاق سے اس لڑکے کے کچھ دوست بھی اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔چنانچہ وہ سب آگئے اوراس شخص کو پکڑ کر باہر لے گئے۔اس وقت وہ کامران کے گھر آئیں کہ وہ سب بچے ہیں اس لیے ہم لوگ ان کی مدد کے لیے جائیں۔

ہم نے انہیں اندر بٹھایا۔پھر میں اور کامران باہر گئے۔دیکھا تو پتا چلا کہ وہ شخص شراب کے نشے میں دھت تھا۔بظاہر کوئی پاکستانی لگتا تھا مگر شراب کے نشے میں کوئی بات صحیح نہیں بتا پا رہا تھا۔بہرحال پولیس کو فون کیا گیا۔اس دوران وہ برابر معافی مانگتا رہا کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔مگر لڑکے اسے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔تقریباً دس پندرہ منٹ بعد پولیس آئی۔کچھ اس سے اور کچھ ہم سے پوچھ گچھ کی اوراسے پکڑ کر لے گئی۔بہرحال اس واقعے کا اہم پہلو تو یہی ہے کہ شراب نوشی آدمی کو کتنا ذلیل کرا سکتی ہے۔پھر دوسری طرف نئے آنے والوں کے لیے بھی کافی نصیحت کا پہلو ہے۔وہ خاتون چار سال سے یہاں کینیڈا میں مقیم تھیں مگر انہیں بالکل بھی انگریزی نہیں آتی تھی۔دوسرے انہیں چھوٹی سی یہ بات بھی نہیں معلوم تھی کہ امریکا کینیڈا میں ایسی کسی بھی صورت میں 911 پر باآسانی فون کیا جاسکتا ہے اوراس سے ہر قسم کی مدد طلب کی جاسکتی ہے۔

نکاحِ ہم جنسی

کینیڈا کے متعلق میرا خیال تھا کہ چونکہ یہ بھی مغربی دنیا کا حصہ ہے بلکہ خاصا نمایاں حصہ ہے (کینیڈا دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ہے اور جی سیون کا رکن ہونے کے علاوہ انسانی حقوق کے اعتبار سے دنیا کا صفِ اول کا ملک ہے) اس لیے یہاں ہم جنس پرستی کو قانونی حیثیت

حاصل ہوگی۔ قانونی حیثیت سے مراد یہ نہیں کہ اس گھناؤنے فعل کے مرتکبین کے لیے سزا نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح عام میاں بیوی کے رشتہ کو ایک قانونی حیثیت حاصل ہے اور وراثت وغیرہ کے احکام ان پر نافذ ہوتے ہیں اسی طرح ان کو بھی یہ حیثیت حاصل ہو۔ تاہم ابھی تک کینیڈا میں یہ معاملہ نہیں تھا۔ یہ حیثیت یا تو کسی شادی شدہ جوڑے کو حاصل تھی جس نے کسی مذہبی ادارے مثلاً چرچ میں باقاعدہ شادی کی ہو یا وہ مرد وعورت جو بغیر کسی مذہبی بندھن کے باہمی رضامندی سے ساتھ رہتے ہوں اور خود ایک جوڑے کی حیثیت سے رجسٹر کرالیں۔ اسے کامن لا (Common Law) کا نام دیا جاتا ہے۔

یہ حیثیت ابھی تک ہم جنس پرستوں کو حاصل نہیں تھی۔ یعنی دو مرد (Gays) یا دو عورتیں (Lesbian) جو ساتھ رہ رہے ہوں انہیں قانون ایک جوڑا نہیں مانتا تھا۔ تاہم پچھلے دنوں سپریم کورٹ نے حکومت کو حکم دیا کہ انہیں بھی قانونی حیثیت دی جائے۔ لہٰذا ایک نیا قانون بنایا گیا ہے جس کی رو سے اب انہیں بھی ایک جوڑا مانا جائے گا اور میاں بیوی سے متعلق تمام احکامات کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔ اس سلسلے میں اخبارات میں کافی خبریں شائع ہوئیں اور ان دو عورتوں کی تصویریں بھی دی گئیں جنہوں نے سب سے پہلے خود کو اس حیثیت میں رجسٹر کرانے کا ''شرف'' حاصل کیا تھا۔

سگریٹ نوش لڑکی

جون کے مہینے سے ٹورنٹو کے ریسٹورنٹس میں سگریٹ نوشی پر پابندی لگادی گئی۔ سب وے پر مختلف زبانوں میں اس بات کا اعلان کافی دنوں سے ہورہا تھا۔ ان میں اردو زبان بھی شامل تھی۔ یہ گویا یہاں موجود پاکستانیوں کی اس کثیر تعداد کا اعتراف تھا جو اب کینیڈا کی معاشرتی زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ویسے یہاں 19 سال سے کم عمر لوگوں کے سگریٹ خریدنے

پر پابندی ہے۔شبہ ہونے پر دکاندار باقاعدہ اس بات کا ثبوت طلب کرسکتا ہے کہ خریدار کی عمر 19 سال ہے۔ مجھے اس بات کا علم اس طرح ہوا کہ ایک روز میں کچھ خریداری کرنے گروسری کی دکان پر گیا۔دکان کے باہر ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔اس نے مجھ سے کہا کہ یہ پیسے لے لیں اور مجھے یہاں سے سگریٹ خرید کر دے دیں۔وہ ایک نوجوان گوری لڑکی تھی جو چہرے بشرے سے معقول لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم خود کیوں نہیں لے لیتیں۔ کہنے لگی کہ وہ مجھ سے شناخت مانگیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ میں سگریٹ پینے کو غلط سمجھتا ہوں اس لیے تمہارے ساتھ تعاون نہیں کرسکتا۔

اندر جا کر میں نے دکاندار سے دریافت کیا کہ آیا واقعی نوجوانوں کے سگریٹ خریدنے پر پابندی ہے۔اس نے کہا کہ ہاں 19 سال سے کم عمر لوگ سگریٹ نہیں خرید سکتے۔واپسی پر دیکھا کہ وہ لڑکی وہیں کھڑی ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس کا کام نہیں کروں گا تو کوئی اور کردے گا۔لیکن میں اس کا کام کرتا ہوں تو کوئی نصیحت کی بات بھی کہہ سکتا ہوں۔لہٰذا میں نے اسے سگریٹ خرید کر لا دیے اور کہا کہ کیا تمہیں زندگی سے محبت نہیں؟ وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر میں نے اسے ایک دو باتیں اور سمجھائیں۔ جاتے وقت اس نے کہا، ’’Thank you‘‘، میں نے جواب دیا، ’’You are not welcome.‘‘۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ جو کام میں نے کیا وہ بھی خلافِ قانون تھا یعنی کسی کم عمر کو سگریٹ خرید کر دینا، جس کی سزا 5000 ڈالر جرمانہ تھی۔

یہ لوگ اپنی نئی نسل کے معاملے میں بڑے حساس ہیں۔شراب اور جوئے کا معاملہ میں امریکا کے سفر میں بیان کر چکا ہوں۔جنس کے معاملات میں بھی میڈیا والے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ بچوں کو اس سے محفوظ رکھا جائے۔لہٰذا جس پروگرام میں عریاں اور جنسی مناظر یا فحش مکالمے ہوں وہ عام اوقات میں نہیں دکھائے جاتے اور دکھانے سے قبل واضح اعلان کیا جاتا

ہے کہ یہ پروگرام بچوں کے لیےنہیں ہیں۔لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان کی نئی نسل ان تمام برائیوں میں پورے طور پر ملوث ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ کسی انسانی معاشرے میں قانونی نوعیت کے اقدامات سے کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔اور نہ قانون کے ذریعے زبردستی کسی کو راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔قانون کسی برے کو پکڑ سکتا ہے، برائی کو ختم نہیں کرسکتا۔یہ اس کے دائرہ کار سے باہر ہے۔

نیاگرا فالز کا سفر

دنیا کے وہ مقامات جو اپنی شہرت اور فطری حسن کے اعتبار سے دنیا بھر میں ممتاز ہیں ان میں نیاگرا فالز کا نام سرِ فہرست ہے۔جو لوگ کینیڈا کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتے انہیں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ افسانوی شہرت کی حامل یہ آبشار کینیڈا میں ہے۔میں نے بھی بچپن سے نیاگرا فالز کا نام تو بہت سنا تھا مگر کبھی سوچا نہیں تھا کہ سات سمندر پار واقع اس حسین آبشار کو دیکھنے کا کبھی موقع ملے گا۔میں کافی عرصے سے نیاگرا فالز جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔مگر اول تو اس کے لیے اچھا موسم ہونا چاہیے کیونکہ وہاں کی کھلی فضا میں ٹھنڈ زیادہ محسوس ہوتی۔دوسرے وہاں اکیلے جانے میں مزہ نہیں تھا۔اس لیے میں نے اپنے عرب دوست عبداللطیف کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا۔عبداللطیف کا بھائی بھی آیا ہوا تھا اور اس کا ایک اور مصری دوست بھی جانا چاہ رہا تھا یوں ہم چار آدمی ہوگئے۔مگر جب آدمی زیادہ ہوجاتے ہیں تو ایک دن طے کرنا آسان نہیں ہوتا۔ایک اور سبب دیر ہونے کا یہ بھی تھا کہ یہ لوگ گاڑی سے جانے پر اصرار کررہے تھے۔حالانکہ ٹورنٹو سے نیاگرا تک بس سروس سارا دن چلتی تھی اور اگر ایک دن میں جا کر واپس آنا ہو تو کافی رعایتی نرخ میں ٹکٹ دستیاب تھا۔

ہم چاروں نئے تھے اور کسی کے پاس بھی گاڑی نہیں تھی اس لیے کرائے کی گاڑی لینے کا

ارادہ کیا۔مگراس میں کریڈٹ کارڈ کا مسئلہ آڑے آرہا تھا کیونکہ وہ ہم میں سے کسی کے پاس نہ تھا۔آخر میں میں نے ارشد کے ایک دوست فہیم سے بات کی اوران کے ساتھ روانگی کا پروگرام طے ہوا۔موسمِ گرما شروع ہو چکا تھا۔اس روز اتوار کا دن تھا۔پیش گوئی کے مطابق مطلع صاف تھا۔موسم کافی بہتر بلکہ گرم تھا۔زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت 30 ڈگری کے قریب متوقع تھا۔ دوپہر کے وقت ہم روانہ ہوئے۔ پٹرول شہر سے ہی ڈلوالیا تھا۔ یہاں پٹرول کے ریٹ روز بدلتے رہتے ہیں۔اگر سیلف سروس والے پٹرول پمپ سے ڈلوائیں تو سستا ریٹ ملتا ہے۔ یعنی خود پٹرول ڈالیں اور کیشئر کو پیسے دے دیں۔

ٹورنٹو سے نیاگرا تک کا فاصلہ تقریباً 130 کلومیٹر ہے۔ہم ایک بجے چلے اور تین بجے وہاں پہنچے۔راستے میں کافی رش ملا جس کی بنا پر ہماری رفتار آہستہ رہی۔وہاں پہنچ کر بھی رش ملا کیونکہ موسم اچھا تھا اور چھٹی کا دن بھی تھا۔البتہ ابھی گرمیوں کی چھٹیاں نہیں ہوئی تھیں جن کے بعد یہاں بہت زیادہ رش ہوجاتا ہے۔اس وقت تمام قریبی پارکنگ لاٹ بھرے ہوئے تھے۔ ہمیں کافی دور واقع ایک پارکنگ لاٹ میں جگہ ملی۔

نیاگرا فالز کا جغرافیہ

سی این ٹاور کے ضمن میں اونٹاریو جھیل اور دوسری جھیلوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔نیاگرا آبشار انہی جھیلوں میں سے ایک جھیل ایری سے بہتی ہے۔ یہ پانچ جھیلیں ہیں جو امریکا اور کینیڈا کی سرحد پر واقع ہیں۔ان کے نام بالترتیب جھیل ایری (Lake Erie)،جھیل مشی گن (Lake Michigan)،جھیل سپیریئر (Lake Superior)،جھیل اونٹاریو (Lake Ontario) اور جھیل ہرون (Lake Huron) ہیں۔انہیں ملا کر گریٹ لیکس (Great Lakes) کہا جاتا ہے۔یہ میٹھے اور تازہ پانی کا دنیا میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔وسعت میں یہ کسی سمندر سے

کم نہیں لیکن میٹھے پانی کی بنا پر انہیں جھیل کہا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گلیشئر ایج کے خاتمے پر وجود میں آئیں اور قطب شمالی سے اٹھنے والے بادلوں کا مسلسل برسنا انہیں تازہ پانی فراہم کرتا رہتا ہے۔

جھیل ایری نیاگرا کے مقام پر پہنچ کر، جو کہ امریکا اور کینیڈا کی سرحد بھی ہے، ایک دریا کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دریائے نیاگرا کہلاتی ہے۔ اس مقام پر کسی زمانے میں آنے والے زلزلے کی بنا پر ایک بہت بڑی کھائی بن گئی ہے۔ اس کھائی کے کنارے پر پہنچ کر پانی کئی ٹکڑوں میں بٹ کر نیچے گرتا ہے اور دریا کی شکل میں اپنا سفر آگے جاری رکھتا ہے۔ پانی نیچے گرنے سے جو آبشار وجود میں آتی ہے وہ نیاگرا آبشار کہلاتی ہے۔ اس آبشار کے دو بنیادی حصے ہیں۔ ایک وہ جو بالکل کھائی کے آغاز میں نصف دائرے یا گھوڑے کی نعل کی شکل میں پانی کے ایک عظیم ریلے کی صورت میں گر رہا ہے۔ یہی وہ آبشار ہے جو مشہور ہے اور کینیڈین نیاگرا فالز کہلاتی ہے۔ آبشار کا بقیہ حصہ وہ ہے جس میں پانی امریکی طرف سے نسبتاً چھوٹے ریلوں کی شکل میں نیچے آرہا ہے۔ اسے امریکن نیاگرا فالز کہتے ہیں۔

آبشار کا منظر

وہاں پہنچنے کے بعد ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے کھانا کھایا جائے۔ چنانچہ قریبی ریسٹورنٹ سے پزا خرید کر کھایا۔ روڈ کے ایک طرف نیاگرا فالز کا منظر تھا اور دوسری طرف گھاس کے بڑے بڑے قطعات اور درخت۔ ہم نے ان درختوں کے سائے میں جا کر باجماعت نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہوتے ہوتے چار بج گئے۔ پھر ہم نے آبشار کا رخ کیا۔ اس وقت مطلع صاف تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بلکہ اس وقت اس کی تپش گراں گزر رہی تھی۔ ہم سے زیادہ یہ گوروں پر گراں تھی۔ جس پر احتجاج کرتے ہوئے بہت سے خواتین و

حضرات نے جسم کا بالائی لباس اتار دیا۔ جب کبھی سورج کی نظر اس احتجاج پر پڑتی تو وہ شرما کر بادل کے کسی ٹکڑے سے اپنا منہ چھالیتا۔ ہم بھی کچھ سکون کا سانس لیتے اور گوروں کی اس ذہانت کی داد دیتے۔

کنارے پر ریلنگ لگی تھی جس کو تھامے لوگوں کا جمِ غفیر حسنِ فطرت کے اس شاہکار کو دیکھنے میں منہمک تھا۔ بہت سے لوگ وڈیو یا فوٹو بنوا رہے تھے۔ ہم لوگ بھی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ بے اختیار زبان سے سبحان اللہ نکلا۔ آبشاریں دنیا میں بہت ہیں۔ مگر جو خوبصورتی اس کے حصے میں آئی ہے وہ بے مثل ہے۔ پانی کی انتہائی موٹی اور تیز دھار جب اوپر سے نیچے گرتی ہے تو عجب سماں پیدا کر دیتی ہے۔ دریا کا شفاف پانی جو زمین کے پس منظر میں بالکل ہرا لگ رہا تھا جب گرنے لگتا تو برف کی طرح سفید ہو جاتا۔ اس کے زمین سے ٹکرانے سے ایک زوردار آواز تسلسل سے پیدا ہو رہی تھی۔ نیچے پڑے پتھروں سے ٹکرا کر پانی کی ایک دھندلی چادر فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ یہ سفید جھاگ جو نہ جانے کتنی بلندی تک چھایا ہوا تھا ایک بادل کی طرح پھیل گیا تھا۔ یہ ایک ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ صاف موسم میں یہ بادل سی این ٹاور سے بھی نظر آتا ہے۔ وقفے وقفے سے تیز ہوا چلتی تو پانی کے قطرات کنارے پر کھڑے لوگوں پر آ کر برسنا شروع ہو جاتے اور انہیں گیلا کر دیتے۔ آبشار کی سب سے بڑی کشش اس کا گھوڑے کی نال جیسا ہونا ہے۔ نصف دائرے میں گرتا ہوا پانی ایک عام آبشار کی بنسبت بہت خوبصورت لگتا ہے۔

اس نصف دائرے سے آگے کی طرف پانی کے مزید دو دھارے گرتے نظر آ رہے تھے۔ یہ امریکی نیاگرا فالز تھی۔ مگر چونکہ وہ سیدھے اور کچھ چھوٹے تھے اور اس جگہ سے دور بھی، اس لیے یہاں سے کوئی خاص تاثر پیدا نہیں کر پا رہے تھے۔ ان تمام دھاروں کا پانی نیچے گر کر تیزی سے

ایک دریا کی شکل میں آگے بڑھ رہا تھا۔ دریا کے اوپر آبشار کے سامنے ایک انتہائی خوبصورت قوس وقزح وجود میں آ گئی تھی۔ پانی کے اڑتے ہوئے قطرات سے گزرتی سورج کی کرنوں نے ہلال کی شکل کی رنگ برنگی قوس وقزح کو جنم دیا تھا۔ نیچے کی سمت ایک اور دلچسپ منظر تھا۔ دریا میں کشتیاں چل رہی تھیں۔ یہ ان لوگوں کو آبشار کے بالکل نزدیک لے جاتیں جو اس کے حسن کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ کشتیاں پانی کے بہاؤ کے خلاف مزاحمت کرتی ہوئی آہستہ آہستہ آبشار کے قریب تک آ رہی تھیں۔ ان کشتیوں پر کھڑے لوگ پیلے یا نیلے رنگ کی برساتیاں پہنے ہوئے تھے۔ کیونکہ پانی کے گرنے سے جو چھینٹے اڑ رہے تھے وہ قریب جانے والوں پر بھرپور بارش کی طرح برستے تھے۔

دیگر تفریحات

مذکورہ بالا کشتی کے علاوہ بھی یہاں دیگر کئی تفریحات اور سہولیات مہیا کی گئی تھیں۔ رہائش کے لیے بڑے بڑے ہوٹل تعمیر کیے گئے تھے۔ ایک بہت بڑا کیسینو بھی بنا ہوا تھا۔ اسکائی لون نامی ایک بڑا ٹاور تھا۔ جس پر 775 فٹ کی بلندی سے نیا گرا فالز کا مشاہدہ کرنے کے لیے، سردی کے لحاظ سے شیشہ بند اور گرمی کے لحاظ سے کھلی ہوئی، مشاہدہ گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک بہت بڑا پارک نیا گرا پارک کے نام سے تھا۔ جس میں پھولوں کا ایک باغ، پھولوں سے بنی ہوئی گھڑی، گولف کا میدان، شاپنگ سنٹرز اور ریسٹورنٹ وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کلنٹن ہل نامی جگہ میں بھی بہت سی تفریحی چیزیں موجود تھیں۔ دیگر تفریحات میں ایرو کار یعنی فضا میں موٹے تار پر چلنے والی ٹرالی، وہیل مچھلی کا میوزیم، مختلف قسم کے جھولے اور رائڈز میری لینڈ نامی تفریح گاہ میں تھے۔ ایک اور اچھی مگر مہنگی تفریح ہیلی کاپٹر کے ذریعے آبشار کا نظارہ تھی۔ آبشار کو قریب سے دکھانے کا ایک اور ذریعہ بھی تھا۔ جسے Journey Behind The Falls

کہتے ہیں۔اس سفر میں کھائی میں نیچے بنی سرنگوں کے ذریعے لوگوں کو آبشار کے بالکل قریب لے جایا جاتا۔ جہاں وہ اوپر سے گرتی آبشار کو دیکھ سکتے تھے۔ ڈبل دیکر بسوں میں بٹھا کر پورے علاقے کا چکر دلانے کا بھی انتظام تھا۔جس میں ایک آدمی با قاعدہ کمنٹری کر کے لوگوں کو تمام اہم جگہوں کی تفصیلات سے آگاہ کرتا جاتا۔اس کے علاوہ ہر جمعے کی رات آتش بازی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔امریکا اور کینیڈا کے اہم دنوں کے موقع پر بھی یہ مظاہرہ ہوتا ہے۔

ان تفریحات کی مزید تفصیل بھی ہے مگر میں اسی پر بس کررہا ہوں۔ دراصل مغرب میں سیاحت ایک بڑی صنعت بن چکی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ ہر اس جگہ جہاں سیاح آتے ہیں اضافی تفریحات اور ہر طرح کی سہولیات مہیا کردیتے ہیں۔ دنیا بھر سے لوگ کھنچ کھنچ کر نیاگرا فالز آتے ہیں۔آنے والے ہماری طرح صرف چند گھنٹوں کے لیے نہیں آتے بلکہ دور دراز ملکوں سے کئی کئی دنوں کے لیے بھی آتے ہیں۔اس لیے یہاں ہر ذہن ومزاج کے لوگوں کے لیے تفریحات مہیا کردی گئی ہیں۔ بچے، بوڑھے، مرد، عورت اور ''بالغان'' سب کی تفریح کا انتظام ہے۔ایک شخص کب تلک آبشار دیکھے گا۔ چنانچہ لوگ ان تمام تفریحات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پاکستان کا امریکا میں اثر ورسوخ

ہم نے خدا کی صناعی کے سامنے غیر اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں پر نگاہ ڈالنا شانِ توحید کے خلاف سمجھا۔ تاہم ہمارے اس استغنا کا ایک اہم سبب ہماری جیب کی تنگی بھی تھی۔ ہمارے گروپ کے اکثر لوگ بیروزگار تھے۔ یہ چیز اچھی معلوم نہیں ہوتی تھی کہ ایک شخص یہ سارے مزے کرے اور باقی لوگ اس کی شکل دیکھیں۔لیکن خدا کی شانِ کریمی کو ہم پر رحم آیا اور اس نے ہمارے لیے ایک بہت اچھی تفریح کا مفت میں انتظام کردیا۔گھر سے چلتے وقت فہیم نے ہم سے کہا تھا کہ اپنے پاسپورٹ ساتھ رکھ لیں۔ہم امریکا میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔جانے

دیا تو مرحبا ورنہ ہمارا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم جب کینیڈین حصے سے فارغ ہو گئے تو سرحد کا رخ کیا۔ ویسے بھی دھوپ کی شدت نے ہمیں نڈھال کر دیا تھا جس کے بعد آبشار کا منظر اپنا ابتدائی تاثر کھو چکا تھا۔

دریائے نیاگرا امریکا اور کینیڈا کے درمیان حد فاصل کا بھی کام کرتا ہے۔ اس کے اوپر متعدد پل بنے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی ایک پل پر سے میں ریل کے ذریعے امریکا گیا تھا۔ آبشار کے پاس جو پل تھا اس کا نام رینبو برج (Rainbow Bridge) تھا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر پل کی طرف روانہ ہوئے۔ پل پر متعدد گیٹ بنے ہوئے تھے جن میں موجود امیگریشن اہلکار جانے والوں کے کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ ان میں سے چند ہی اس وقت کھلے ہوئے تھے۔ سرحد عبور کرنے کا دارومدار بڑی حد تک قسمت پر ہوتا ہے۔ امیگریشن افسر بادشاہ ہوتا ہے۔ چاہے تو بغیر چیکنگ کے چھوڑ دے اور چاہے تو بغیر وجہ بتائے داخلے کی اجازت دینے سے انکار کر دے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ اگلی گاڑیوں میں سے بعض کو مکمل طور پر چیک کیا جا رہا ہے اور بعض کو لوٹایا بھی جا رہا ہے۔ ہمیں چونکہ کوئی خوف نہ تھا اس لیے آرام سے بیٹھ کر اپنے نمبر کا انتظار کرتے رہے۔ گیٹ پر پہنچے تو افسر نے سوال کیا: ''سٹیزن شپ؟''، ہم نے جواب دیا: ''پاکستانی''۔ دوسرا سوال کیا: ''کیوں جا رہے ہو؟''، ہم نے کہا: ''آبشار دیکھنے''۔ اس نے تیسرا سوال کیے بغیر کہا کہ جاؤ۔ ہم خوشی خوشی آگے بڑھ گئے۔ میں نے اپنے عرب ساتھیوں سے ہنستے ہوئے کہا کہ دیکھا آپ نے پاکستان کا امریکا میں کتنا اثر ورسوخ ہے۔

امریکی نیاگرا فال

یہ بات مجھے معلوم تھی کہ نیاگرا آبشار امریکہ اور کینیڈا دونوں جگہ گرتی ہے۔ لیکن سنا تھا کہ اصل آبشار کینیڈا کی سمت سے ہی نظر آتی ہے اور دنیا میں شہرہ بھی اسی کا ہے۔ اس لیے امریکی

سائڈ پر آتے ہوئے ہم زیادہ پرجوش نہ تھے۔مگر واپسی کے وقت ہم پانچوں کی ، جو پہلی دفعہ یہاں آئے تھے، متفقہ رائے تھی کہ آبشار کا امریکی حصہ کئی اعتبار سے کینیڈین حصے سے بہتر ہے اور یہاں زیادہ ورائٹی پائی جاتی ہے۔ بلکہ ہم لوگوں کو تو اصل مزہ ہی یہیں آیا۔تاہم امریکی حصے کی ایک کمی یہ تھی کہ یہاں وہ اکثر اضافی تفریحات نہیں تھیں جو کینیڈین حصے میں موجود تھیں۔اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ امریکی سائڈ پر اتنے لوگ نہیں آتے۔اس وقت صرف گیس کا ایک بڑا غبارہ ہوا میں اڑ رہا تھا جس کے نیچے لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ یہ ایک رسی کے ذریعے زمین سے بندھا تھا۔ رسی کو ڈھیلا چھوڑا جاتا تو یہ غبارہ بلند ہوجاتا اور لوگ فضا سے آبشار کا نظارہ کرتے۔غبارے کو نیچے اتارنے کے لیے رسی کو کھینچ لیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ ہیلی کاپٹر سروس بھی چل رہی تھی۔سرنگوں سے لوگوں کو برساتی پہنا کر آبشار کے بالکل قریب بھی لے جایا جارہا تھا۔کچھ ہوٹلز بھی تھے۔ہوسکتا ہے اور چیزیں بھی ہوں مگر میں انہی کو دیکھ سکا۔

امریکی آبشار کا نقشہ

کینیڈا کی طرف سے جب امریکی آبشار کو دیکھا تھا تو پانی کے دو دھارے نیچے گرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔مگر درحقیقت ایسا نہ تھا بلکہ یہاں سے پانی کئی شاخوں میں بٹ کر نیچے گر رہا تھا۔لیکن دونوں کناروں کے درمیان فاصلہ کافی زیادہ تھا اس لیے دو ہی دھارے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ یہاں کنارے کے بالکل قریب ایک بہت بڑا اور وسیع سبزہ زار تھا۔اس میں موجود رنگ برنگے پھولوں، بلند درختوں اور گھاس کے مخملی فرش نے ماحول کو بہت دلکش بنادیا تھا۔ جبکہ کینیڈین سائڈ پر سبزہ کچھ دور تھا۔اس طرح کہ کنارے پر لگی ریلنگ کے ساتھ لوگوں کے کھڑے ہونے کے لیے کافی بڑا پکا فرش تھا۔پھر ایک روڈ اور پھر تھوڑا سا سبزہ تھا۔یہاں پارکنگ بھی مفت میں مل گئی۔گاڑی کھڑی کرکے ہم پارک میں داخل ہوئے۔اس میں امریکی فوجیوں کی

یادگاریں تعمیر کی گئی تھیں۔ اور بھی مختلف قسم کے خوبصورت اسٹیچو خوبصورتی کی غرض سے لگائے گئے تھے۔ یہ پارک کافی طویل تھا۔ یہ اس جگہ سے شروع ہوتا تھا جہاں سے گھوڑے کی نعل والی بڑی آبشار کا پانی زمین پر گرتا ہے اور رینبو برج تک چلتا چلا گیا ہے۔ یہ فاصلہ دو کلو میٹر سے کم نہیں ہوگا۔ یہاں سے چونکہ وہ پانی بھی گزرتا ہے جو کئی شاخوں کی شکل میں نیچے جا رہا ہے اس لیے ان کے اوپر چھوٹے چھوٹے پل بنا دیے گئے ہیں۔

امریکی شادی

پارک میں ایک جگہ ایک دولہا دلہن بہت سارے لوگوں کے ساتھ گروپ فوٹو بنواتے ہوئے نظر آئے۔ پہلے میں سمجھا کہ شادی کی کوئی باقاعدہ تقریب ہو رہی ہے کیونکہ ہمارے ہاں شادی، گھر اور مسجد کے علاوہ، ہر جگہ ہوتی ہے۔ مگر خیال آیا کہ یہ لوگ عیسائی ہیں اور ان کے ہاں شادی کی تقریب صرف چرچ میں ہوتی ہے۔ میں نے فہیم سے اس بارے میں دریافت کیا۔ وہ کافی سال شکاگو میں قیام کر چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں دستور ہے کہ صبح چرچ میں شادی کی تقریب ہوتی ہے۔ جس کے بعد دولہا دلہن تفریح کے لیے نکل جاتے ہیں اور مختلف جگہوں پر گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ ہمارے یہاں تو دولہا دلہن شادی کے بعد حجلۂ عروسی میں جاتے ہیں۔ فہیم نے برجستہ جواب دیا کہ ہمارے دولہا دلہن جس مقصد کے لیے کمرے میں جاتے ہیں یہ لوگ شادی کے تکلف میں پڑنے سے پہلے ہی اس سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس پر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔

تاہم ان کے اس طرزِ عمل کا ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ یہ لوگ باہر گھوم پھر کر شادی کے انتہائی مہنگے کپڑوں کی پوری قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ کیونکہ دولہا دلہن کچھ ایسی چیز ہوتے ہیں کہ ہر شخص انہیں ضرور دیکھتا ہے۔ دولہا دلہن کو تو چھوڑیے ہمارے ہاں تو لوگ دولہا کی سجی ہوئی کار کو

بھی گردن گھما گھما کر دیکھتے ہیں۔ کچھ تاسف اور ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ وہ بیچارے ہوتے ہیں جنہوں نے یہ لڈو نگل لیا ہوتا ہے۔ کچھ پرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ یہ وہ حسرت زدہ ہوتے ہیں جنہوں نے ابھی تک اس لڈو کو نہیں چکھا ہوتا۔ بقیہ لوگ اپنی معاشرتی ذمہ داری سمجھ کر اسے دیکھتے ہیں۔

ویسے فہیم کی بات بالکل درست تھی۔ اس معاشرے کا عام رجحان یہی ہے کہ لڑکا اور لڑکی کافی عرصے تک میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ اگر باہمی تعلقات درست رہتے ہیں تو پھر یہ شادی کے مذہبی بندھن میں بندھتے ہیں۔ شادی اب ایک مذہبی اور کسی درجے میں معاشرتی تکلف ہے وگرنہ قانونی حیثیت تو کامن لا (Common Law) کی صورت میں بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہم باتیں کر رہے تھے کہ تھوڑی دیر میں دیکھا تو ساری بھیڑ غائب اور دولہا دلہن ایک تیسرے صاحب کے ہمراہ چلے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو تین ہی رہ گئے۔ فہیم نے کہا کہ یہ صاحب چلے جائیں گے تو صرف یہ دونوں بچیں گے۔ اس پر میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ تھوڑا عرصہ گزرے گا تو صرف ایک ایک ہی رہ جائیں گے اور پھر نئے سرے سے تلاش (Hunting) شروع ہوگی۔ یہی مغرب ہے اور یہی اس کا دستورِ حیات۔

نیچے سے آبشار کا نظارہ

امریکی آبشار کینیڈا کی سمت سے اتنی بڑی نہیں لگتی مگر یہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہ بھی کافی بڑی ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آبشار کے بالکل برابر میں کھڑے ہو کر ایک بہت بڑی دھار کی شکل میں گرتے ہوئے پانی کو دیکھ سکتے ہیں۔ جبکہ کینیڈین سائڈ پر جس جگہ لوگ کھڑے ہوتے ہیں وہاں سے پانی اتنی موٹی دھار کی شکل میں نہیں گرتا۔ بلکہ اصل موٹی دھار امریکا کی طرف سے گر رہی ہے مگر یہ مقابل سمت میں ہونے کی بنا پر دور ہے اور اس کا وہ تاثر نہیں بن پاتا

جو یہاں سے محسوس ہو رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ پانی کا جو بادل بنتا ہے وہ کسی حد تک خود ایک رکاوٹ کا کام کرتا ہے اور سامنے کے منظر کو دھندلا دیتا ہے۔جبکہ یہاں پانی کی انتہائی موٹی دھار جو برف کی طرح سفید اور زوردار آواز سے بالکل برابر سے گر رہی تھی اس کو دیکھنے کا اپنا لطف تھا۔

ہم ریلنگ کے ساتھ کھڑے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔اتنے میں دیکھا کہ کچھ لوگ آبشار کے نیچے کی طرف کھڑے ہیں۔ دراصل نیچے جو دریا بہہ رہا تھا، اس کے ساتھ کنارے پر کچھ بلند جگہ تھی جس کے اردگرد ریلنگ لگا کر اسے باقاعدہ نیچے سے آبشار کے نظارے کی ایک جگہ بنا دیا گیا تھا۔ وہاں جانے کے لیے سیڑھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم اس طرف لپکے۔ان سیڑھیوں کا راستہ ایک پل سے آتا تھا۔ یہ پل کیا تھا ایک پلیٹ فارم سا تھا جو دریا کے اوپر کافی آگے تک گیا ہوا تھا۔اس پر کھڑے ہو کر امریکی اور کینیڈین نیاگرا فالز کا نظارہ بیک وقت ممکن تھا۔اس پلیٹ فارم پر ایک لفٹ بھی تھی جو نیچے دریا کے پاس لے جاتی تھی۔اور وہاں سے وہ سیڑھیاں آتی تھیں جنہیں ہم نے اوپر سے دیکھا تھا۔

اس پلیٹ فارم پر جانے کے لیے 50 امریکی سینٹ دینے تھے جو ہم نے اپنے پاس موجود کینیڈین کرنسی میں ادا کیے۔ پہلے اوپر سے آبشار کا نظارہ کیا پھر لفٹ میں بیٹھ کر نیچے گئے۔لفٹ نے ایک ڈیک کے پاس اتارا جہاں سے، سیزن کے دنوں میں،لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر آبشار کے قریب جاتے ہوں گے مگر اس وقت یہ جگہ خالی پڑی تھی۔ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور ان پر چڑھ کر گرتی ہوئی آبشار کے بالکل قریب پہنچ گئے۔سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو پانی ایک بہت موٹی دھار کی شکل میں گرتا نظر آیا۔ہم ایسے زاویے پر تھے کہ پانی کی بوچھاڑ سے محفوظ تھے البتہ کبھی کبھار ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ ہم پر پھوار برسنے لگتی۔ابھی تک ہم نے اوپر سے ہی آبشار

دیکھی تھی۔ مگر اب اندازہ ہوا کہ اس طرح نیچے اور اتنے قریب سے جھاگ اڑاتے شور مچاتے پانی کو دیکھنے کا اپنا مزہ تھا۔ بالخصوص کنارے سے جو پانی گر رہا تھا وہ بالکل برف کی طرح سفید تھا اور موٹائی میں بھی بہت زیادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر کوئی شخص اس کے نیچے آجائے تو اس کا قیمہ بننے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی۔ اس تصور سے ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

ہم دیر تک وہاں کھڑے مفت کی اس Journey Behind The Falls کو دیکھتے رہے۔ عبداللطیف کے بھائی کے پاس وڈیو کیمرہ تھا جس سے وہ اس سارے منظر کی مووی بنا رہا تھا۔ اسی نے ہم سے کہا کہ آگے کی طرف اس آبشار کے اور بھی اچھے مناظر ہیں اس لیے واپس چلتے ہیں۔ لہٰذا ہم واپس اوپر آگئے۔ اس پلیٹ فارم کا مرکزی حصہ مزید چھ سات منزل بلند تھا۔ میں اور فہیم وہاں بھی چلے گئے اور بہت بلندی سے ساری آبشار کا نظارہ کیا جو بہت دلکش لگا۔ یہ ہمارے لیے فری کا اسکائی لون ٹاور تھا۔

M کی شکل کی آبشار

واپس اوپر آکر ہم پارک میں آگے کی سمت بڑھنے لگے۔ راستے میں تین پل ملے جو بہتے ہوئے پانی کے اوپر بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد ایک جگہ نظر آئی جہاں ریلنگ لگی ہوئی تھی اور لوگ یہاں سے کھڑے ہوکر آبشار کو گرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی وہاں جا کر کھڑے ہوگئے۔ یہاں سے سامنے کینیڈا نظر آرہا تھا۔ بائیں طرف بڑی آبشار تھی اور دائیں طرف امریکی آبشار۔ اس جگہ سے ہمیں امریکی آبشار کی صحیح ساخت کا اندازہ ہوا۔ یہ انگریزی زبان کے حرف M کی شکل کی بنی ہوئی تھی۔ دو بہت بڑے دھارے نیچے گر رہے تھے اور یہی دو دھارے سامنے سے نظر آتے تھے۔ مگر یہاں سے دیکھا کہ ان کے بیچ میں ایک چھوٹا دھارا بھی نیچے گر رہا ہے جس نے اسے M کی شکل دے دی ہے۔ شاید پتھروں یا بلند زمین کے آجانے کی بنا پر دریا کے بہاؤ

میں یہ کٹاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں سے اس پوری آبشار کا منظر بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ خدا کی قدرت ہے کہ ایک طرف بڑی آبشار ہے جو انگریزی کے حرف U کی مانند ہے اور دوسری طرف M بنا ہوا ہے۔

گھوڑے کی نعل والی آبشار کا امریکی رخ

یہاں سے ہم آگے بڑھے تو ایک اور چھوٹا سا دھارا آیا مگر دوسروں کی موجودگی میں وہ قابلِ التفات نہ ٹھہرا۔ ہم چلتے چلتے گھوڑے کی نعل یا U کی شکل والی آبشار کے قریب پہنچ گئے۔اس آبشار کا ایک نقطۂ آغاز یا کونا تو کینیڈا کی طرف تھا اور دوسرا یہ تھا جہاں ہم اس وقت موجود تھے۔ یہی وہ حصہ تھا جہاں پانی پورے زور وشور سے نیچے گر رہا تھا۔کینیڈین سائڈ پر پانی کے نسبتاً آہستہ گرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہاں دریا کے بیچ میں خشکی کا ایک جزیرہ سا تھا جس نے پانی کے بہاؤ کا اصل زور توڑ دیا تھا۔تاہم اس طرف پانی اسی جوش سے آرہا تھا جس طرح ہمارا دریائے سوات پہاڑی علاقوں میں تیزی سے بہتا ہے۔ چنانچہ یہاں سے پانی ایک زوردار آواز اور موٹی دھار کے ساتھ نیچے گر رہا تھا۔ اتفاق سے عین اس کے نیچے بڑے بڑے چٹانی پتھر پڑے تھے۔ چنانچہ آبشار دریا کے بجائے ان پتھروں پر گرتی تھی۔جن سے ٹکرا کر پانی فضا میں بلند ہوتا چلا جاتا اور جھاگ کا وہ بادل وجود میں آتا جو سیکڑوں فٹ بلند تھا۔کینیڈا کی سمت سے پانی کی دھند کی بنا پر وہاں سے یہ منظر اتنا واضح نظر نہیں آرہا تھا مگر یہاں سے بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس منظر نے ہم لوگوں کو آخری حد تک مسحور کر دیا۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دن بھر کی تیز دھوپ کے بعد اب سورج ڈوبنے کے بالکل قریب تھا اور دھوپ کی تمازت دم توڑ چکی تھی۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف سبزہ تھا جو آنکھوں کو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ان سب

چیزوں کا طبیعت پر اثر ہونا لازمی تھا۔اس وقت مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔سامنے اسکائی لون ٹاور پر لگی گھڑی نو بجا رہی تھی۔اس میں درجۂ حرارت بھی آ رہا تھا جو 22 ڈگری تھا۔ہم اس وقت تک امریکی حصے کو بھی اچھی طرح کھنگال چکے تھے۔میں ریلنگ کے ساتھ لگی نشست پر بیٹھ گیا اور اس حسین منظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔سامنے شور مچاتا ہوا دریا تھا جو کنارے پر پہنچ کر آبشار کی شکل میں نیچے گر رہا تھا۔پانی کی اڑتی ہوئی بوچھاڑ وقفے وقفے سے مجھ پر بھی آ جاتی۔سامنے کینیڈا کی سمت ڈوبنے والا سورج اپنے پیچھے آسمان پر شفق کی سرخی چھوڑ گیا تھا۔ٹھنڈی ہوا، نیلا آسمان، اڑتے ہوئے خوبصورت پرندے، بہتا پانی، سرسبز درخت اور سارا دن کے گھومنے پھرنے کی تھکن کے بعد یہ آرام دہ لمحات۔مجھے وقت کی رفتار ٹھہری ہوئی محسوس ہوئی۔دل نہیں چاہتا تھا کہ یہاں سے اٹھوں۔مگر جو ٹھنڈی ہوا مجھے بڑی خوشگوار لگ رہی تھی وہ میرے ساتھیوں کو اب ناگوار لگنے لگی تھی۔جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا آبشار کا رنگ بھی بدل رہا تھا۔سفید سے سبزی مائل ہوتا پانی اب اور اچھا لگنے لگا تھا۔ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اس لیے ہم نے روانگی کا ارادہ کیا۔مغرب کی نماز پارک میں ہی پڑھی۔راستے میں ایک جگہ رک کر مزیدار کافی پی اور پھر اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئے۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کینیڈا میں موسمِ گرما کا آغاز سرکاری طور پر 21 جون سے ہوتا ہے۔جولائی اور اگست گرمی کے مہینے ہوتے ہیں۔میں نے یہ معلومات کینیڈا سے متعلق معلوماتی کتابچے میں پڑھیں۔دوست احباب نے بھی بتایا کہ جب یہاں گرمی ہوگی تو آپ کو بھی گرمی کے مارے مزہ آ جائے گا۔تاہم 21 جون آیا اور آ کر گزر گیا۔گو اب موسم سرد نہیں رہا تھا مگر اسے گرم بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔نیاگرا میں گرمی ضرور لگی تھی مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دھوپ میں گھوم رہے تھے۔تاہم جس

گرمی سے ڈرایا گیا تھا وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ سردی میں رہنے کے عادی ہوگئے ہیں اس لیے معمولی گرمی سے بھی پریشان ہوجاتے ہیں۔

جولائی کے آتے آتے آسمان نے ایک اور رنگ بدلا۔سال بھر ٹھنڈی ہوا، برف، بارش اور نمی کی ماری زمین آسمان کے بدلتے چہرے کی تاب نہ لاکر سلگنے لگی۔وہ سورج جو سال بھر سردی کے مارے دن میں بادلوں کی قبا اور رات میں اندھیرے کی چادر اوڑھے دبکا پڑا رہتا تھا، سردی کے جاتے ہی شیر ہوگیا۔جس روز وہ بادل کا گھونگٹ الٹ کر دولتِ دیدار تقسیم کرتا لوگ محاورتاً نہیں حقیقتاً پانی پانی ہوجاتے۔اس پانی کو سکھانے کے لیے ہر جگہ پنکھے اور اے سی چلنے لگے۔دوسروں کو چھوڑیں مجھے خود پر حیرت ہونے لگی کی کینیڈا آئے ہوئے چند مہینے ہوئے اور یہ گرمی زیادہ لگنے لگی۔

مقامی لوگوں کے لیے گرمی کا موسم گو شدید ہوتا ہے مگر یہ ان کے گھومنے پھرنے اور تفریح کا موسم بھی ہوتا ہے۔اپریل سے ستمبر تک ہر مہینے ایک لانگ ویک اینڈ ضرور آتا ہے۔یعنی ہفتہ اتوار کے ساتھ پیر یا جمعے کی چھٹی بھی ہوتی ہے۔جون کے آخر تک تعلیمی اداروں میں چھٹیاں ہوجاتی ہیں اور لوگ گھومنے پھرنے نکل جاتے ہیں۔ اس دوران شہر میں بھی مستقل میلے کا سماں رہتا ہے۔مختلف تفریحی پرگرام، پریڈ، مقابلے، تہوار اور دیگر تفریحات جاری رہتی ہیں۔جن کی تفصیل ان بروشرز میں مل جاتی ہے جو بسوں میں موجود ہوتے ہیں۔سال بھر سردی کے ستائے ہوئے لوگوں کے لیے یہ موسم ایسا ہی ہوتا ہے جیسے گرم علاقوں میں تپتی دوپہر کے بعد کالی گھٹا ابر رحمت برسادے۔تاہم اس موسم کا نئے آنے والوں کے اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔البتہ پرانے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ان کا اخلاق پہلے ہی خراب ہو چکا ہوتا ہے۔ہمارے ہاں مغرب کی بدنامی کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں سے لوگ یہاں گرمیوں میں ہی آتے ہیں جب یہ لوگ

مکمل طور پر جامے سے باہر ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آنے والے بھی اس موسم میں یہاں اپنا چال چلن ہی خراب کرنے آتے ہوں۔ اپنے ملک میں تو یہ موقع با آسانی نہیں مل سکتا۔ واپس جا کر گوروں کو بھی برا بھلا کہہ دیتے ہیں تا کہ اپنی طرف سے اعلانِ برأت ہو جائے۔

ایک عالمِ دین کی آمد

گرمیوں کی آمد کے ساتھ ہی جہاں اس خطے میں زندگی کی چہل پہل پورے عروج پر پہنچ جاتی ہے، وہیں پاکستان سے علماء، شعرا، کالم نویسوں، ادیبوں، گلوکاروں اور فنکاروں کی آمد بھی شروع ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں کو بلانے کا اہتمام وہ پاکستانی کرتے ہیں جو یہاں کافی عرصے سے مقیم ہیں اور مالی استحکام حاصل کر چکے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے وطن اور ثقافت سے جڑے رہنا چاہتے ہیں۔ کچھ لوگ بالخصوص فنکار اور گلوکار کمرشل شوز کے لیے آتے ہیں۔ اب یہ سلسلہ مستقل ہو چکا ہے اور ہر سال بڑی تعداد میں نمایاں پاکستانی شخصیات یہاں آتی ہیں۔

اس سال بھی بڑی تعداد میں لوگ آئے تھے۔ انہی میں پاکستان کے ایک بڑے عالمِ دین بھی تھے۔ وہ امریکا سے ہو کر چند دنوں کے لیے کینیڈا بھی آئے۔ دوسرے لوگوں کی تقریب میں اگر کوئی جانا چاہے تو کافی مہنگا ٹکٹ ہوتا ہے یا کم از کم پاس ضرور لینا پڑتا ہے۔ جبکہ علما کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ آنے والوں سے کچھ بھی نہیں مانگتے۔ نہ تالیاں، نہ واہ واہ، نہ حقِ خدمت اور نہ چندہ۔ میں صالح علما کی بات کر رہا ہوں۔ یہ بھی ایک ایسے ہی عالمِ دین تھے جن کا پورا خاندان دین کی خدمت کے حوالے سے معروف ہے۔

انہوں نے ٹورنٹو میں تین دن تین مختلف مساجد میں تقریریں کیں۔ میں تینوں میں شریک ہوا۔ مجھے یہ بات بے حد پسند آئی کہ انہوں نے تینوں دن بہت اچھے اور حسبِ ضرورت موضوعات کا انتخاب کیا۔ ایک دن موت اور آخرت، دوسرے دن اخلاق ومعاملات اور

تیسرے دن اللہ کا ذکر اور تقویٰ کو موضوع بنایا۔ وگرنہ بہت سے نام نہاد عالم ایسے بھی ہوتے ہیں جو ملک سے باہر آ کر بھی اپنے مسلک اور فرقے کی دکان چمکاتے ہیں۔ برطانیہ میں تو یہ وبا پھیل چکی ہے مگر یہ خطہ ابھی تک اس مصیبت سے محفوظ ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو وہ اصول بھی بتائے جن کی روشنی میں وہ مغرب میں رہ کر بھی اپنا تحفظ کر سکتے ہیں۔ میرے لیے خوشگوار حیرت کا مقام تھا کہ تینوں دن، چھٹی نہ ہونے کے باوجود، بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے ان محافل میں شرکت کی۔

کینیڈا میں اسلام و عیسائیت کی تبلیغ

یہاں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا دین ہے۔ مگر سب سے بڑے پیمانے پر دعوتی سرگرمیاں عیسائیوں کی طرف سے کی جاتی ہیں۔ مجھے کئی دفعہ راستے میں چلتے ہوئے عیسائیت سے متعلق تبلیغی لٹریچر تھما دیا گیا۔ بلکہ ایک دفعہ گھر پر بھی عیسائی مبلغین آئے تھے۔ ایک سری لنکن جس کے ساتھ میں مقیم تھا اس نے مجھے بتایا کہ یہ لوگ اکثر آتے رہتے ہیں۔ عیسائیوں کے لٹریچر میں معقولیت نام کی تو کوئی چیز نہیں تھی۔ البتہ دو چیزیں اس میں بڑے نمایاں طور پر موجود تھیں۔ ایک یہ کہ ان میں لوگوں کے سطحی جذبات کو بڑی شدت سے ابھارا گیا تھا۔ شرک کی سطحی اپیل ویسے بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ خدا جو علم و ادراک کی گرفت میں نہ آئے انسانوں کے لیے اسے پکارنا کبھی آسان نہیں رہا، آج بھی نہیں ہے۔ جبکہ ایک انسان جو تصور میں آ سکے اس کی دہائی دینا بڑا آسان ہے۔ اقبال نے ''شکوہ'' میں اسی بات کو یوں بیان کیا ہے۔

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر

مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر

چنانچہ عیسائی لٹریچر میں یہی بات بڑی نمایاں تھی۔ تاہم مغرب میں چونکہ علم و شعور زیادہ

ہے اس لیے ان کی یہ جذباتی اپیل وہاں زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ اس کی اصل تاثیر افریقہ اور ایشیا کے ان پس ماندہ علاقوں میں ظاہر ہوتی ہے جہاں لوگوں کے دماغ کو پیٹ کے مسائل سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ علمی عقلی سوال اٹھانا ویسے بھی غریب اور ان پڑھ لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لہٰذا کسی قسم کی علمی اور عقلی تنقید کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

دوسرا پہلو اس لٹریچر کا یہ تھا کہ طباعت کا معیار بہت اعلیٰ تھا۔ رسالہ پورا رنگین اور خوبصورت تصاویر سے مزین تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں اسی لیے اس درجے کا لٹریچر مفت میں بانٹتے پھر رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو شاید اس بات کا علم نہ ہو کہ ان کے ہاں تبلیغ باقاعدہ ایک پیشہ ہے اور بہت منفعت بخش پیشہ ہے۔

کینیڈا میں مسلمانوں کا دعوتی کام بھی دیکھا۔ مسلمان یہ کام زیادہ تر انفرادی بنیادوں پر کرتے ہیں۔ البتہ ایک دفعہ ایک مسلمان تنظیم کا ایک بروشر بھی ملا جو عیسائیوں کے ذہن میں اٹھنے والے اعتراضات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا مگر اس میں مناظرے کا رنگ نمایاں تھا۔ یہ انداز مجھے قطعاً پسند نہیں۔ دعوتِ دین ہمیشہ خیر خواہی کے جذبے کے تحت دینی چاہیے۔ نہ کہ دوسروں کو شکست دے کر اپنی فتح کا جھنڈا اگاڑنے کے لیے۔

اَلَيۡسَ مِنۡكُمۡ رَجُلٌ رَّشِيۡد

ایک روز میں کیسا لوما (اس کا تفصیلی تذکرہ آگے آرہا ہے) جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ ڈاؤن ٹاؤن پہنچا تو روڈ کے دونوں کناروں پر لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو بیٹھے دیکھا۔ ارد گرد کی گلیاں پولیس نے بند کر رکھی تھیں اور روڈ پر کوئی ٹریفک نہ تھا۔ شاید کوئی جلوس آرہا تھا۔ میں تجسس میں فٹ پاتھ پر آگے کی سمت بڑھتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں دیکھا تو واقعی ایک جلوس آرہا تھا۔ مگر یہ جلوس جنازے کا تھا۔ اور جنازہ شرفِ انسانیت کا تھا جو بڑی دھوم دھام سے نکل

رہا تھا۔

اوپر جو عنوان میں نے قائم کیا ہے یہ سیدنا لوطؑ کے وہ الفاظ ہیں جب ان کی ہم جنس پرست قوم کے افراد ان کے پاس دوڑے چلے آئے تھے کہ ان نوجوان خوبصورت لڑکوں کو ہمارے حوالے کر دو جو تمہارے ہاں مہمان آئے ہیں۔ الفاظ کا مدعا یہ ہے کہ کیا تم میں ایک آدمی بھی ایسا سلیم الفطرت نہیں جس پر اپنی حرکتوں اور اس خبیث فعل کی شناعت واضح ہو۔

مغرب میں فرد کی آزادی ایک بنیادی قدر ہے۔ اس کے نتیجے میں جہاں کئی اچھی چیزیں وجود میں آئیں وہاں جنسی بے راہروی میں یہ ہر حد پھلانگ گئے۔ میں پیچھے لکھ چکا ہوں کہ نکاح ہم جنسی کو بھی انہوں نے اب قانونی حیثیت دے دی۔ ایک طرف قانونی جنگ کے ذریعے اس طرح کی چیزوں کو سندِ جواز عطا کیا جا رہا ہے تو دوسری طرف میڈیا اپنے سطحی مفادات کے خاطر ان کو خوب ابھارتا ہے۔ اس کے ساتھ انسانوں کی فطرت میں ان بے ہودگیوں کے خلاف جو مزاحمت ہے اسے دور کرنے کے لیے یہ لوگ اس طرح کی پریڈز نکالتے ہیں جیسی اس وقت میرے سامنے تھی۔ یہ ہم جنس پرست عورتوں کی سالانہ پریڈ تھی۔ اس سے قبل ہم جنس پرستوں کے بارے میں میری رائے یہ تھی کہ یہ لوگ ایب نارمل ہوتے ہیں۔ مگر اس روز اس جلوس میں شامل عورتوں کی حرکتیں دیکھ کر میری یہ رائے یقین میں بدل گئی۔

ان کی بہت سی حرکات تو نا قابلِ بیان ہیں۔ جو قابلِ بیان ہیں اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ شروع میں اسکوٹر سوار عورتیں تھیں، ان کے بعد مختلف ٹولیوں میں بینرز اٹھائے، زور دار میوزک کی آواز پر ناچتی، اچھلتی، کودتی عورتیں گزریں۔ بعض ٹاپ لیس تھیں اور بعض کے ساتھ بچے اور کتے بھی تھے۔ بیچ میں ایک سجی ہوئی گاڑی تھی جس میں دو عورتوں کا ایک نوبیاہتا (یہ اصطلاح کینیڈا کے حالیہ قانون کے حوالے سے استعمال کر رہا ہوں) جوڑا بیٹھا تھا۔

یہ جلوس اس شو کا ایک بہت چھوٹا سا ٹریلر تھا جو اگلے دن ہوا۔ اس دن کو یہاں پرائڈ ڈے پریڈ کے نام سے جوش و خروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ یہ ہم جنس پرست مرد و زن کی بہت بڑی مشترکہ پڑیڈ ہوتی ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس دن پریڈ کو دیکھنے کے لیے 10 لاکھ افراد ڈاؤن ٹاؤن کی سڑکوں پر جمع تھے۔ شہر کے میئر نے بھی پریڈ میں شرکت کی۔ مجھے عام لوگوں سے بات کر کے اس کا احساس ہوا کہ حکومت، میڈیا اور سیاستدانوں کی طرف سے جس طرح ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اس کے نتیجے میں اب اس معاشرے میں بالعموم اس فعل اور اس کے مرتکبین کو قبول کر لیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر مغربی تہذیب کے زیرِ اثر دنیا بھر میں اس چیز کو فروغ مل رہا ہے۔ خود ہمارے پڑوس میں اس موضوع پر فلمیں بنائی جا رہی ہیں جنہیں ہمارے ملک میں بھی گھر گھر شوق سے دیکھا جاتا ہے۔

کیسا لوما

کسی عباسی خلیفہ غالباً ہارون الرشید نے ایک شاندار محل بنایا۔ اس کی تکمیل کے بعد اس نے ایک بزرگ کو بلا کر یہ محل دکھایا اور دریافت کیا کہ آپ کو اس محل میں کوئی نقص نظر آتا ہے؟ بزرگ نے جواب دیا کہ ہاں ایک کمی ہے ہو سکے تو اسے دور کر دیں۔ وہ یہ کہ محل آپ کے پاس ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اگر یہ رہ گیا تو آپ نہیں رہیں گے۔ یہ واقعہ ٹورنٹو میں واقع کیسا لوما پر پورا صادق آتا ہے۔ کیسا لوما اسپینش زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پہاڑی کے محل کے ہیں۔ یہ محل بیسوی صدی کے آغاز پر سر ہنری مل پیلٹ نے بنوایا تھا۔ یہ کینیڈا کا بہت بڑا سرمایہ دار اور بارسوخ شخص تھا۔ انگلینڈ کے شاہ ایڈورڈ ہفتم سے نائٹ کا خطاب پانے والا یہ شخص فوج میں میجر جرنل کے عہدے پر فائز رہا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ٹرانسپورٹ، جائیداد، انشورنس اور سب سے بڑھ کر بجلی کی فراہمی کے کاروبار میں اس شخص نے بے حد دولت کمائی۔

اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپی طرزِ تعمیر کے مطابق ایک عظیم الشان محل ایک بلند پہاڑی پر بنایا جائے تا کہ پورے شہر کا وہاں سے نظارہ کیا جا سکے۔ کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے اس محل کی تعمیر کا آغاز 1911 میں ہوا اور تین سال میں 300 آدمیوں کی شب و روز محنت کے بعد اس زمانے کے 35 لاکھ ڈالر میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس نے اور اس کی بیوی لیڈی میری پیلٹ نے اس عظیم الشان محل کو بڑے ارمانوں سے سنوارا۔ یہ ایک طرف یورپ کے قدیم طرزِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا اور دوسری طرف دورِ جدید کی ہر سہولت وہاں مہیا کی گئی تھی۔ اندازہ کیجیے کہ اس زمانے میں بھی 59 فون محل میں موجود تھے جن میں سے ایک باتھ روم میں بھی تھا۔ مگر ان میاں بیوی کو اس محل میں دس سال بھی رہنا نصیب نہ ہوا۔ سر ہنری پیلٹ کا کاروبار خسارے میں چلا گیا اور آخر کار اس کے لیے یہ محل سفید ہاتھی بن گیا۔ چنانچہ اسے یہ محل واجب الادا قرضوں کے بدلے میں شہر کی انتظامیہ کے حوالے کر کے ایک اپارٹمنٹ میں منتقل ہونا پڑا۔

آج یہ محل سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہے جہاں چالیس ہزار لوگ سالانہ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ مگر افسوس اسے تاریخ، حسنِ تعمیر اور کلچر کا ایک نمونہ ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی نہیں جو اس سے نصیحت حاصل کرے۔ دنیا کے دوسرے سرے پر واقع سرزمینِ پاکستان کے ایک باکمال شاعر نے ایسی ہی صورتحال پر بڑی اعلیٰ رباعی کہی تھی۔ یہ رباعی گو کہ تاریخی شہر ہڑپہ کے بارے میں تھی لیکن ہر ایسی جگہ کے بارے میں بھی سو فیصد درست ہے۔

وہ شہرِ بے مثال ہڑپہ ہے جسکا نام
اس قریۂ خموش و شہرِ خراب سے
عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل رہا ہے منوں کے حساب سے

محل کی تفصیلات

اب اس محل میں کوئی نہیں رہتا بلکہ یہ ایک مقامی کلب کی ملکیت ہے جس نے دس ڈالر ٹکٹ لگا کر اسے ایک تماشہ گاہ بنا دیا ہے۔ گو یہ محل اپنی پرانی شان و شوکت کھو چکا ہے۔ مگر اب بھی اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں یقیناً یہ ایک شاہکار عمارت ہوگی۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت ہے جس میں تہہ خانہ بھی موجود ہے۔ تہہ خانے سے 800 فٹ لمبی ایک سرنگ نکلتی ہے جو زمین سے 18 فٹ نیچے تعمیر کی گئی ہے۔ یہ سرنگ مشکل وقت میں خفیہ طریقے سے بھاگنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہ ایک اصطبل پر ختم ہوتی ہے۔ یہ سرنگ قرونِ وسطیٰ کے مخصوص حالات کا تقاضہ تھی۔ تاہم جدید دور کی رعایت سے اصطبل کے ساتھ گاڑیوں کا گیراج بھی بنا دیا گیا ہے۔

عمارت کے کمرے بڑے بڑے ہیں جہاں اس زمانے کا بہترین فرنیچر ابھی تک رکھا ہے۔ برطانیہ کے شاہی خاندان کے افراد کے لیے خصوصی کمرے بنوائے گئے تھے تاکہ وہ جب کبھی یہاں آئیں تو ان میں قیام کریں۔ محل میں ایک بڑی لائبریری ہے جہاں مختلف علوم وفنون کی کتابیں رکھی گئی ہیں۔ سر ہنری پیلٹ کے فوجی پس منظر کے اعتبار سے ایک بڑا میوزیم بھی موجود ہے جس میں اس کے زیرِ استعمال رہنے والی رائفلیں وغیرہ رکھی گئی ہیں۔ محل سے ملحق ایک بہت بڑا باغ ہے جس میں فوارے اور رنگ برنگے پھول لگے ہوئے ہیں۔ تاہم باغ صرف گرمیوں میں کھلتا ہے۔ اسی لیے اس وقت کھلا تھا۔ محل کی ایک اور خصوصیت اس کے دو بڑے مینار ہیں۔ جن سے پورے شہر کا شاندار نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

اسے دیکھنے کے لیے بڑی تعداد میں سیاح آئے ہوئے تھے۔ ایک اچھا انتظام یہ تھا کہ سیاحوں کو ایک نقشہ اور موبائل فون دے دیا جاتا۔ نقشے میں ہر کمرے کا نمبر ہوتا جسے فون پر دبانے سے اس کمرے کے متعلق تمام تر تفصیلات بیان کر دی جاتی۔ یہ معلومات کئی زبانوں میں دستیاب

تھیں۔ میں یہاں کافی دیر رہا اور محل کے تمام حصوں میں گھوما۔ سرنگ اور مینار مجھے سب سے زیادہ غیر معمولی لگے۔ مینار سے پورے شہر کا نظارہ ممکن تھا۔ جبکہ سرنگ میں چلنا ایک بڑا دلچسپ تجربہ تھا گو کہ وہاں چلتے ہوئے گھٹن کا احساس بھی ہوا۔ جن لوگوں کو قدیم یورپی فنِ تعمیر میں کوئی دلچسپی ہو یا اسلامی فنِ تعمیر سے اس کا موازنہ کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے یہ ایک اچھی جگہ ہے۔ میرا یہاں جانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ عبرت حاصل کروں اور یہ دیکھوں کہ اس محل میں بھی اور ہر اس گھر میں جسے دو افراد اپنی جنت کے طور پر تعمیر کرتے ہیں ایک بنیادی خامی ضرور ہوتی ہے۔ محل نہیں رہتا یا محل والے نہیں رہتے۔

کینیڈا میں کھانے پینے کے مسائل

مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے کھانے کا مینو اللہ میاں نے خود سیٹ کیا ہے۔ اس مینو میں چند چیزیں حرام قرار دے دی گئی ہیں۔ ان میں سرِ فہرست سور یا خنزیر کا گوشت ہے۔ مسلمانوں کو اس سے اتنی کراہیت ہے کہ کوئی مسلمان زنا کرسکتا ہے، سود کھا سکتا ہے، شراب پی سکتا ہے مگر سور کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ یہاں موجود مسلمانوں میں اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں کہ سور کا گوشت اور ہر وہ چیز جس میں اس کی آمیزش ہوگی وہ ناجائز ہے۔ تاہم یہاں دستیاب دیگر حلال جانوروں کے گوشت میں دو ایسی چیزیں موجود ہیں جو قرآن میں ضروری قرار دی گئی ہیں لیکن یہاں نہیں کی جاتیں۔ اول یہ کہ جانور کا تذکیہ (المائدہ 3:5) نہیں ہوتا۔ تذکیہ کا مطلب یہ ہے کہ جانور کو اس طرح ذبح کیا جائے کہ اس کا خون اچھی طرح بہہ جائے۔ جیسا کہ بقرعید پر ہر شخص دیکھتا ہے کہ جانور کی شہہ رگ کاٹ کر چھوڑ دیا جاتا ہے جس سے جسم کا پورا خون بہہ جاتا ہے اور گوشت خون سے پاک ہوجاتا ہے۔ اسے ذبح کہتے ہیں۔ جبکہ اونٹ کی صورت میں نحر کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی یہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ

یہاں اللہ کا نام لیے بغیر جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔ ایسے جانور کو کھانے سے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں منع کیا ہے (الانعام 121:6)۔

تذکیہ کے سلسلے میں سنا ہے کہ یہاں صحت کے نقطۂ نگاہ سے جانور کے خون بہانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ البتہ دوسرا مسئلہ بہرحال موجود ہے۔ اس سلسلے میں عرب علما کے زیرِ اثر ایک رائے یہ ہے کہ اس کو کھالینے میں حرج نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ گوشت کھاتے وقت اس پر اللہ کا نام لے لیا جائے۔ دلیل کے طور پر ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ جس کے مطابق حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ بدوی لوگ ہمارے پاس گوشت لایا کرتے تھے اور ہمیں خبر نہ ہوتی تھی کہ انھوں نے اس پر اللہ کا نام لیا ہے یا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر کھالیا کرو، (صحیح مسلم باب الضحایہ)۔ تاہم خود یہ حدیث ایک ایسی صورتحال کا ذکر کررہی ہے جہاں یہ بات غیر یقینی ہے کہ اللہ کا نام لیا گیا یا نہیں۔ لیکن یہاں تو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ کا نام لیا ہی نہیں گیا۔ سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت واضح طور پر کہتی ہے کہ ''اور اس (جانور کا گوشت) مت کھاؤ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور یقیناً یہ فسق کا کام ہے''۔ اگر کھاتے وقت اللہ کا نام لینے سے مسئلہ حل ہوجاتا تو آیت کا نزول ہی بے معنی ہے یا پھر آیت کو اس طرح ہونا چاہیے تھا کہ اللہ کا نام لیے بغیر گوشت مت کھایا کرو۔ لیکن ہمارے عرب بھائی کہتے ہیں کہ یہ مغرب ہے اور یہاں ایسا ہی گوشت دستیاب ہوتا ہے اور چونکہ دین میں آسانی ہے اس لیے ایسے گوشت کو کھالینے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کے کہنے سے اور بالخصوص حدیث کے سننے کے بعد بیشتر پاکستانی حضرات بھی بے تکلف یہ گوشت کھانے لگے ہیں۔ تاہم مذکورہ بالا اصول یعنی ''دین آسان ہے'' کو بنیاد بنایا گیا تو گوشت ہی نہیں اور بھی بہت کچھ حلال ہونا شروع ہوجائے گا۔ رہی حدیث تو اس کا موقع محل میں واضح کرچکا ہوں۔

بہرحال میں نے دونوں طرف کے دلائل سامنے رکھ دیے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس ساری بحث سے قطع نظر مسلمان اتنی بڑی تعداد میں یہاں آچکے ہیں کہ اب حلال کھانے پینے کی اشیا کا کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوتا۔ جگہ جگہ حلال گوشت دستیاب ہے اور مسلم ریسٹورنٹ بھی بڑی تعداد میں کھل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی دکان سے فش برگر اور بغیر پنیر کا پزا کھایا جا سکتا ہے۔ پنیر کے متعلق سنا یہی ہے کہ اس میں سوٴر کی چربی کے اجزا ہوتے ہیں۔ کینیڈا میں قیام کے دوران میری پسندیدہ غذا کنگ برگر کی بین الاقوامی چین کا فش برگر تھا۔ فش برگر میں نباتاتی تیل استعمال کیا جاتا ہے۔

چاول، انڈا آلو اور میں

کھانے کا ذکر آیا ہے تو اپنا معاملہ بھی بیان کر دوں۔ یہاں قیام کے دوران فش برگر کے علاوہ میرے مینو میں صرف تین چیزیں شامل تھیں: چاول، انڈا، آلو۔ یہ صورتحال میرے دوست طارق کی کینیڈا آمد کے بعد تبدیل ہوئی جب انہوں نے کھانا پکانے کی ذمہ داری سنبھالی۔ دراصل ساری زندگی جو کام میں نے کبھی نہیں کیا وہ کچن میں جا کر کھانا پکانا تھا۔ اس معاملے میں میرے علم و ہنر کی انتہا چائے بنانا اور انڈا ہالف فرائی کرنا تھا۔ اس میں بھی میرا کیا کرا یا میرے ہی سامنے آتا اور کوئی دوسرا میرے اعمال کا بوجھ اٹھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ مجھے اپنی بنائی ہوئی چائے اور اپنا تلا ہوا انڈا خود ہی زہر مار کرنا پڑتا۔

زندگی میں ہر موقع پر خواتین کے ساتھ ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جب ان کے بغیر زندگی گزارنی پڑے تو یہ ایک سزا بن جاتی ہے۔ کینیڈا کے آزاد ماحول میں یوں تو کسی بھی خاتون کی خدمات حاصل کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ مگر جن ''بنیادی ضرورتوں'' کے لیے یہاں خواتین دامے، درمے، قدمے، سخنے دستیاب تھیں وہ میرا مسئلہ نہ تھا۔ میرے مسئلے میں تو خواتین

میں چاند سورج کا عکس نظر آنے کے بجائے خود چاند سورج روٹیاں لگنے لگتے ہیں۔ مگر ایسی خواتین جو مرد کو باورچی خانے سے بے نیاز کر دیں اب پاکستان میں بھی ناپید ہوتی جارہی ہیں تو کینیڈا میں کہاں سے ملتیں۔

شروع میں کچھ دن تو گزارا ہو گیا مگر آخر کار اس میدان میں کودنا پڑا۔ نگہت باجی کو نیویارک فون کر کے پوچھا کہ سب سے آسان کھانا کونسا ہوتا ہے۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ سارے کھانے آسان ہوتے ہیں...... شرط یہ ہے کہ دوسرا بنائے۔ وہ شادی سے پہلے خود بھی اسی فارمولے پر عمل کرتی تھیں۔ یعنی شادی سے قبل ان کا واحد آؤٹ پٹ چائے تھی جسے وہ کبھی کبھار گھر والوں کے بے حد اصرار پر بنادیتیں۔ مگر شادی کے بعد شوہر ایسے ملے جن کے دل کی طرف جانے والا واحد راستہ پیٹ سے گزرتا تھا اس لیے اب وہ سارے کھانے بہت اعلیٰ بنانے لگی ہیں۔ بہرحال ان سے پوچھ کر آلو چاول بنانے سیکھے۔ اگلی ڈش آلو فرائی سیکھی۔ اس دوران انڈے پر ہر ممکنہ تجربہ کرتا رہا۔ مگر اس کے علاوہ کسی چوتھی چیز کو سیکھنے کا سوچا بھی نہیں کیونکہ یہ باتیں اگر میری منکوحہ کے علم میں آ جاتیں تو عین ممکن تھا انہیں بیڈروم سے کچن کا فاصلہ بہت طویل لگنے لگتا۔ ویسے بھی آج کل ہمارے ہاں عورتوں کے حقوق کا جتنا چرچا ہے اس کے بعد عین ممکن ہے کہ پیدائش کے وقت شوہر نامدار کو، گائنالوجسٹ کے علاوہ، زچہ کو بھی نقد رقم فیس کی صورت میں ادا کرنی پڑے۔

کینیڈا کے تین W

امریکا کینیڈا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کے تین W کا کوئی بھروسہ نہیں۔ یعنی Woman, Work, Weather۔ میں موخر الذکر یعنی خواتین کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس عرصے میں کوئی تجربہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اول الذکر دونوں کا حال

واقعی ایسا نظر آیا۔ امریکی معیشت سست روی کا شکار ہے۔جس کے اثرات کینیڈا پر بھی پوری طرح نمایاں ہیں۔ نتیجے کے طور پر بڑے پیمانے پر کمپنیاں ملازمین کو نکال رہی ہیں۔کسی کو نہیں معلوم کہ کل نوکری پر جائے اور پرسوں نوکری سے جائے۔

دوسرے W کا بھی یہی حال ہے۔پچھلے کچھ عرصے سے گرمی پڑنا شروع ہوگئی ہے۔آخری دو دنوں میں تو یہ حال ہوا کہ اہل شہر کی حالت خراب ہوگئی۔65 سالہ ریکارڈ ٹوٹنے کے قریب ہوگیا۔خود مجھے بڑی گرمی محسوس ہوئی۔اور درجۂ حرارت کتنا تھا؟ صرف 32 ڈگری سنٹی گریڈ۔مگر خربوزوں کو دیکھ کر خربوزے نے بھی رنگ پکڑ لیا۔تاہم دوسرے خربوزوں کی طرح یہ خربوزہ نہ بیچ پر جا سکتا تھا نہ پول میں چھلانگ لگا سکتا تھا اور نہ اپنے چھلکے میرا مطلب ہے کہ کپڑے اتار کر گھوم سکتا تھا۔گرمی کی اس لہر کے بعد صبح کو طوفان بادوباراں آیا۔بارش اس قدر تیز تھی کہ پانی سیدھا گرنے کے بجائے 45 ڈگری کے زاویے پر گر رہا تھا۔بارش تو کچھ دیر میں رک گئی مگر ٹھنڈی ہوا سارا دن چلتی رہی۔گرمی جانے کے علاوہ اس ہوا کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ خواتین جو پچھلے دنوں آخری حد تک بے قابو ہو چکی تھیں دوبارہ جامے میں آگئیں۔تاہم اے سی بیچنے والوں کے کاروبار پر اس کا برا اثر پڑا جو ایک دن پہلے تک آڈر بک کرتے کرتے تھک گئے تھے،اب خالی ہاتھ بیٹھے تھے یا کل کے آڈر کینسل کر رہے تھے۔

کینیڈین خواتین کی خوبصورتی کا راز

اسی زمانے میں ارشد شادی کے بعد انڈیا سے چھٹیاں گزار کر لوٹ آئے۔اب ہم دونوں کا اسٹیٹس برابر اور غم مشترکہ ہو چکا تھا۔ یعنی نکاح یافتہ مگر منکوحہ سے دور۔وہ اکثر مجھے ساتھ لے کر کہیں نہ کہیں نکل جاتے۔ایک روز میں ارشد کے ساتھ کہیں سے واپس آ رہا تھا۔دوران گفتگو ارشد نے کہا کہ یہاں کی خواتین ہماری خواتین سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔میں نے کہا کہ

ایسی بات نہیں۔ یہاں کی خواتین اتنی خوبصورت نہیں ہوتیں جتنی لگتی ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔اول یہ کہ گورا رنگ جو ہمارے نزدیک خوبصورتی کا ایک بڑا معیار ہے وہ یہاں کی ہر خاتون میں ہوتا ہے۔ دوسرے یہاں کی ہر لڑکی کماتی ہے اور اپنی تنخواہ کو تمام تر اپنی ذات پر خرچ کرتی ہے۔اس طرح بازار میں آرائشِ حسن کے جتنے کچھ ٹوٹکے دستیاب ہیں وہ با آسانی ان کی پہنچ میں ہیں۔تیسرے یہاں فیشن کا کریز اور نت نئے آئیڈیے ہم سے کہیں زیادہ ہیں جنہیں یہ خود پر آزماتی رہتی ہیں۔ چوتھے یہاں ٹیکنالوجی اتنی زیادہ ترقی یافتہ ہے کہ جو کسی سے نہیں ہوسکتا وہ ٹیکنالوجی کے ذریعے ہوجاتا ہے۔مثلاً کوسمیٹک سرجری سے چہرے اور جسم میں تناسب پیدا کرنا یا لیزر کے ذریعے جلد سے بالوں کی صفائی وغیرہ۔ پانچویں یہاں موٹاپے اور فٹنس کے معاملے میں لوگ اپنا بہت خیال رکھتے ہیں جبکہ ہماری خواتین شادی اور بالخصوص بچوں کے بعد اپنا خیال نہیں رکھتیں۔چھٹی اور کافی اہم بات یہ ہے کہ چہرے کی جو کچھ کمی یہاں کی خواتین کی کشش کو کم کرتی ہے وہ اسے جسم کی نمائش سے پورا کرلیتی ہیں۔

میں اسے مزید دلائل گنوادیتا مگر اتنے میں گھر آ گیا۔ وہ بیچارہ بھی قائل ہوگیا۔شاید آپ بھی ہوچکے ہوں اور جس کے لیے یہ لمبی داستان لکھی امید ہے وہ بھی قائل ہوچکی ہوگی۔ یہ باتیں اپنی جگہ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہاں کی عورت اگر زیادہ خوبصورت ہوتب بھی جو حسن ہر راہ چلتے کو دعوتِ نظارہ دے اور ہر حوصلہ مند آغوش میں سما جانے کے لیے تیار ہو کوئی سلیم الفطرت شخص اس کا تاثر قبول نہیں کرسکتا۔

طارق کی آمد اور میری دربدری

جولائی کے وسط میں میرے اور میرے بھائی رضوان کے ایک مشترکہ دوست طارق کو ٹورنٹو آنا تھا۔ یہ بھی جدہ میں جاب کرتے تھے۔پچھلے سال میں نے اور میری اہلیہ نے ان کی فیملی

کے ساتھ حج کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے رہائش کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا۔اس وقت میں جس جگہ مقیم تھا اس کی صفائی کے معیار سے مطمئن نہ تھا۔نیز میرا ارادہ تھا کہ میں وسط جولائی میں عمرے کے لیے روانہ ہوجاؤں۔اس لیے میں نے سوچا کہ ایک نئی جگہ شفٹ ہوجاتا ہوں۔ جہاں فی الوقت میں رہ لوں گا اور بعد میں طارق۔ لہٰذا میں ایک دوسری جگہ شفٹ ہوگیا جو کامران کے گھر کے قریب ہی تھی۔ مجھے اور میرے سامان کو نئے گھر تک ڈھونے کا فریضہ بھی کامران نے ہی سرانجام دیا۔

میں جن کے ہاں شفٹ ہوا تھا ان صاحب کا نام اطہر تھا۔وہ خاصے دیندار آدمی تھے اور ساتھ میں بہت صفائی پسند بھی۔جب طارق آئے تو انہیں لے کر میں ان تمام جگہوں پر گیا جن کا تذکرہ دوسرے باب میں ہوچکا ہے۔ یہاں کا ٹرانسپورٹ سسٹم اور دیگر تمام چیزیں میں نے انہیں سمجھادیں۔میرا ارادہ تھا کہ طارق کی آمد کے دو چار دن بعد میں ان کے سارے کام کرواکر روانہ ہوجاؤں گا۔مگر اس کے بعد میری آزمائش کا وہ سلسلہ شروع ہوگیا جس کی بنا پر میرے پروگرام کے علاوہ ذہنی سکون کا بھی بیڑا اغرق ہوگیا۔

عمرہ کی نئی پالیسی

سعودی حکومت نے عمرے کی نئی پالیسی شروع کی ہے۔سعودی حکومت کے لیے اس کا مفہوم جو بھی ہو ایک عام آدمی کے لیے اس کا مطلب خواری، پریشانی، ذہنی کوفت اور زیادہ خرچے کے سوا کچھ نہیں۔اس سے قبل طریقۂ کار بالکل سادہ تھا۔حفاظتی ٹیکہ لگوانے کے بعد عمرے کا ویزا بلاتردد مل جاتا تھا۔مگر اب عمرہ ویزا کے لیے مخصوص ٹریول ایجنٹ مقرر ہوئے۔ان سے عمرہ پیکج خریدنا ضروری تھا۔ ٹورنٹو میں یہ ایجنٹ بہت زیادہ پیسے مانگ رہے تھے۔ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ ٹورنٹو میں فیسٹیول کے موقع پر ہر کسی کو شریک کرنے کے لیے بسوں کے پاس

خصوصی رعایتی نرخ پر فروخت کیے جاتے ہیں۔ کرسمس پر یہاں ہر چیز پر سیل لگ جاتی ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے بھائیوں کو لوٹنے کا کوئی موقع مل جائے۔ اس کے بعد یہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ سعودی حکومت کی پالیسی نے یہ موقع فراہم کر دیا۔ سعودی حکومت، بقول ان ایجنٹس کے، زرِ ضمانت کے طور پر ایک لاکھ ریال ان لوگوں سے لیتی تھی۔ یہ پیسہ انہوں نے عام لوگوں سے اس طرح وصول کرنا شروع کر دیا کہ جو پیکج وہ سعودی عرب سے 100 ڈالر کا خریدتے وہ آگے 700 کا فروخت کرتے۔

بات صرف مہنگے پیکج کی ہوتی تو پھر بھی غنیمت تھا، مگر اس دوران میں پاکستانی ٹریل ایجنٹس کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے جھوٹ، بددیانتی، وعدہ خلافی اور بداخلاقی کہ ایسے تجربات پیش آئے کہ طبیعت مکدر ہوگئی۔ دراصل امریکا اور کینیڈا میں ''کافروں'' سے معاملہ کرتے کرتے میں بھول گیا تھا کہ مسلمان کیسے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے بہت اچھی طرح یاد دلا دیا کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ میں نے دوسرے باب میں لکھا تھا کہ ہم غیر مسلموں کے اس برے سلوک کا رونا روتے ہیں جو وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ جیسے بھی ہوں اپنے لوگوں کے ساتھ بہت اچھے ہیں۔ ہم تو وہ بدنصیب ہیں جو اپنے بھائیوں کی جیب، دامن، گلا جسے موقع لگے کاٹ لیتے ہیں۔

الوداع ٹورنٹو

ٹورنٹو میں آخری دو ہفتے انتظار کی سولی پر گزارے۔ اُدھر سعودی عرب میں میری بیوی اور بھائی پریشان تھے۔ آخر خدا خدا کر کے مجھے ویزا ملا۔ میں نے اسی شام کی بکنگ کرالی۔ میرا پروگرام تھا کہ میں تین دن نیویارک میں بہن کے پاس ٹھہروں گا اور پھر سعودی عرب کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ تمام احباب سے فون پر بات کر لی۔ یہ سب بھی پریشان تھے کہ میں اتنے دنوں

سے جانے کا کہہ رہا ہوں مگر جا کر نہیں دیتا۔ پھر نگہت باجی کو فون کر کے اپنے آنے کا بتایا۔ ایئر پورٹ کے لیے ارشد کو کہہ دیا تھا۔ ارشد کے ساتھ طارق بھی ایئر پورٹ تک الوداع کہنے کے لیے آئے تھے۔ ٹورنٹو سے ایئر کینیڈا کی فلائٹ کے ذریعے نیویارک کے لاگارڈیا (La Gaurdia) ایئر پورٹ پر اترا اور ٹیکسی کے ذریعے نگہت باجی کے گھر پہنچ گیا۔

نیویارک کا قیام

اس دفعہ میں نیویارک گھومنے نہیں صرف بہن سے ملنے آیا تھا اس لیے سارا وقت ان کے پاس رہا۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر بڑے اہتمام سے میرے لیے بہت سارے کھانے بنا رکھے تھے۔ فہیم بھائی اچھے کھانے کے بہت شوقین ہیں اور نگہت باجی کھانے بہت اچھے بناتی ہیں۔ بہر حال کھانے اتنے سارے اور اتنے اچھے تھے کہ میں تین دن تک کھاتا رہا مگر نیت نہیں بھری۔ اسی دوران عزیز بھائی سے بھی فون پر بات ہوئی۔ ماشاءاللہ ان کی اب شادی ہو چکی تھی۔

اس دوران ایک دن شہر دیکھنے نکلا۔ ٹائمز اسکوائر کی رونقیں پہلے سے کہیں زیادہ تھیں کیونکہ گرمیوں کی چھٹیوں میں دنیا بھر سے سیاح آئے ہوئے تھے۔ میں ساؤتھ فیری بھی گیا اور نیویارک کو الوداعی نگاہوں سے دیکھا۔ مین ہٹن میں گھومتے ہوئے ایک جگہ پہنچا تو ایسا جھٹکا لگا کہ بڑی دیر تک اس کے اثرات سے نکل نہ سکا۔ فٹ پاتھ پر ایک جگہ لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ میں سمجھا کہ کوئی فلم وغیرہ ہو گی۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ مردوں کے عریاں ناچ کا شو تھا اور مرد وزن بڑے اشتیاق سے کھڑے شو شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ عورتوں کے نیوڈ شو اور اسٹرپ ڈانس کے اڈے تو (باہر سے) دیکھ چکا تھا مگر اسے دیکھ کر واقعی اپنا سر پیٹ لینے کا دل چاہا۔ یہ مغرب والے بھی عجیب لوگ ہیں۔ کہیں ''احسن تقویم'' اور کہیں ''اسفل السافلین''۔

مغربی طرزِ زندگی

اہل مغرب کی بات آ گئی ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چار ماہ میں مغرب کی زندگی کے جن اہم پہلوؤں نے مجھے متاثر کیا یا جو براہِ راست میرے علم و مشاہدے میں آئے میں ان کی کچھ تفصیل بیان کردوں۔

مغربی معاشرہ الحاد (Atheism) کی بنیاد پر کھڑا ہے اور یہ الحاد انکارِ خدا سے زیادہ انکارِ آخرت کا نام ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی کا نصب العین یہ دنیا اور اس کی رنگینیاں بن چکی ہیں۔ یہاں ہر شخص دنیا میں ہی اپنی جنت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے بنیادی طور پر سرمایہ چاہیے۔ چنانچہ ڈالر مغربی دنیا کی سب سے بنیادی اور اصل قدر ہے۔ کیونکہ اسی سے سب کچھ ملتا ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ یہاں حکومت ہر فرد کو بہترین معاشی مواقع فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اسی پر اس کی اصل مقبولیت کا انحصار ہوتا ہے۔ چنانچہ حکومت کی بھرپور کوشش ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے ہر فرد کو مکمل معاشی مواقع مہیا کرے۔ روزگار نہیں تو بیروزگاری الاؤنس ضرور دیتی ہے۔ کاروبار اور اعلیٰ تعلیم کے لیے قرضہ ملنا یہاں اتنا آسان ہے کہ ہم لوگ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ بالخصوص تعلیمی قرضے تو بلاسودی ہوتے ہیں۔ ترقی کے مواقع صرف بڑے شہروں میں ہی نہیں بلکہ دور دراز دیہاتوں میں بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔

جب ڈالر کا مسئلہ حل ہوگیا تو اگلا معاملہ اسے خرچ کرنے کا ہے۔ انہیں نہ ہماری طرح اولاد کے لیے کچھ چھوڑ کر جانا ہوتا ہے نہ برے وقت کے لیے بچت کرنی ہوتی ہے اس لیے یہ جو کچھ کماتے ہیں اپنی ذات پر خرچ کرتے ہیں اور بہت کھل کر کرتے ہیں۔ مغربی معاشرہ صارف کا معاشرہ کہلاتا ہے۔ ان کے ہاں اگر بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز بنتے اور چلتے ہیں تو اس کا راز یہی ہے کہ خریدار بھی ہیں اور ان کی جیب میں ڈالر بھی ہیں۔ ایک اور چیز میں نے دیکھی کہ یہاں مکان بالعموم بہت سادہ ہوتے ہیں۔ گو ان میں سہولتیں ساری ہوتی ہیں مگر ہمارے ہاں جیسی غیر

ضروری آرائش نہیں ہوتی۔جن کے پاس پیسہ زیادہ ہے بہرحال وہ یہ آرائش بھی کرتے ہیں۔مگر ان کی پہلی ترجیح اپنی سہولیات،تفریحات اورضروریات پرخرچ کرنا ہوتا ہے۔ ہفتے بھر کی تھکن کے بعد دو دن خوب تفریح کرتے ہیں۔ان کی ایک بہت بڑی تفریح سیاحت ہے۔ ہر سال گرمیوں میں کہیں نہ کہیں سیاحت پرضرور جاتے ہیں۔اپنی ذات پرخرچ کرنے کے لیے ہر شخص کے پاس کافی پیسے ہوتے ہیں کیونکہ علاج مفت،تعلیم مفت،کھانا پینا سستا اور ہر مسئلے میں قرض دستیاب۔جو چاہیں کریڈٹ کارڈ پرخرید لیں۔

یہاں کی زندگی کی ایک اورخصوصیت انفرادیت (Individualism) ہے،یعنی ہر شخص اپنے اچھے برے کا خود ذمہ دار ہے۔ایک شخص اگر بالغ ہوگیا تو پھرکوئی نہیں جو اس کے کسی معاملے میں ٹانگ اڑائے۔وہ سیاہ کرے یا سفید کسی کوکوئی غرض نہیں۔ ہر شخص خود کماتا ہےاورخود خرچ کرتا ہے۔والدین اولاد کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتے۔میاں بیوی ساتھ رہتے ہیں تو گھر کا خرچہ تقسیم کرتے ہیں۔

کمزور طبقات کا تحفظ

یہاں کی ایک بڑی خوبی کمزوراورمحروم طبقات کے حقوق کا تحفظ ہے۔عورتیں، بوڑھے، بچے اورمعذوروں کے لیے غیرمعمولی تحفظات اورسہولیات ہیں۔ بزرگوں کے لیے ہرجگہ رعایتی ٹکٹ اورترجیحی نشستیں ہیں۔ان کے لیےخصوصی مراکز قائم کیے جاتے ہیں۔ان کو ماہانہ وظیفے بھی دیے جاتے ہیں۔بچوں کی تربیت یہاں اخلاقی فریضے سے بڑھ کر ایک قانونی ذمہ داری ہے۔جس میں معمولی درجے کی کوتاہی کے نتیجے میں پولیس مداخلت کرتی ہے۔ بچے کو ذہنی، جسمانی یا نفسیاتی کسی بھی اعتبار سے ضرر پہنچایا جائے تو قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ میں بعض اوقات سوچتا تھا کہ یہ قانون اگر ہمارے ہاں نافذ ہوجائے تو ۹۹ فیصد والدین اندر ہوجائیں

گے۔بچوں کی پرورش کے لیے والدین کووظیفہ دیا جاتا ہے۔لائبریری وغیرمیں مفت کھلونے بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔

خواتین کے تحفظ کے لیے بھی یہ معاشرہ بڑا احساس ہے۔بچوں کی طرح انہیں بھی کوئی ذہنی، جسمانی یا جنسی ضرر پہنچایا جائے تو پولیس کیس بن جاتا ہے۔ٹیلیفون ڈائرکٹری کے شروع میں وہ نمبر نمایاں طور پر لکھے ہوتے ہیں جن کے ذریعے بچے اور خواتین فوری طور پر مدد حاصل کر سکتے ہیں۔911 کی سہولت تو موجود ہی ہے۔رات کے وقت خواتین بسوں کو اپنے مقررہ اسٹاپ کے علاوہ بھی رکواسکتی ہیں تا کہ با آسانی گھر پہنچ سکیں۔معذوروں کے لیے بھی ہر جگہ انتظامات مہیا ہیں۔انہیں خصوصی وظیفہ بھی ملتا ہے اس کے علاوہ ہر جگہ بہت سی دیگر سہولیات بھی فراہم کی جاتی ہیں مثلاً بس میں اگر بیٹھنا ہو تو ڈرائیور سیٹ سے اٹھ کر پیچھے آتا ہے اور بس میں ان کی نشست سیٹ کرتا ہے۔پھر ان کی وہیل چیئر اوپر چڑھتی ہے۔

اخلاقی حالات

جہاں تک اخلاقی پہلو کا تعلق ہے مغربی سوسائٹی بعض اعتبارات سے ہمارے لیے بھی باعث رشک ہے اور بعض اعتبارات سے جانوروں کے لیے بھی باعثِ شرم۔یا یہ کہہ لیں کہ جسے ہم لوگوں کے ساتھ معاملات کہتے ہیں اس میں یہ لوگ ہم سے کہیں بہتر ہیں۔البتہ صنفی اخلاقیات میں، باوجوہ، یہ لوگ بہت نیچے گر گئے ہیں۔پہلی چیز کے اعتبار سے ان کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانیت سب سے بڑی چیز ہے اور سب کی بقا میں اپنی بقا ہے۔یہاں لوگ ذاتی فائدے کی بنیاد پر زندگی ضرور گزارتے ہیں مگر اجتماعی مفاد سے بھی پہلو تہی نہیں کرتے۔وہ اعلیٰ انسانی صفات جو کبھی ہماری میراث تھیں اب ان کے ہاں پائی جاتی ہیں۔یہ ایک باشعور معاشرہ ہے جس میں نظم وضبط، تحمل اور رواداری جیسی عمدہ صفات اعلیٰ ترین درجے پر پائی جاتی ہیں۔اعلیٰ

انسانی اقدار کی پابندی ان کے ہاں ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے یہ لوگ ناجائز ذرائع استعمال نہیں کرتے۔ رشوت اور بدعنوانی بڑی سطح پر ہوسکتا ہے ہوتی ہو مگر عام لوگوں کی سطح پر نہیں۔ یہ لوگ کسی کام کو حقیر نہیں سمجھتے۔ جو کام کرتے ہیں محنت سے کرتے ہیں۔ اپنے فرائض ذمہ داری، خوش اسلوبی اور دیانت داری سے پورے کرتے ہیں۔ لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔

اس کے ساتھ ان کی زندگی میں وہ تمام خرابیاں بھی ہیں جو مادیت اور انکارِ خدا و آخرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ تاہم جو سب سے تباہ کن مسئلہ اس سوسائٹی کو درپیش ہے وہ یہ کہ انسانوں کی تربیت کا بنیادی ادارہ یعنی خاندان بہت کمزور ہو چکا ہے۔ اس پر کچھ گفتگو میں پچھلے باب میں کر چکا ہوں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان بچوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور جب یہی بچے آگے چل کر بڑے ہوتے ہیں تو معاشرے کے لیے مسئلہ بن جاتے ہیں۔ نیو یارک میں ایک مقامی امریکن خاتون سے بات ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ امریکی معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ نوجوانوں میں بڑھتا ہوا تشدد کا رجحان۔ اس رجحان کے پیچھے کارفرما ایک اہم عامل خاندانی نظام کی کمزوری بھی ہے۔

جنسی بے راہروی اور اس کے اسباب

خاندانی نظام کے ٹوٹنے کا بنیادی سبب جنسی بے راہروی ہے۔ اور یہی مغرب کے معاشرے کا سب سے کمزور مقام ہے۔ اس معاملے میں کونسی ایسی حد ہے جو ان لوگوں نے نہیں توڑ ڈالی۔ جو معاشرہ ہم جنس پرستی کو اعلانیہ اپنا چکا ہو اس کے پاس پستی میں گرنے کے لیے اور کچھ نہیں بچتا۔ تاہم یہ جنسی بے راہروی اتفاقیہ طور پر پیدا ہونے والی چیز نہیں۔ حیا انسانیت کی بڑی بنیادی قدر ہے۔ اگر کوئی معاشرہ حیا کو چھوڑ کر بے حیائی کو قدر بنالیتا ہے تو اس کے پیچھے بڑے گہرے اسباب ہوتے ہیں۔ مغربی معاشرے میں اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس کے بھی کئی

اسباب ہیں۔

پہلا سبب وہی مادیت کی سوچ ہے جس کے نزدیک ہر وہ چیز جس سے کسی فرد کو کوئی مادی نفع یا مزہ حاصل ہوتا ہے اس کا حصول فرد کا بنیادی حق ہے۔ یہ وہ چیز تھی جس نے جنسی بے راہروی کے خلاف معاشرے اور قانون کی گرفت کو ختم کیا۔ اور ان تمام کاروباروں کو تحفظ فراہم کیا جو انسان کے سفلی جذبات سے کھیل کر پیسہ کماتے ہیں۔ قانون اور معاشرے سے پہلے جو چیز انسانوں کو اس دلدل میں جانے سے روکتی ہے وہ اس کے اندر کی رکاوٹ ہے جسے ہم شرم یا حیا کہتے ہیں۔ اس اندرونی رکاوٹ کو کمزور (میں ختم اس لیے نہیں کہہ رہا کہ اسے ختم کرنا ممکن نہیں) کرنے کا فریضہ فرائڈ کے علم النفسیات پر کام نے سرانجام دیا۔ میں اس کام کی تفصیل میں نہیں جارہا کیونکہ یہ بہت سے قارئین کے اوپر سے گزر جائے گی۔ مختصر یہ سمجھئے کہ اس نے انسان کے لاشعور کو بھڑکتے ہوئے جنسی جذبات کی بھٹی قرار دے دیا۔ جسے قابو میں کرنے کے لیے معاشرے نے ضمیر، اقدار اور اسی طرح کے دیگر پولیس مین ایجاد کر لیے۔ لہٰذا جب انسان کی اصل ہی نفسانی خواہش قرار پائی اور دیگر اقدار مصنوعی رکاوٹ تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

اس کے ساتھ دیگر ایسے متعدد اسباب تھے جن سے مغربی معاشرے میں عریانی اور جنسی بے راہروی کی فضا عام ہوتی چلی گئی۔ صنعتی دور میں افرادی قوت کی طلب کو پورا کرنے کے لیے عورتوں کو گھر سے باہر آنا پڑا۔ دو عظیم جنگوں میں بڑی تعداد میں مرد ہلاک ہوئے تو عورتیں مزید آگے آئیں۔ مرد وزن کے بے حجابانہ اختلات کا ماحول عام ہوا۔ کاروباری مسابقت کی بنا پر اشیا کی فروخت کے لیے عورتوں کو استعمال کیا جانے لگا۔ خود عورتوں کو احساس ہوا کہ ان کا جسمانی حسن ایک اثاثہ ہے جسے وہ استعمال کر سکتی ہیں۔ انہوں نے اسے خوب استعمال بھی کیا۔ شوبز کی ترقی نے اس رجحان کو مزید فروغ دیا۔ جو نیا میڈیا ایجاد ہوتا اس کے پھیلنے کی سب سے آسان

اور تیز صورت یہ تھی کہ انسانوں کے سفلی جذبات کو بھڑکایا جائے۔ رسالوں، فلموں، ٹی وی اور اب انٹرنیٹ، ہر ایک کی مقبولیت میں عریاں مواد کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر وہ ماحول پیدا کر دیا جو آج مغرب میں موجود ہے۔ اور جس کے لازمی نتیجے کے طور پر خاندان کا ادارہ تباہ ہو رہا ہے۔

خوشی اور غم

نیویارک میں میرا تین دن کا قیام پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ یہاں تک کہ روانگی کا دن آ گیا۔ فہیم بھائی نے آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ میری فلائیٹ رات نو بجے کی تھی۔ ہم پانچ بجے ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے جانے پر نگہت باجی بہت رو رہی تھیں۔ میں ان کی خوشی کے لیے اپنا سفر بیچ میں منقطع کر کے خاص طور پر نیویارک میں رکا تھا۔ ان کی وجہ سے میں بھی بہت اداس ہو گیا۔ دوسری طرف میری بیوی جدہ میں میری منتظر تھی۔ خوشی و غم کا یہ منظر چند ماہ قبل بالکل برعکس تھا۔ اس وقت میری بہن بہت خوش تھیں اور بیوی بہت اداس۔ زندگی اسی خوشی اور غم کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ یہاں تک کہ مسافر قبر کی منزل تک جا پہنچے گا جو ابدی زندگی کی پہلی منزل ہے۔ پھر قیامت کا صور پھونکا جائے گا۔ پھر حشر برپا ہو گا۔ پھر حساب، میزان، پلِ صراط اور نہ جانے کس کس مرحلے سے گزر کر کوئی مسافر خدا کی اس جنت میں داخل ہو سکے گا جس میں کوئی کھونا نہیں کوئی بچھڑنا نہیں۔ جہاں کوئی غم نہیں کوئی پچھتاوہ نہیں۔ جہاں کوئی محفل برہم نہیں ہو گی اور کوئی ساتھ ختم نہیں ہو گا۔ یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ یہاں کا ملنا کوئی ملنا نہیں اور یہاں کی جدائی کوئی جدائی نہیں۔ یہاں کا پانا کوئی پانا نہیں اور یہاں کا کھونا کوئی کھونا نہیں۔ یہاں صرف امتحان ہوتا ہے۔ کبھی لے کر کبھی دے کر۔ کبھی محرومی سے کبھی بخشش سے۔ لوگ اس بات کو جان لیں تو رونا چھوڑ دیں۔ لوگ اس بات کو جان لیں تو ہنسنا چھوڑ دیں۔

میں یہ سطور نیویارک کے جے ایف کینیڈی ایئر پورٹ پر بیٹھا تحریر کر رہا ہوں۔فہیم بھائی ایئر پورٹ تک مجھے چھوڑنے آئے تھے۔پچھلی دفعہ کی طرح اب بھی انہوں نے میرا بہت خیال رکھا تھا۔ان سے گلے مل کر میں ایئر پورٹ سیکیورٹی میں داخل ہوا۔سعودی ایئر لائنز کے کاؤنٹر پر جا کر بورڈنگ کرائی۔ پھر ویٹنگ لاؤنج میں آ گیا۔جیب کھنگالی تو ایک کوارٹر نکل آیا۔بہن کو فون کر کے ایک دفعہ پھر بات کر لی۔اور اب انتظار کر رہا ہوں کہ کب جہاز میں بورڈنگ شروع ہوتی ہے۔اس سرزمین سے روانگی کے موقع پر بے اختیار ناصر کاظمی کی ایک غزل یاد آ رہی ہے۔ چلتے چلتے وہ بھی سنتے جائیں۔

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

یہ کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

خاکِ مدینہ وحرم

خوابوں کی سرزمین

میں مغربی تہذیب کے مرکز میں کئی مہینے رہا۔ میرا یہ سفر ایک طالب علم کا سفر تھا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو پہلے ایک نقطۂ نظر قائم کر لیتے ہیں اور پھر جو چیز اس کے خلاف سامنے آئے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ میں نے مغرب میں جو خوبیاں دیکھیں کھلے دل سے ان کا اعتراف کیا اور جو خامیاں نظر آئیں انہیں بیان کرنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ تاہم یہاں سے روانگی کے وقت میرے دل کی وہی کیفیت تھی جس میں ڈوب کر اقبال نے اپنا یہ شعر کہا تھا۔ میں اس میں ذرا سی لفظی ترمیم حسبِ حال کر رہا ہوں۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ ''رونق''ِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و''حرم''

حرمین سے میرا تعلق وہ بھی ہے جو ہر مسلمان کا ہوتا ہے اور وہ بھی جو بالکل ذاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن اسی صحرا کی چھاؤں میں گزارے ہیں۔ جب وقت کی تپتی دھوپ نے میرے وجود کو جھلسا دیا تو خدا نے اسی مبارک زمین کو میرے لیے سائبان بنایا تھا۔ یہ دھرتی میرے جسم ہی کے لیے نخلستان نہ تھی بلکہ میری روح کے لیے بھی ایک چھاؤں بن گئی۔ آج میں اسی سائبان کی طرف واپس لوٹ رہا ہوں۔ یہ میری خوابوں کی سرزمین ہے جن کی تعبیر ایک دفعہ

پھر مجھے بلا رہی ہے۔

سعودی ایئر لائن

نیویارک سے میرا جہاز وقتِ مقررہ پر اڑا۔ جہاز کی کھڑکی سے میں نے شہر پر الوداعی نظر ڈالی۔ کافی دیر تک جہاز ریاستِ نیویارک کی روشنیوں کے ساتھ ساتھ پرواز کرتا رہا۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں تو میں نے کھڑکی سے نگاہ ہٹالی۔

میں نے سعودی ایئر لائنز میں بہت زیادہ سفر کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں جدہ میں جس کمپنی میں کام کرتا تھا اس کی شاخیں ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں وہاں جہاز کے ذریعے آتا جاتا تھا۔ اس ایئر لائن کی سروس بین الاقوامی معیار کی کسی ایئر لائن کی طرح تو نہ تھی لیکن پی آئی اے سے کافی بہتر تھی۔ کھانے کا معیار اچھا تھا مگر سعودی انداز کا کھانا مجھے پسند نہ آیا۔ میں نے سلاد پر ہی اکتفا کیا۔ رات میں سونے کے لیے آنکھوں پر چڑھانے والا کور (Cover)، پیروں پر پہننے کے لیے موزے، ٹوتھ برش اور ٹوتھ پیسٹ ایک خوبصورت سی تھیلی میں دیے گئے۔ تاہم سونے کے لیے ایک دفعہ پھر مجھے نیند کی گولی لینی پڑی۔

اسی سفر میں میں نے زندگی کی سب سے مختصر رات دیکھی۔ جہاز میں رات 10 بجے عشا پڑھی اور اس کے صرف تین گھنٹے بعد فجر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جہاز مغرب سے مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ جہاز میں نماز کے لیے الگ سے ایک مخصوص جگہ بنی ہوئی تھی۔ جہاں چھ سات آدمی بیک وقت نماز پڑھ سکتے تھے۔ یہ سہولت دنیا کی کسی اور ایئر لائن میں دستیاب نہیں۔ جہاز مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ عام طور پر میں نے سنا تھا کہ سعودی خواتین ملک سے باہر پردہ نہیں کرتیں۔ تاہم اس وقت بیشتر خواتین برقعے میں تھیں۔ البتہ کچھ نے برقع نہیں پہن رکھا تھا اور بعض کا صرف چہرہ کھلا تھا۔ میرے برابر والا سعودی نوجوان ساتھ بیٹھی خاتون سے

مسلسل گفتگو کر رہا تھا۔ ان کا اندازِ گفتگو بتا رہا تھا کہ وہ محرم نہیں۔ ویسے کوئی آدمی کسی محرم خاتون سے اتنی دیر تک گفتگو کر بھی نہیں سکتا۔

قیدی کا استقبال

جہاز بارہ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد جدہ پہنچا۔ ایئر پورٹ پر ایجنٹ کا عملہ موجود تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں اس ٹریول ایجنٹ کے نام کی تختی اٹھا رکھی تھی جس سے میں نے ٹورنٹو میں پیکج خریدا تھا۔ ان میں ایک پاکستانی لڑکا تھا۔ اس کا نام نوید تھا۔ دوسرے صاحب عرب تھے۔ یہ لوگ مجھے سیدھے حرم لے جانے پر بضد تھے۔ اسی اثنا میں گھر والے آتے ہوئے نظر آئے۔ سب لوگ میرے لیے گلدستے لائے تھے۔ بھابی نے میرے لیے کھانے کا بہت اہتمام کیا تھا مگر انہیں علم نہ تھا کہ مجھے سیدھا حرم لے جایا جائے گا۔ اس سے قبل جب بھی کوئی عمرے کے لیے آتا تو ہم لوگ اسے پہلے اپنے گھر لے جاتے تھے۔ پھر کھانا کھلا کر اور تھوڑا آرام کرا کے مکہ لے کر جاتے۔ مگر اب عملی طور پر میری حیثیت ایک قیدی کی سی تھی۔ میں مجبور تھا کہ سیدھا ایجنٹ کے عملے کے ساتھ جاؤں۔ میں نے ان لوگوں کو بتا دیا کہ میں اپنی اہلیہ کو مکہ لے جانا چاہتا ہوں اس لیے مجھے آپ کے ہوٹل کی ضرورت نہیں۔ مگر انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہم ہوٹل والے سے بات کرتے ہیں اگر اسے کوئی اعتراض نہیں تو ہم آپ کی اہلیہ کو بھی آپ کے ساتھ ٹھہرا دیں گے کیونکہ کمرہ دو بیڈ کا ہے۔

مجھے مکہ پہنچانے کے لیے ایک گاڑی موجود تھی۔ گاڑی والے نے مجھے آفر کی کہ گاڑی بڑی ہے، میں چاہوں تو اپنے سارے گھر والوں کو ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ یہ لوگ بھی میرے ساتھ جانا چاہ رہے تھے اس لیے ہم سب مل کر حرم کی طرف روانہ ہوئے۔ البتہ میرے بڑے بھائی رضوان نے کہا کہ وہ کل میرے کپڑے وغیرہ لے کر آ جائیں گے۔

حرم کا نقشہ

ہماری گاڑی مکہ کی سمت روانہ ہوئی۔ گاڑی میرے جانے پہنچانے راستوں پر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں حالتِ احرام میں تھا۔ جہاز میں میقات کے مقام پر میں نے واش روم جا کر احرام پہن لیا تھا اور تلبیہ پڑھ کر عمرے کی نیت کر لی تھی۔ میں راستے بھر تلبیہ کے الفاظ دہراتا رہا:

لبیک اللھم لبیک۔لبیک لا شریک لک لبیک
ان الحمد والنعمة لک و الملک۔لا شریک لک

حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔
بے شک ہر نعمت اور تعریف تیری ہے اور بادشاہی بھی۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

تقریباً ایک گھنٹے میں، مغرب سے ذرا پہلے ہم ہوٹل پہنچے۔ کمرے میں جا کر وضو وغیرہ کیا۔ یہ ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا کمرہ تھا۔ پھر ہم نے حرم کا رخ کیا۔ راستے میں مغرب کی نماز نکل گئی کیونکہ ہوٹل سے حرم کافی فاصلے پر تھا۔ اس وقت تو میں جوش میں تھا اس لیے خیال نہیں کیا کہ یہ ہوٹل کتنی دور ہے۔ مگر اگلے دن جب 50 ڈگری سے زیادہ گرمی میں پیدل چلنا پڑا تو اندازہ ہوا کہ ان لوگوں نے مجھے ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا ہے جو حرم سے ڈیڑھ دو کلومیٹر دور ہے۔ ہم میاں بیوی اگلے ایک ہفتے تک درد کی گولیاں کھاتے اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے روزانہ یہ مارچ کرتے رہے۔

چلتے چلتے ہم مسفلہ اسٹریٹ پر پہنچے۔ سعودی عرب میں اپنے قیام کے دوران میں اکثر اس طرف واقع ہوٹلوں میں آکر ٹھہرتا تھا۔ یہاں سے حرم جاتے ہوئے مسجد الحرام کا سب سے مکمل اور دلکش منظر نظر آتا ہے۔ اس وقت بھی دور سے باب عبدالعزیز کے دو بلند و بالا مینار اور ان کے عقب میں نظر آنے والے باب فتح کے دو اور قصر الصفا کی طرف کا ایک مینار نمایاں نظر آرہے تھے۔ سفید و سیاہ سنگ مرمر کی بنی ہوئی حرم پاک کی شاندار عمارت رات کی روشنیوں میں بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ اس منظر کا حسن اپنے اندر وہ کشش رکھتا ہے کہ انسان زندگی بھر اس کو فراموش نہ کرسکے۔ حرم کا ایسا منظر کہیں اور سے نظر نہیں آتا۔

شہنشاہ کے حضور

مسفلہ اسٹریٹ ختم ہوئی تو حرم کا بڑا سا فرش آ گیا۔ اسے عبور کر کے ہم مسجد کے اس حصے میں داخل ہوئے جسے شاہ فہد کے دور میں تعمیر کیا گیا ہے۔ ایسا لگا کہ ہم آگ کی بھٹی سے نکل کر ٹھنڈ کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے ہوں۔ یہ مسجد کا واحد حصہ ہے جو مکمل طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہے۔ یہاں آکر ایک طرف جسم کو گرمی سے نجات مل گئی اور دوسری طرف خدا کے گھر میں داخلے کے احساس نے وجود کی گہرائیوں میں اطمینان وسکون کی لہر دوڑادی۔ ہم لوگوں نے نماز یہیں ادا کی۔ یہاں سے میرے سسرال والے الگ ہو گئے اور میں اپنی اہلیہ کے ساتھ مطاف کی طرف بڑھ گیا۔ نئی تعمیر سے گزر کر ہم مطاف سے قبل واقع ترکی دور کے تعمیر شدہ حصے میں داخل ہوئے۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ اس دنیا میں گنہگاروں کے سر جھکتے ہیں۔ بہت جلد وہ وقت آرہا ہے جب ان کے گلے میں طوق اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی اور ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جائیں گے۔ پروردگار عالم کے غضب کا عالم یہ ہوگا کہ ہر شخص نفسی نفسی پکارتا ہوگا۔ خدا جب پوچھے گا: ''این الجبارون ، این المتکبرون، این الملوك الارض ؟ (کہاں ہیں طاقتور، کہاں

ہیں بڑے بننے والے، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟)''، تو ہر بادشاہ، ہر صاحبِ حیثیت اور ہر طاقتور خون کے آنسو روئے گا اور چیخ چیخ کر کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا کاش میں مٹی ہوتا۔ اس روز جب پوچھا جائے گا: ''لمن الملك اليوم (آج بادشاهی کس کی هے؟)''، ہر شے پکار اٹھے گی: ''لله الواحد القهار (تنہا غالب ہو کر رہنے والے اللہ کی)''۔ اس دنیا میں انسانوں نے صرف خدا کا نام سنا ہے۔ انہیں اندازہ نہیں وہ کس قدر بلند ہستی ہے۔ جس روز اس کے جلال کا ظہور ہوگا مجرموں کی خواہش ہوگی کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

مگر یہ جگہ جہاں میں موجود تھا ایک ذریعہ ہے جس سے انسان خدا کا پروانۂ امان، اُس وقت کے آنے سے قبل، طلب کر سکتا ہے۔ ویسے تو وہ ہر جگہ موجود ہے لیکن اس جگہ کو اس نے اپنا گھر قرار دیا ہے۔ عزت والوں کا دستور ہوتا ہے کہ گھر آنے والوں کا اکرام کرتے ہیں۔ ان کی کسی درخواست کو رد نہیں کیا جاتا۔ یہ اللہ کا گھر ہے جسے اس نے انسانوں کے لیے پہلی عبادت گاہ بھی بنایا ہے۔ اس کی حرمت قائم کی ہے۔ قیامت تک کے لیے اسے اپنے عابدین کا قبلہ، مجاہدین کا مرکز اور محبوبین کا مقصود بنایا ہے۔ کائنات میں خدا کی تجلیات کا سب سے بڑا ظہور یہیں ہوتا ہے۔ اس جگہ آکر سر، آنکھیں، گردن، دل، دماغ سب جھک جانے چاہئیں۔ محبوب آقا کے حضور دیدہ و دل فرشِ راہ ہونے چاہئیں۔ پورے وجود پر عجز و بے کسی طاری ہونی چاہیے۔ یہ اس شہنشاہ کا دربار ہے جو نگاہوں کی خیانتوں اور سینوں میں پوشیدہ رازوں کو بھی جان لیتا ہے۔ یہاں جس نے اپنے عمل کو کافی سمجھا وہ برباد ہوگیا۔ جس نے اپنی خطا کو حقیر سمجھا وہ تباہ ہوگیا۔ جس نے خود کو باحیثیت سمجھا وہ بے مقام ہوگیا۔ یہاں انسان کو صرف ایک مقام زیب دیتا ہے۔ غلام ابن غلام ابن غلام۔

میں حسبِ عادت مطاف کی سیڑھیوں سے قبل رکا اور نگاہیں اٹھا کر بیت اللہ کو دیکھا اور

دیکھتا رہ گیا۔ دنیا میں حسن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ لیکن حسن و سادگی اور جمال و جلال کا جو امتزاج اس چار دیواری میں ہے، کہیں اور نہیں۔ سنتے ہیں کہ کعبہ پر ڈالی گئی پہلی نگاہ کی ہر دعا قبول ہوتی ہے۔ یہ بات درست نہ بھی ہو تب بھی میں ہمیشہ اس موقع پر کوئی نہ کوئی دعا ضرور مانگتا ہوں۔ اس وقت بھی مانگی۔ پھر آہستہ آہستہ مطاف سے گزرتا ہوا حجر اسود کے سامنے آیا۔ کالی پٹی پر کھڑے ہوکر دعا اور استلام کے ساتھ طواف کا آغاز کیا۔ ہجوم میں مخالف گھڑی وار (Anti-Clockwise) چلتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔ یا جیسے یہاں وقت ہوتا ہی نہیں۔ ازلی مسافروں کی یہ کوئی ابدی منزل ہے جہاں وقت نہیں گزرتا بس پہر بدل جاتے ہیں، لوگ بدل جاتے ہیں لیکن وقت کا دھارا وہیں کھڑا رہتا ہے۔ دوران طواف لوگ بہت کچھ کرتے ہیں۔ مگر میں صرف دو کام کرتا ہوں۔ دعا یا تسبیح۔ اس جگہ انسان کو یا تو وسیع تر کائنات کا حصہ بن جانا چاہیے جو ہر آن خدا کی تسبیح کرتی ہے یا پھر ایک سخی داتا ان داتا کے حضور پیش ایک محروم بھکاری۔ میں یہاں ایک عربی دعا اکثر کیا کرتا ہوں۔ اس کا اردو مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ ہم نے تیری پسندیدہ ترین چیز یعنی تجھے ایک ماننے میں تیری اطاعت کرلی اور تیری ناپسندیدہ ترین چیز یعنی شرک میں تیری نافرمانی نہیں کی۔ مولا جو ان دونوں کے بیچ میں ہم سے ہو گیا ہے تو اسے معاف کردے۔

طواف سے فارغ ہوکر میں نے اہلیہ کو ان کے گھر والوں کے پاس بھیج دیا کیونکہ انہیں عمرہ نہیں کرنا تھا اور خود ملتزم سے آکر لپٹ گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے حضور راز و نیاز کیا کرتے تھے۔ میں یہاں پہنچا تو یوں لگا کہ جیسے میں خدا سے ملاقات کے لیے آیا ہوں۔ وہاں بہت لوگ کھڑے تھے۔ مگر سب ایک دوسرے کے لیے غیر موجود۔ سب ایک دوسرے سے لاتعلق۔ وہاں انسان تھا یا خدا۔ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ میں بھی خلوت میں چلا گیا۔ اس

دوران پتا نہیں کیا کچھ ہوا۔ میرے لیے تو کچھ نہ رہا تھا۔ جو رہی تو بے خبری رہی۔ جب وہاں سے ہٹا تو محسوس ہوا کہ بہت سارا گند بہت ساری بارش کے ساتھ بہہ گیا ہے۔

دو نوافل ادا کرنے کے بعد سعی کے آغاز کے لیے میں نے صفا کا رخ کیا۔ یوں تو پورے حرم پاک کو سیدنا ابراہیمؑ کے خانوادے سے خصوصی نسبت ہے مگر سعی کا عمل راہِ خدا میں ان کی قربانیوں کی عظیم ترین یادگار ہے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی جس طرح خدا کی فرمانبرداری اور اسکے دین کی خدمت میں گزاری اس کا بدلہ بھی خدا نے آپ کو ایسا ہی دیا۔ آپ ابوالانبیا اور امام الناس قرار پائے۔ تمام حاملینِ کتاب آپ کو اپنا رہنما تسلیم کرتے ہیں۔ جو شخص بھی شعور و احساس کے ساتھ سعی کے عمل سے گزرے گا وہ یقیناً خود کو آپ کی آفاقی نسل کا ایک حصہ محسوس کرے گا۔ میں سعی کے دوران دعاؤں میں مشغول رہا۔ خدا کی رحمت بہت بڑی ہے۔ اس سے حسنِ ظن رکھنا چاہیے کہ جو اس نے اپنے نیک بندوں کو ان کی بے انتہا قربانیوں کے صلے میں عطا کیا تھا، اس کا کوئی حصہ وہ اپنے محبوبوں کی بھونڈی نقل کرنے والوں کو بھی ضرور عطا کرے گا۔

حج وعمرہ: ایک علامتی عمل

عمرے کا آخری عمل قصر یا حلق کرانا ہے۔ یعنی بال کٹوانا یا گنجا ہونا۔ یہ پرانے زمانے کی ایک رسم تھی جس کے تحت لوگوں کو غلام بناتے وقت گنجا کر دیا جاتا تھا۔ گویا عمرے کے بعد اس عمل سے گزرنے والا خود کو اپنے رب کی غلامی میں دینے کا اعلان کرتا ہے۔ یہی کیا حج وعمرے کا ہر رکن ایک علامتی حیثیت رکھتا ہے۔ میں شرک کے تذکرہ میں پچھلے باب میں نقل کر چکا ہوں کہ محسوس پرستی انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ اسی بنا پر ہر دور میں انسان شرک کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ انسان کا دل چاہتا ہے کہ کوئی ہو جس سے وہ لپٹ کر روئے۔ جسے دیکھ کر اس کا دل عظمت و احترام سے بھر جائے۔ جس کے گرد وہ چکر لگائے۔ جسے وہ چھو سکے، دیکھ سکے، محسوس کر سکے۔ جو

اس کے احاطۂ خیال میں آسکے۔ جبکہ اسلام جس خدا کی طرف بلاتا ہے وہ نظر ہی نہیں آتا۔ یہ رکنِ اسلام اور بیت اللہ انسان کے اسی جذبے کی تسکین کا سامان ہیں۔ چنانچہ خدا نے ایک جگہ بنائی جسے اپنا گھر قرار دے دیا۔ پھر اس نے مسلمانوں کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ اور جو کسی عذر کے بغیر اس گھر میں خدا سے ملنے نہیں آتا خدا نے اس سے آخری حد تک بیزاری کا اعلان کیا ہے (آلِ عمران 3:97)۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو شخص نظر آنے والے خدا میں بھی دلچسپی نہیں رکھتا اسے ان دیکھے خدا سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ خدا کو بھی اس کی کوئی پروانہیں ہوتی۔

احرام باندھنا اس بات کا اظہار ہے کہ بندہ ناگریز انسانی ضرورتوں کو چھوڑ کر ہر مادی چیز سے دامن چھڑا رہا ہے۔ اور رب سے ملاقات کے روحانی سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔ تلبیہ پڑھنا اور بار بار پڑھنا اس امر کی یاددہانی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے رب کی نعمتوں کے اعتراف میں اس کے ہر غیر سے کٹ کر اس کی طرف آرہا ہے۔ یہ دو اعمال بندے کو اس عظیم عبادت کے لیے ذہناً تیار کرتے ہیں جو حرم میں شروع ہوتی ہے۔ حجر اسود کا استلام خدا کے داہنے ہاتھ پر بوسہ لے کر عہد وفاداری کا ہم معنی ہے۔ پرانے زمانے میں بیعت کا یہی طریقہ رائج تھا۔ طواف اپنے محبوب کو اپنی زندگی کا مرکز بنالینے کے ہم معنی ہے۔ شمع و پروانے کی حکایت سے کون واقف نہیں۔ طواف اسی کا دوسرا نام ہے۔ ملتزم پر بندہ خود کو رب کی چوکھٹ پر محسوس کرتا ہے جہاں وہ اپنے مالک کے قدموں میں سر رکھ کر گڑ گڑاتا ہے۔ سعی کا عمل سیدنا ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے اس عظیم مشن میں شامل ہو کر جدو جہد کرنے کے ہم معنی ہے جس کا آغاز آپ نے اس بے آب و گیاہ صحرا میں کیا تھا۔

حرم میں بدنصیبی کے مظاہر

میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ کوئی فلسفیانہ حکایت نہیں۔ جس کسی کو کبھی حرم جانے کا موقع ملا ہے

وہ ان سب باتوں سے بخوبی واقف ہے۔ ذرا سا دھیان خدا کی طرف ہو تو آدمی پر یہ ساری کیفیات خود بخود طاری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اگر کوئی کیفیت طاری نہ ہو اور انسان خدا سے لو ہی لگا لے تب بھی یہاں سے بامراد لوٹے گا۔ تاہم کچھ بدنصیب وہ ہوتے ہیں جن کی بدبختی پر حرم مہرِ تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔ ان میں پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جن کا مرض بین الاقوامی ہے یعنی چپلیں چوری کرنا۔ ایک عرصے تک تو میں یہی سمجھتا رہا کہ غلطی سے ایسا ہوتا ہے۔ مگر جب بہت احتیاط سے تھیلی کے اندر رکھی ہوئی چپلیں بھی غائب ہوئیں تو احساس ہوا کہ کچھ غلطی سے ہوتا ہے اور کچھ جان بوجھ کر۔ خیر اس صورت حال کا حل یہ نکالا کہ جب کبھی چپلیں غائب ہوتی، میں اسے اپنی حاضری کے قبول ہونے کی علامت سمجھتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا کہ حاضری قبول ہو نہ ہو اس تصور سے چپلیں کھونے کا غم نہیں ہوتا تھا۔ دوسری چیز جس کی شاید بہت سے لوگوں کو توقع بھی نہ ہو وہ خواتین کو تنگ کرنا ہے۔ یہ مکروہ حرکت بالعموم رش کے وقت طواف میں کی جاتی ہے۔ اکثر خواتین یہ سمجھ کر خاموش رہتی ہیں کہ نادانستگی میں ایسا ہوا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اکثر مرد پوری توجہ سے طواف کر رہے ہوتے ہیں۔ خشوع وخضوع نہ سہی لیکن خدا کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی ناپاک حرکت کرنے کی ہمت عام آدمی میں نہیں ہوتی۔ یہ پتھر دل عادی مجرموں کا کام ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ خواتین رش میں گھسنے کی کوشش نہ کریں۔ مردوں سے دور رہ کر طواف کریں۔ حتی الامکان اپنے محرموں کے ساتھ طواف کریں کیونکہ اکیلی خاتون کو دیکھ کر بعض بدبخت پیچھے لگ جاتے ہیں۔ میری نصیحت یہ ہے کہ کبھی ایسا ہو اور کہیں بھی ہو تو بلا جھجک چیخ مار دینی چاہیے۔ بالکل نہیں ڈرنا چاہیے۔

تیسری چیز جیب کاٹنے کے واقعات ہیں۔ دورانِ طواف انتہائی ماہر جیب تراش گروہ کی صورت میں گھومتے رہتے ہیں اور جہاں موقع ملا کسی کا بھی پرس اڑا لیتے ہیں۔ جو پرس اڑاتا ہے

وہ فوراً کسی اور کو آگے پارسل کر دیتا ہے اور وہ تیسرے کو۔ وہ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ قریبی آدمی کو کوئی پکڑے تو اس کے پاس سے کچھ برآمد نہ ہو۔ ایسا ہی میرے بھائی رضوان کے ساتھ ہوا تھا مگر چونکہ وہ تین چار افراد کے ساتھ تھے اس لیے چور کو پکڑ لیا۔ اس سلسلے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس طرح صرف پیسے ہی نہیں کھوتے بلکہ پاسپورٹ اور دیگر قیمتی کاغذات بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ بات مکمل نہیں ہوگی جب تک میں آپ کو اپنی بیگم کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ نہ سناؤں۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے

خدا کو سجدہ کرنا بڑی بات ہے۔ پہلے زمانے میں اس کی قیمت اپنی جان دے کر چکانی پڑتی تھی۔ اس دور میں الحمدللہ ایسا نہیں ہوتا مگر بعض اوقات یہ قیمت دوسری شکلوں میں دینی پڑ جاتی ہے۔ ایک لطیفے میں یہ بات اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ایک صاحب جوتیاں آگے رکھے نماز پڑھ رہے تھے۔ کسی نے ان سے کہا کہ حضرت جوتیاں آگے رکھنے سے نماز نہیں ہوتی۔ ان صاحب نے جواب دیا کہ جوتیاں پیچھے رکھنے سے جوتیاں نہیں ہوتیں۔ اپنی شادی کے بعد پہلی مرتبہ میں بیگم کے ساتھ حرم آیا۔ انہوں نے شاید نماز نہ ہونے والی بات سن رکھی تھی۔ اس لیے نماز کے وقت جوتیاں پیچھے رکھیں۔ لیکن اپنا پرس آگے ہی رکھا کیونکہ اس سے نماز پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پہلی رکعت میں جب وہ پہلا سجدہ کر کے اٹھیں تو سجدہ ہو گیا مگر پرس نہیں رہا تھا۔ وہ غریب یہاں نئی تھی اس لیے یہ سمجھ کر کہ حرم سے پرس کیسے چوری ہو سکتا ہے، آگے پیچھے ہو گیا ہوگا، اطمینان سے نماز پوری کی۔ موصوفہ تو اس سانحے کے بعد رو دھو کر فارغ ہو گئیں مگر ان کی اس سادگی کے نتائج مجھے اور میرے سسر کو اگلے دو مہینے تک بھگتنے پڑے۔

جہاں ہر طرف منڈلاتے گدھ لوگوں کی محفوظ جیبوں کو نہیں چھوڑتے وہ زمین پر رکھے

ہوئے، ''دعوتِ گناہ'' دیتے پرس کو کیا چھوڑتے۔ پرس میں زیادہ رقم تو نہ تھی مگر اقامہ (سعودی عرب میں قیام کا اجازت نامہ) موجود تھا۔ ان کا نیا اقامہ بننے کی فیس، جو اس پرس کے ساتھ گیا تھا، تقریباً 53 ہزار پاکستانی روپے کے برابر پڑی۔ اس کے علاوہ پولیس رپورٹ اور دیگر خواری اپنی جگہ تھی۔ بہر حال ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیسوں اور چیزوں کے معاملے میں محتاط رہے اور اپنی جیب کے بجائے چیزیں احرام کی بیلٹ (Pouch) میں رکھے۔ اس کے علاوہ اگر جیب میں کچھ ہے تو بار بار اپنی جیب کو بھی چیک کرتا رہے۔

بھاگتے چور کی لنگوٹی

چوتھی چیز جو حرم میں معمول بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان سے آئے ہوئے بعض بدبخت وہاں موجود لوگوں کو کوئی فرضی دکھ بھری کہانی سنا کر ان سے رقم اینٹھتے ہیں۔ یہ کہانی کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہے کہ میں عمرہ کرنے پاکستان یا سعودی عرب کے کسی دوسرے شہر سے آیا ہوں۔ میرا پرس اور سامان چوری ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ یہ لوگ بالعموم گروہ کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ماں، بہن، بھائی، اولاد پوری فیملی ہوتی ہے۔ اکثر اوقات چوری کے کاغذی ثبوت یعنی پولیس رپورٹ بھی ساتھ لے کر گھومتے ہیں۔ اتنا پکا کیس بناتے ہیں کہ نئے آدمی کو کہیں بھی جھول نظر نہیں آ سکتا۔ پچھلے رمضان میں ایسی ایک فیملی کو میں 200 ریال دے چکا تھا۔ مگر اُس روز اسی جگہ بیٹھے بیٹھے جب دو مزید ایسے ہی کیس سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ یہ لوگ تو فراڈ ہوتے ہیں۔

اس دفعہ بھی میں جب عمرہ کر کے فارغ ہوا اور مروہ سے واپس حرم کی طرف جا رہا تھا تو احرام پہنے ایک لڑکا میرے پاس آیا اور پوچھا کہ آپ یہیں رہتے ہیں۔ میں نے کہا آپ کام بتاؤ۔ جواب میں اس نے تفصیلات کے معمولی فرق کے ساتھ اوپر والی کہانی دہرادی۔ میں

خاموشی سے سنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہوگیا تو میں نے کہا کہ نوجوان تم نے یہ تو پوچھ لیا کہ میں کہاں رہتا ہوں مگر یہ نہیں پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ میں تم جیسے لوگوں کو پکڑنے کی خصوصی ڈیوٹی پر ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے زور سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میں نے پولیس والوں کے انداز میں اس سے کہا کہ اپنا اقامہ نکالو۔ وہ بری طرح گھبرا گیا۔ کہنے لگا کہ میری امی کے پاس ہے۔ میں نے کہا کہ چلو پہلے تمہاری اماں کے پاس چلتے ہیں پھر دونوں کو جیل میں ڈالیں گے۔ اس کو اندازہ ہوگیا کہ آج وہ بہت برا پھنس گیا ہے۔ میری منت سماجت کرنے لگا۔ مگر میں اسے بھرپور سبق دینا چاہتا تھا تا کہ آئندہ خدا کے گھر میں دھوکہ دہی کا کام نہ کرے۔ جب اس نے دیکھ لیا کہ اب بچنے کی امید نہیں ہے تو کہنے لگا بھائی میرا ہاتھ چھوڑ دو تم جہاں کہو گے میں چلوں گا۔ میں نے جیسے ہی اس کا ہاتھ چھوڑا وہ کمان سے نکلے تیر کی طرح دوڑا اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ بھاگتے ہوئے وہ اپنے احرام کی چادر بھی چھوڑ گیا۔ جب جان کے لالے پڑے ہوں تو چادر کون دیکھتا ہے۔

بہرحال یہ چار چیزیں جو میں نے عرض کی ہیں۔ ان کے ضمن میں محتاط رہنا چاہیے۔ ان تمام کے بارے میں براہِ راست مجھے، میرے بھائیوں یا جاننے والوں کو بہت تلخ تجربات ہو چکے ہیں۔ میں نے سعودی عرب میں تین چار سال قیام کیا ہے اور الحمدللہ حرم میں بہت وقت گزارا ہے۔ اس لیے مجھے بہت سے ایسے معاملات کا علم ہے جو نئے آنے والوں کو بالکل نہیں ہوتا۔ میں نے کتنی دفعہ ایسی حرکتوں کے مرتکبین کو پولیس کے ہاتھوں پٹتے اور ان کے ستائے ہوئے لوگوں کو روتے دیکھا ہے۔ ان کے شر سے بچنے کا طریقہ احتیاط ہی ہے۔

حرم میں یاد رکھنے والی باتیں

میرے پیکج میں تین دن مکہ کی رہائش تھی اور تین دن مدینے کی۔ مگر مکہ میں میرا قیام پورے ایک ہفتے رہا۔ دراصل کینیڈا میں میں نے ایجنٹ کو بتا دیا تھا کہ میں آپ کے ہوٹل میں نہیں

ٹھہروں گا۔اس لیے ایجنٹ نے میرا سارا قیام مکہ کا رکھ دیا تھا۔اب یہاں آ کر ان لوگوں نے اہلیہ کو ساتھ رہنے کی اجازت دے دی اس لیے میں ان کے ہوٹل میں رک گیا۔جیسا کہ پیچھے عرض کیا کہ یہ ہوٹل حرم سے ڈیڑھ دو کلومیٹر دور تھا۔ جولائی اگست سعودی عرب کے گرم ترین مہینے ہوتے ہیں۔صحرا میں درجۂ حرارت 50 ڈگری تک بھی پہنچ جاتا ہے۔جبکہ شہروں میں پچاس کے آس پاس ہوتا ہے۔میرا قیام اگست کے پہلے ہفتے میں تھا۔ان حالات میں ہوٹل سے حرم تک جانا ایسا قیامت خیز مرحلہ تھا کہ حد نہیں۔ مجھے ان لوگوں نے ابتدا میں یہی بتایا کہ مکہ میں آپ کا قیام تین دن کا ہے۔ میں نے سوچا ایک دن گزر گیا ہے دو دن اور گزر جائیں گے۔تین دن کے بعد پتا چلا کہ سات دن کا قیام ہے۔اس طرح میں نے ساتوں دن اسی ہوٹل میں گزارے۔

میں قرآن سے بہت معمولی سہی مگر شد بد رکھتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ اس سفر میں انسان کو تکلیف دہ باتیں اور کئی طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔شیطان کی خواہش ہوتی ہے کہ آدمی کا ذہن ان مسائل میں الجھ جائے۔وہ غصے میں آ کر لوگوں سے لڑنے لگے۔ خدا کے گھر میں فساد برپا کرے تا کہ خدا کی کسی رحمت میں سے اسے کوئی حصہ نہ مل سکے۔کائنات کا سب سے بڑا بدنصیب وہ ہے جو خدا کے گھر آئے اور خدا کی رحمت کے بجائے اس کا غضب سمیٹ کر لوٹے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی بنا پر زائرین کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا ہے: ''حج کے مہینے معروف ہیں۔جو شخص ان میں حج کا عزم کرے اس کے لیے کوئی شہوانی رویہ، کوئی بدکرداری، کوئی لڑائی جھگڑا جائز نہیں''،(البقرہ2:197)۔

اس آیت میں لڑائی جھگڑے کے علاوہ دو چیزوں کا اور تذکرہ کیا گیا ہے۔ان میں سے ایک چیز فسق یعنی بدکرداری ہے۔یعنی انسان جب یہاں آئے تو اپنے ذہن، اپنی نیت، اپنے اعمال کو ہر اس چیز سے پاک کر دے جس میں اس کے رب کی نافرمانی کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا

ہو۔ یہاں وہ نیکی کا حریص بن کر آئے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو کم از کم گناہ سے ہی خود کو محفوظ رکھے۔ وگرنہ یہاں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ بہت سے لوگ یہاں کے تھکا دینے والے اور مشکل حالات میں ذہنی طور پر بہت منتشر ہوجاتے ہیں۔اس کے بعد ان میں وہ کیفیات پیدا نہیں ہو پاتیں جو اس جگہ کا تقاضہ ہیں۔لیکن خدا کی رحمت سے امید ہے کہ محض یہاں حاضری کے صلے اور مشقت اٹھانے کے بدلے میں بندہ رب کی عنایات کا مستحق ہوجائے گا۔لیکن جس شخص نے اس سفر میں یا اس جگہ پر خدا کی معصیت کا ارتکاب کیا تو اس نے اپنی بربادی کا پورا انتظام کر لیا۔

دوسری چیز رفث یعنی شہوانی حرکات و رویہ ہے۔اس کا پس منظر بھی وہی ہے جو جدال یعنی لڑائی جھگڑے کا ہے۔جس طرح تکلیف دہ باتوں پر یہاں آدمی کے مشتعل ہونے کا پورا امکان ہوتا ہے اسی طرح احرام کی ان پابندیوں کی بنا پر جن میں انسان تعلقِ زن وشو قائم نہیں کر پاتا، بہت ممکن ہوتا ہے کہ اس کے دل میں خیالاتِ فاسدہ پیدا ہوجائیں۔ اس کے علاوہ حرم میں خواتین کی بڑی کثرت ہوتی ہے۔ وہ بھی ملک ملک سے آئی ہوئی رنگ برنگی خواتین۔ جگہ جگہ مرد و زن کے اختلاط کا موقع ہوتا ہے۔ ایسے میں انسان خود پر قابو نہ پائے تو اس کے سفلی جذبات اسے خدا کے حضور مردود کروا سکتے ہیں۔

حرم میں کبڈی

ایک چیز اور ہے جس کا تذکرہ کرنا میں بہت ضروری خیال کرتا ہوں۔ بہت سے لوگ حرم میں آکر ایسے کام کرتے ہیں جو ان کی دانست میں نیکی کے اعمال ہوتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کی ناراضی کو دعوت دینے والے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں لوگوں کی ایذا رسانی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ان میں سب سے پہلی چیز حرم میں کبڈی کھیلنا ہے۔آپ شاید سوچ رہے ہوں کہ حرم

میں کبڈی کون کھیلے گا۔ مگر حجر اسود کو بوسہ دینے کی کوشش میں لوگ جو کچھ کرتے ہیں اس کی قریب ترین مشابہت صرف کبڈی کے کھیل میں پائی جاتی ہے۔ جو دھکم پیل، چھینا جھپٹی اور مارا ماری اس موقع پر ہوتی ہے اس کا تصور وہ شخص نہیں کرسکتا جس نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ کسی بھی شریف آدمی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ان حالات میں اپنی جان، مال، عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالے بغیر حجر اسود کو بوسہ دے۔ حد یہ ہے کہ اس معرکہ آرائی میں بعض اوقات خواتین بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ میرے جیسے لوگ صرف جمعہ کے دن عصر کی نماز سے قبل ہی بوسہ دے پاتے ہیں جب پولیس والے مار پیٹ کر لوگوں کی لائن بنوا دیتے ہیں۔

دوسری چیز مقامِ ابراہیم کے پیچھے طواف کے بعد پڑھے جانے والے نوافل ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کے بعد یہاں نوافل پڑھے تھے۔ لوگوں نے اس بات کو لے لیا اور وہاں نوافل پڑھنا لازمی خیال کر لیا۔ حالانکہ اکثر اوقات وہاں نوافل پڑھنے سے طواف کرنے والوں کا راستہ رکتا ہے۔ میں نے کتنی دفعہ تو یہ بھی دیکھا کہ دو چار لوگ وہاں نوافل پڑھ رہے ہیں اور ان کے آٹھ دس رشتے دار طواف کرنے والوں کا راستہ روک کر کھڑے ہیں۔ طواف کرنے والوں کا راستہ روکنا کوئی نیکی نہیں۔ نفل کہیں بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ حتیٰ کے مقامِ ابراہیم سے ذرا اور پیچھے چلے جائیں تو وہ بھی اس کے عقب میں ہی شمار ہوگا۔ یہی معاملہ مطاف میں فرض نماز کے لیے بیٹھنے والوں کا ہے۔ طواف کرنے والوں کا رش جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے مطاف ان سے بھرتا جاتا ہے۔ مگر حرم کے سامنے بیٹھنے کے شوقین عملاً ان کا راستہ روک دیتے ہیں۔ حرم کے سامنے بیٹھنا اچھی بات ہے مگر جب طواف کرنے والوں کو تکلیف ہو تو پھر یہ بری بات بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب سیدنا ابراہیمؑ اور سیدنا اسماعیلؑ کو حرم پاک صاف رکھنے کا حکم دیا تو سب سے پہلے طواف کرنے والوں کا تذکرہ

کیا ہے، (البقرہ 2:125 ، الحج 22:26)۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرم پر پہلا حق طواف کرنے والوں کا ہے۔اورانہی کی فضیلت سب سے زیادہ ہے۔ دوسروں کے لیے جائز نہیں کہ ان کا راستہ روکیں۔

اس ضمن میں آخری چیز بلند آواز میں دعا کرنا ہے۔ دورانِ طواف بعض لوگ گروپ کی شکل میں اس طرح چلتے ہیں کہ ایک آدمی بہت بلند آواز میں دعائیں پڑھتا جاتا ہے اور بقیہ لوگ پرجوش طریقے سے اس کے الفاظ دہراتے جاتے ہیں۔ایسی دعائیں کروانے والے بعض پیشہ ور ہوتے ہیں اور بعض وہ جو اپنے ملکوں سے گروپ کی شکل میں آتے ہیں۔جبکہ بعض لوگ اپنے اہل خانہ کو اس طرح دعا کرواتے ہیں۔ یہ لوگ شاید اس بات سے واقف نہیں کہ رب کو تو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکارا جاتا ہے یہی قرآن کا حکم ہے،(الاعراف 7:55)۔اور یہی اس عزت والی بارگاہ کا ادب ہے۔اجتماعی دعا کے مواقع اور ہوتے ہیں۔اس پُرشور دعا میں ایذا رسانی کا پہلو یہ ہے کہ جو لوگ اپنے رب کو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکار رہے ہوتے ہیں وہ اس چیخ و پکار سے پریشان ہوجاتے ہیں۔

ظاہر پرستی

مذکورہ بالا چیزوں میں جو پہلو سب سے نمایاں نظر آئے گا وہ یہ ہے کہ لوگ ظاہری چیزوں کے پیچھے دوڑ لگاتے ہیں اور اعلیٰ حقائق کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا۔ وہ محض دوسروں کی دیکھا دیکھی اعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔چاہے اس کے نتیجے میں دین کا کوئی دوسرا حکم ذبح ہوجائے۔وہ اعمال کی حکمتوں اور ترجیحات سے واقف نہیں۔میں اس میں ان لوگوں کا اتنا قصور نہیں سمجھتا۔شاید یہ اس دور میں کیے جانے والے دینی کام کی کمی اور خرابی ہے۔موجودہ دینی کام میں سارا زور چند ظاہری اعمال پر ہے۔ داڑھی اور پائنچوں سے شروع ہونے والا دین نماز،

روزہ، حج اور زکوٰۃ پر آ کر ختم ہو جاتا ہے۔اس کے بعد انسان کو جنت کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔

تاہم دینداری کا یہ طریقہ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا اور نہ انبیائے بنی اسرائیل کی دعوت کا یہ طریقہ تھا۔ان کا طریقہ لوگوں کی سوچ کو بدلنے کا تھا۔ وہ فکرِ آخرت کی بنیاد پر انسانوں کے مجموعی رویے کو بدلتے تھے۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ انہیں روزِ قیامت اپنے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا۔ اس لیے صرف عبادات ہی نہیں بلکہ معاشرت، معیشت، اخلاقیات، معاملات غرض زندگی کے ہر شعبے میں انہیں اپنے رب کا فرمانبردار بننا چاہیے۔ گو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بنیادی احکام ہیں لیکن دین ان سے شروع ہوتا ہے ان پر ختم نہیں ہوتا۔ دین کا ظاہری ڈھانچہ تنہا کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دین یہ بتاتا ہے کہ ان کے نتائج آخرت میں اگر جنت کی صورت میں نکلیں گے تو دنیا میں بھی ان کے کچھ نتائج نکلتے ہیں۔ مثلاً روزے کا نتیجہ آخرت میں جنت ہے۔ مگر دنیا میں اس کا نتیجہ تقویٰ بیان کیا گیا ہے۔ روزہ رکھ کر دنیا والا نتیجہ نہیں نکلتا تو آخرت والا نتیجہ کیسے نکلے گا؟ اسی طرح دنیا میں نماز اگر فحش اور برے کاموں سے نہیں روک پاتی تو آخرت میں جنت کی کنجی بھی نہیں بن سکتی۔

چینی اور عمرہ

اس دور میں معاملات کو دین کے خانہ سے باہر نکال دیا گیا ہے۔تقویٰ ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ داڑھی کتنی نیچے اور پائنچہ کتنا اوپر ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں بھرپور احکامات دیتا ہے۔جنہیں نظر انداز کر کے اور محض دین کے ظاہری اعمال پر زور دینے سے عجیب وغریب سانحات وجود میں آتے ہیں۔ میں ایسے ہی ایک سانحے کے بیان کے ساتھ اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ آپ بھی سنیے اور سر دھنیے۔

اردو نیوز سعودی عرب سے شائع ہونے والا کثیر الاشاعت اردو روزنامہ ہے۔ نیو یارک

سے جدہ آتے ہوئے اس میں شائع ہونے والا ایک مراسلہ پڑھا۔ مراسلہ نگار کے مطابق ان کے ایک جاننے والے پچھلے سال اپنی والدہ کو لے کر عمرہ کرنے آئے۔ مراسلہ نگار نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو عمرہ کرنے کا خیال کیسے آیا۔ کہنے لگے کہ اس سال مارکیٹ میں چینی کی کمی ہوگئی تھی۔ میں نے چینی ذخیرہ کرلی اور بعد میں بیچی جس سے مجھے 2 لاکھ روپے کا منافع ہوا۔ اس ''منافع'' کے بعد میں اپنی والدہ کو عمرہ کرانے لے آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مکہ سے روانگی

میں جمعے کے دن مکہ پہنچا تھا اور اگلے جمعے تک وہاں رکا۔ ایجنٹ نے مجھے فون کرکے بتایا کہ آپ جمعے کی نماز کے بعد تیار رہیں آپ کو گاڑی لینے آجائے گی۔ میں اور اہلیہ جمعے کے بعد تیار ہوگئے۔ انتظار کرتے کرتے پانچ بج گئے مگر کسی نے آنا تھا اور نہ کوئی آیا۔ آخر تھک ہار کر ہم خود نکلے۔ اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے میں جو پاگل کر دینے والی گرمی پڑی تھی اس کے بعد یہ پھوار بڑی غنیمت تھی۔ تاہم موسم ابھی بھی اتنا ہی گرم تھا۔ کیونکہ شام کے وقت تک سورج کے ساتھ ساتھ در و دیوار بھی آگ اگلنے لگتے تھے۔

مجھے ایک دوسرا خوف بھی لاحق تھا۔ میرے پاس کوئی قانونی دستاویز نہیں تھی، اور پاسپورٹ وغیرہ سب ایجنٹ کے پاس تھے۔ اس صورت میں اگر کسی جگہ بھی چیکنگ ہوجاتی، جو یہاں اکثر ہوتی رہتی ہے، تو مجھے سیدھا جیل بھیج دیا جاتا۔ پورے ہفتے کی تھکن کے بعد میں اور اہلیہ نڈھال تھے۔ حرم میں قیام کے دوران نیند لینے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ پھر اتنی دور ہوٹل میں آنا جانا۔ مجھے کینیڈا میں رہ کر گرمی برداشت کرنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ اس لیے یہ گرمی بالکل ناقابلِ برداشت لگتی تھی۔ جدہ جانے کے لیے میں نے ایک پرائیوٹ گاڑی والے سے بات کی۔ یہ گاڑیاں حرم کے سامنے سے ہی مل جاتی ہیں اور کسی قسم کے کاغذات طلب

نہیں کرتیں۔ جبکہ باقاعدہ بس سروس اور ٹیکسیاں سارے کاغذات چیک کرتی ہیں۔ اس گاڑی والے نے ہمارے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ جب ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو اس کا اے سی چل رہا تھا مگر حرم سے باہر آتے ہی اس نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ گیس ختم ہوگئی۔ اس کے بعد پورے سفر میں صحرا کی گرم لو کے تھپیڑے کھاتے ہوئے ہم جدہ پہنچے۔ جہاں بلد (جدہ کا ڈاؤن ٹاؤن) سے ایک ٹیکسی لے کر رضوان بھائی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

جدہ: یادوں کا شہر

جیسے جیسے ٹیکسی رضوان بھائی کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی ذہن پر عجیب سکون واطمینان طاری ہو رہا تھا۔ ایک تو اے سی میں بیٹھ کر جان میں جان آئی۔ دوسرے میرے ماضی کی انتہائی خوشگوار یادیں اس شہر سے وابستہ تھیں۔ ٹیکسی میرے جانے پہچانے راستوں سے گزر کر آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ جس کے ساتھ میرے ذہن میں ماضی کی پرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ یہاں قیام کے دوران میرا حال یہ ہوگیا تھا کہ پاکستان مجھے اجنبی لگنے لگا تھا اور جیسے ہی میں چھٹیاں گزار کر واپس آتا تو لگتا تھا کہ عافیت کی دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس شہر میں ہر چیز بڑی پرسکون محسوس ہوتی تھی۔ ہر طرف عافیت، ہر طرف امن، ہر طرف سکون، ہر طرف فراوانی۔ خدا نے اس سرزمین پر وہی احسان کیا ہے جو کبھی اس نے سبا والوں پر کیا تھا: ''کھاؤ اپنے رب کا رزق اور اس کا شکر کرو۔ یہ پاکیزہ شہر تمہارے لیے ہے اور رب معاف کرنے والا ہے''، سبا15:35۔

جب میں ملازمت کے لیے یہاں آیا تو جدہ ہر اعتبار سے مجھے کراچی جیسا لگا۔ وہی سمندر کے کنارے آباد شہر۔ وہی نمازوں کے اوقات۔ دو بھائیوں کی موجودگی اور ان کی فیملی کی بنا پر گھر سے دوری کا احساس نہ ہوا۔ سماجی زندگی یہاں یقیناً نہیں مگر میں اس مزاج کا شخص نہ تھا۔ مجھے

تنہائی اور مطالعہ زیادہ پسند ہے۔ گھر سے آفس اور گھر سے مسجد، میں اسی میں خوش تھا۔ وہاں کی مساجد میں آئمہ ایسی مسحور کن مگر فطری آواز میں تلاوتِ قرآن کرتے کہ میں خود کو دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں محسوس کرتا۔ کبھی کبھی تبدیلی کے لیے رضوان بھائی اور بھابھی کے ساتھ شاپنگ پر چلا جاتا جو وہاں رہنے والوں کی بہت بڑی تفریح ہے۔ بعض اوقات ہم سارے بھائی اور گھر والے ساحل پر چلے جاتے جسے یہاں کورنش کہا جاتا ہے۔ سعودی حکومت نے یہاں کافی درخت اگائے ہیں اور بعض پارک وغیرہ بھی بنائے ہیں۔ کبھی کبھار ہم سب مل کر ایسے کسی پارک چلے جاتے۔ اتفاق ہے کہ میری شادی ہوئی تو سسرال والے اوران کے کئی رشتے دار جدہ میں تھے۔ اس لیے کچھ سماجی مصروفیت بھی پیدا ہوگئی۔ تاہم میری سب سے بڑی تفریح اور مصروفیت مکہ اور مدینے کے چکر لگانا تھا۔ میں اوسطاً ہر دو ہفتے بعد حرم جاتا تھا۔ درمیان میں جب موقع ملا اور اللہ نے اپنے فضل سے یہ موقع بہت عطا کیا تو مدینہ چلا جاتا تھا۔ اللہ نے حرمین جانا ہمیشہ آسان کیا۔ میں سعودی عرب سے جاب چھوڑ کر روانہ ہوا تو یہی سوچ دل میں تھی:

جو دن گزر گئے ہیں تیرے التفات میں
میں جوڑلوں انہیں کہ گھٹالوں حیات میں

لبیک اور البیک

میں خیالوں میں تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک بات کی طرف توجہ دلائی۔ اس کا ذکر میں یہاں کے اخلاقی حالات کے ضمن میں کروں گا۔ گاڑی گھر کے قریب پہنچی تو حی الصفا کا علاقہ شروع ہوگیا۔ حی عربی میں محلے یا ضلع کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اس سے ذرا پہلے حی العزیزیہ کا علاقہ ہے۔ یہاں پاکستان ایمبسی اسکول ہے۔ اسی لیے یہاں پاکستانی بڑی کثرت سے رہتے ہیں۔ اس علاقے میں دو جگہوں پر پاکستانیوں کی دکانیں کثرت سے ہیں۔ یہاں

جا کر آپ کو محسوس نہ ہوگا کہ آپ وطن سے دور ہیں۔ وطن کی کونسی ایسی چیز ہے جو یہاں دستیاب نہیں۔ بالکل نیویارک کے جیکسن ہائٹ والا معاملہ ہے۔

ٹیکسی ان سب جگہوں سے گزرتی ہوئی رضوان بھائی کے گھر پہنچی۔ وہ سب بڑی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میرا کمرہ بڑے اہتمام سے سجا ہوا تھا۔ یہ ایک ہفتے سے ایسا ہی تھا کیونکہ اسے میری آمد کے وقت سجایا گیا تھا۔ میں نے اس کمرے میں کئی سال گزارے تھے۔ اس میں جا کر وہ ساری یادیں تازہ ہوگئیں۔ کھانے کے لیے رضوان بھائی البیک لائے تھے۔ قارئین تصحیح کر لیں میں نے لبیک نہیں لکھا ''البیک'' لکھا ہے۔ نام کی مناسبت کے علاوہ دونوں میں ایک اور قدرِ مشترک یہ ہے کہ جس طرح آدمی لبیک کہیں اور نہیں پڑھ سکتا ''البیک'' بھی کہیں اور نہیں کھا سکتا۔ آپ کے ذہن میں تجسس ہوگا کہ یہ البیک کیا بلا ہے۔ یہ ایک خاص قسم کے بروسٹ کا نام ہے۔ دنیا بھر میں KFC کا بڑا شہرہ ہے۔ مگر یہاں حال یہ ہے کہ KFC کی دکان البیک کے ساتھ ہوتی ہے، KFC پر ایک آدمی کھڑا ہوتا ہے اور البیک پر سو۔ یہ مقبولیت اس کے غیر معمولی ذائقے کی بنا پر ہے۔ ذائقے کے علاوہ بھی اس کی متعدد خوبیاں ہیں جو دوسروں میں نہیں۔ یہ سستا ہے۔ مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ساتھ کھانے کی دیگر چیزیں مثلاً بریڈ، کیچپ وغیرہ بھی بہت ملتی ہے۔ نیز اس کی لہسن کی چٹنی (Garlic Sauce) ذائقے میں بے مثال ہوتی ہے۔ اگر آپ کا یہاں آنا ہو تو اسے ضرور کھایئے گا۔ حج کے زمانے میں منیٰ کے میدان میں اس کی دو دکانیں دیکھیں جن پر ہزاروں آدمیوں کا رش لگا تھا۔ بقول ہمارے ایک جاننے والے کے جو حج پر آئے تھے، لبیک اور البیک ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

سرزمینِ عرب اور قربِ قیامت

اس موقع پر تو مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کے معاشرے کے بارے میں اپنے کئی سال

پر محیط تجربات و مشاہدات میں آپ کو شریک کرلوں۔ کیونکہ اس برادر اسلامی ملک کے بارے میں ہماری معلومات زیادہ نہیں۔ یہاں کے سفرنامے تو بہت لکھے گئے ہیں مگر زیادہ تر وہ حرمین کی داستان اور اسلام کی تاریخ تک ہی محدود رہے ہیں۔ آنے والے حج و عمرے کے لیے سیدھے حرم آتے ہیں اور اکثر وہیں سے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ مگر میں چونکہ کافی عرصے مقیم رہا ہوں اور سعودی عرب کے تمام اہم شہروں میں گیا ہوں اس لیے میں وہ معلومات بھی آپ کو دے سکتا ہوں جو ایک زائر نہیں دے سکتا۔

سعودی عرب آنے والے شخص کے پہلے تاثرات یہ ہوتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی دولت مند ملک میں آ گیا ہے۔ لمبی لمبی گاڑیاں، بلند و بالا عمارات، بڑے بڑے عظیم الشان شاپنگ سنٹرز، دنیا بھر کے فاسٹ فوڈ اداروں کی شاخیں، امرا کے بڑے بڑے محلات۔ غرض ہر جگہ دولت کی فراوانی اور دنیاوی شان و شوکت کا عنصر نمایاں ہے۔ آج سے چند سال قبل تک یہاں کا معاشرہ ایک سادہ بدوی معاشرت کا نمونہ تھا۔ جس کے کوئی آثار اب بڑے شہروں میں نظر نہیں آتے۔ یہ دراصل اس عظیم پیش گوئی کا ظہور ہے جو مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔ یہ روایت صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے اور راوی بھی کوئی عام شخص نہیں سیدنا عمرؓ ہیں۔ حدیث کے پورے ذخیرے میں اس جیسی اعلیٰ روایت کم ہی ہوگی۔ اس میں نہ صرف پورے دین کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے بلکہ قربِ قیامت کی بہت اہم پیش گوئی بھی کی گئی ہے۔ حدیث کے مطابق ایک دفعہ لوگوں کو دین سکھانے کے لیے حضرت جبرائیلؑ انسانی شکل میں تشریف لائے تاکہ سب لوگ ان باتوں کو سن لیں اور اچھی طرح یاد رکھیں۔ میں یہاں حدیث کا وہی حصہ بیان کر رہا ہوں جس کا تعلق پیش گوئی سے ہے۔ روایت کے مطابق حضرت جبرائیلؑ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض سوالات کیے۔ آپ کا آخری سوال یہ تھا کہ قیامت کب آئے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے جواب دیا کہ بتانے والے کو پوچھنے والے سے زیادہ خبر نہیں (یعنی دونوں کو معلوم نہیں)۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس کی کچھ نشانیاں بتلا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ ننگے پاؤں بکریاں چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے اور لونڈی اپنی مالکن کو جنے گی۔

یہ پیش گوئی اتنے واضح طریقے پر پوری ہوئی ہے کہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے اس کی حقیقت دیکھ سکتا ہے۔ اس کا خلاصہ صرف ایک نسل میں لوگوں کی مالی حیثیت میں انتہائی غیر معمولی تبدیلی ہے۔ یہ معلوم بات ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کا آغاز جزیرہ نما عرب سے ہوا۔ اس کے بعد عربوں کے تمدن میں کافی تبدیلی ہوئی۔ مگر اس تبدیلی کے اثرات اس خطے سے باہر ظاہر ہوئے۔ حضرت علیؓ کے دور حکومت میں خلافتِ راشدہ کا مرکز مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دمشق، بغداد اور اسپین وغیرہ عربوں کی حکومت اور تمدن کے عظیم مراکز رہے۔ مگر جزیرہ نما عرب کے تمدن، ثقافت اور رہن سہن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ لوگ صدا کے بدوی تھے اور بدوی رہے۔ یہ صرف ایک نسل پہلے کی بات ہے کہ یہاں کے باسیوں کی زندگی میں تبدیلی آئی جب پٹرول کی دریافت نے عربوں کو اچانک دنیا کی امیر ترین قوم بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ننگے پاؤں بکریاں چلانے والے بلند و بالا عمارات کے مالک بن گئے۔ وہ خواتین جو لونڈیوں کی طرح زندگی گزارتی تھیں ان کی لڑکیاں جب بیش قیمت لباس اور زیورات پہنے، مرسڈیز کار میں موبائل فون ہاتھ میں لیے گھومتی ہیں تو اپنی سادہ مزاج ماں کی مالکن لگتی ہیں۔ یہ سب آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ تاہم پیش گوئی کے اس دوسرے حصے کو محض ظاہری الفاظ کے حوالے سے لیں تب بھی اس کی سچائی آخری حد تک سامنے آ چکی ہے۔ سعودی عرب دورِ حاضر میں بھی غلامی کا بڑا مرکز رہا ہے۔ ٹھیک اس زمانے میں جب یہاں تعمیر و ترقی کا دور شروع ہوا سعودی عرب میں غلامی بیک جنبش قلم ختم کر دی گئی...... اس طرح کہ ایک حاملہ لونڈی

کے ہاں اگلی صبح بیٹی پیدا ہوئی تو اس کی حیثیت ایک آزاد عورت کی تھی جسے کبھی لونڈی نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

معاشی حالات

مالی حالت کا ذکر آ گیا ہے تو پہلے میں سعودی عرب کے معاشی حالات سے ہی بات شروع کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو تیل کی دولت کی شکل میں جو فراخی عطا کی ہے اس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ گیس اور سونے کے وسیع ذخائر بھی یہاں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مزید یہ کہ حج اور عمرے کی شکل میں یہاں سیاحت کی عظیم ترین انڈسٹری لگی ہوئی ہے۔ لاکھوں لوگ ہر سال یہاں حج و عمرے کے لیے آتے ہیں۔ جس سے نہ صرف مقامی لوگوں کی بڑی تعداد کا روزگار وابستہ ہے بلکہ سعودی کرنسی بڑی اہم کرنسی بن چکی ہے اور بھاری مقدار میں زرِ مبادلہ ملک کو حاصل ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں کی بنا پر یہاں عوام الناس کی حالت میں بہت بہتری آئی ہے۔ تنخواہیں بہت اچھی ہیں۔ یہ ایک ٹیکس فری سوسائٹی ہے اس لیے پوری تنخواہ جیب میں آتی ہے۔ سامانِ زندگی بہت سستا ہے۔ دنیا بھر کی مصنوعات دستیاب ہیں۔ ہر پھل ہر موسم میں مل جا تا ہے۔ چیزیں خالص ہیں۔ تعلیم مفت ہے۔ مکان وغیرہ کے لیے حکومت سے بلاسودی قرضے مل جاتے ہیں۔ حکومت عوام کی فلاح کا خیال کرتی ہے۔ کاروبار کے وسیع مواقع ہیں۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ جتنے اچھے مواقع یہاں ہیں دنیا میں کہیں اور نہیں ہیں۔ یہاں ۱۲ فیصد امپورٹ ڈیوٹی کے علاوہ کوئی اور ٹیکس نہیں۔ لیبر باہر کے ممالک سے منگوائی جاتی ہے اور بہت سستی ہے۔ لوگوں کی قوتِ خرید بہت زیادہ ہے۔ پرائس کنٹرول کا کوئی نظام نہیں۔ قیمتوں کا تعین صرف مارکیٹ کرتی ہے۔ اس لیے یہاں جو بھی کاروبار میں کودتا ہے تیر جاتا ہے۔ بلکہ چند سالوں میں

خود اپنا جہاز خرید لیتا ہے۔

معاشرتی حالات

گلف کی جنگ کے بعد معاشی حالات میں تبدیلی آئی ہے اس کی وجہ سب جانتے ہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ اس بنا پر کچھ مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ پھر جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دولت کو اپنی امت کا فتنہ قرار دیا ہے اس لیے اس فتنے کے اثرات بھی پورے طور پر نظر آتے ہیں۔ دولت کا اصول ہوتا ہے کہ آہستہ ہستہ یہ چند خاص طبقات میں مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے۔ سعودی عرب میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ یہاں کی ساری دولت مقتدر اور سرمایہ دار طبقات کے ہاتھوں میں جمع ہو رہی ہے۔ جس کے لازمی نتیجے کے طور پر نچلے طبقات میں بے چینی بڑھ رہی ہے۔ روزگار کے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اسی بنا پر یہاں کی حکومت غیر ملکی کارکنان کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ مقامی لوگوں کو روزگار ملے۔ یہاں جرائم میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ منشیات فروشی، چوری، آبروریزی اور قتل وغیرہ جیسے جرائم کی خبریں اخباروں میں شائع نہیں ہوتیں بلکہ ان کے مرتکبین کو جب سزا سنائی جاتی ہے تب خبر بنتی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ سارے مجرموں کو پکڑا نہیں جا سکتا اس لیے اکثر جرائم کی خبریں شائع نہیں ہوتیں۔ چوری اور رشوت ستانی کے متعدد واقعات تو خود میرے ذاتی علم میں ہیں۔ دولت کے زیادہ ہونے کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کی حرص بڑھتی ہے جو جرائم اور معاشرتی بے چینی کا ایک بڑا سبب ہے۔

ایک بہت بڑا معاشرتی مسئلہ شادی کا ہے۔ شادی کے وقت لڑکوں کو مہر کے نام پر ایک بہت بڑی رقم لڑکی کے باپ کو دینی پڑتی ہے۔ یہ رقم ہر لڑکا نہیں دے سکتا۔ اس لیے لڑکیاں بیٹھی رہتی ہیں اور لڑکوں کی بھی شادی نہیں ہو پاتی۔ پھر اکثر مرد باہر ملکوں کی خواتین سے شادیاں کر لیتے ہیں اس سے بھی مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ تاہم یہاں طلاق اور دوسری شادی کو عیب نہیں سمجھا

جاتا اس لیے بہت سارے وہ مسائل نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں موجود ہیں۔شادی کو مشکل بنانے میں سعودی معاشرت کا یہ پہلو بھی شامل ہے کہ شادی کے بعد لڑکا بالعموم الگ رہتا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کا رواج نہیں۔لیکن پورا گھر سیٹ کرنا اتنا سہل نہیں ہوتا۔معاشرے میں اسراف کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔شادی بیاہ میں نمود و نمائش پر خواتین بے اندازہ پیسے خرچ کرتی ہیں۔اس کے علاوہ اشیائے تعیّشات کی کثرت ہے۔لوگوں کے پاس موجود پیسہ ملک کی ترقی میں خرچ ہونے کے بجائے غیر ضروری اشیا کی درآمد میں خرچ ہوتا ہے۔جس کے نتیجے میں نظر آنے والی خوشحالی بالکل مصنوعی ہے۔عیش و عشرت کی بنا پر لوگوں میں کام کرنے اور محنت کرنے کا رجحان بالکل نہیں۔ ہر شخص کام چوری کو سب سے بڑا کام سمجھتا ہے۔ جو تھوڑا بہت پڑھ لیتا ہے وہ منیجر سے کم عہدے پر کام کے لیے راضی نہیں ہوتا۔آج اگر تیل کی دولت ختم ہو جائے تو آپ تصور نہیں کر سکتے کہ یہاں کیا حال ہو گا۔

اخلاقی حالات

ایک عام آدمی جب سعودی عرب آتا ہے تو یہاں کا ماحول دیکھ کر بڑا متاثر ہوتا ہے۔نماز کے وقت سارے بازار بند ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص نماز پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔خواتین کے لیے بھی مساجد میں نماز کا اہتمام ہے۔عورتیں بغیر برقع کے نظر نہیں آتیں۔حتیٰ کے غیر مسلم خواتین بھی بغیر برقع کے باہر نہیں نکلتیں۔مساجد میں آئمہ درس و تدریس کا اہتمام کرتے ہیں۔مقامی میڈیا پر کوئی غیر اخلاقی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔انٹرنیٹ بھی سنسر ہو کر آتا ہے۔ ہر طرف قال اللہ اور قال رسول کا دور دورہ ہے۔شریعت نافذ ہے۔مگر یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ کوئی بہت اچھا نقشہ پیش نہیں کرتا۔ یہاں جنسی ہراس (Sexual Harassment) بہت عام ہے۔کوئی عورت تنہا گھر سے نہیں نکل سکتی۔

میں نے جدہ آتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کی جس بات کا ذکر کیا تھا وہ یہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھو یہ کیسے خبیث لوگ ہیں کہ ٹیکسی میں عورتیں جارہی ہیں اور یہ لفنگے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور جیسے ہی ٹیکسی رکی یہ بھی ساتھ رک گئے۔ پہلے مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا مگر جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو یقین آیا۔ کوئی تنہا عورت کھڑی ہو تو فوراً دس گاڑیاں پاس آکر رک جاتی ہیں۔ یا ہارن دے کر گزرتی ہیں کہ ذرا وہ آسرا دے اور یہ اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جائیں۔ یہ صرف لفنگوں کی حرکتیں نہیں، میں نے تو اچھے اچھے لوگوں کو گاڑی روکتے دیکھا ہے۔ کتاب پر نظر ثانی کے دوران ایک خبر پڑھی کہ ریاض میں 63 افراد کو کوڑے مارے گئے۔ یہ لوگ اسکول کی طالبات کو تنگ کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ میں اوپر بیان کر چلا ہوں کہ سعودی عرب میں جرم کی خبر صرف اس وقت آتی ہے جب مرتکبین کو سزا ملتی ہے۔ جبکہ یہ حرکت یہاں بہت عام ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا میں ذکر اس لیے مناسب نہیں سمجھتا کہ یہ سنی سنائی باتیں ہیں اور میں ان کا براہِ راست گواہ نہیں ہوں۔ وگرنہ زبانِ خلق تو بہت کچھ کہتی ہے۔ سعودی خواتین کا لباس، اسلامی اعتبار سے، نامناسب ہوتا ہے۔ کچھ اس میں دخل ان کی اس معاشرت کا بھی ہے جس میں ہر فیملی تنہا رہتی ہے اور خواتین اجنبیوں کے سامنے نہیں آتیں۔ لیکن بچے بہر حال بڑے ہو جاتے ہیں۔ قریبی رشتہ دار بھی آتے جاتے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ ان کے مردوں کا وہ رویہ جس میں وہ کسی بھی عورت کو گاڑی میں بٹھانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اس میں ان کے گھروں کی خواتین کے لباس کا عمل دخل ضرور ہے۔ اب تو ڈش کے ذریعے گھر گھر مغربی میڈیا چل رہا ہے۔ جس میں عریاں چینلز بھی آتے ہیں۔ اس کے نتائج تو بہر حال سامنے آئیں گے۔

سعودی عرب میں پاکستانی

سعودی عرب کا ذکر مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ وہاں موجود پاکستانیوں کا تذکرہ نہ ہو جائے ۔ سعودی عرب، حرمین کی بنا پر، یوں تو ایک زمانے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے سفر کی منزل رہا ہے مگر تیل کی دولت نکلنے کے بعد جب تعمیر و ترقی کا عمل شروع ہوا تو غیر ملکی کارکنوں کا عظیم ریلہ یہاں آنا شروع ہو گیا۔ ان میں بہت بڑی تعداد پاکستانیوں کی تھی۔ اسّی کی دہائی میں جب تعمیری عمل مکمل ہوا تو کارکنوں کی ایک بڑی تعداد واپس چلی گئی۔ تاہم اس وقت بھی بہت سے لوگ یہاں موجود ہیں۔ تقریباً نو لاکھ پاکستانی سعودی عرب میں کام کرتے ہیں۔ جن کی اکثریت جدہ اور ریاض میں مقیم ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کی جوانی یہاں گزر گئی اور پاکستان سے زیادہ یہ ان کا وطن بن چکا ہے۔

ان پاکستانیوں نے نہ صرف یہاں کی تعمیر و ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے بلکہ بیرونِ ملک سے پاکستان بھیجے جانے والے زرِ مبادلہ کی سب سے بڑی مقدار یہیں سے بھیجی جاتی ہے۔ ان لوگوں کے متعدد مسائل ہیں۔ ایک مسئلہ وہی ہے جو پاکستانیوں کو ہر جگہ درپیش ہوتا ہے۔ یعنی سفارت خانے کے اہلکاروں کا رویہ۔ مجھے وہ سلوک یاد آتا ہے جو کینیڈین سفارتکار نے مجھ سے کیا تھا جبکہ میں ابھی اس کے ملک کا شہری بھی نہیں بنا تھا۔ دوسری طرف یہاں ایسے تکلیف دہ واقعات پیش آتے ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے نہیں بھارت کے سفارت خانے میں آ گئے ہیں۔ کم و بیش یہی حال ایمبسی اسکول کا ہے۔ جس میں دی جانے والی تعلیم کا معیار بالکل پست ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلانے کے لیے انتہائی مہنگے پرائیوٹ اسکولوں میں پڑھاتے ہیں۔ سفارش اور رشوت کی بنیاد پر آنے والے کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے ہر قومی ادارے کا المیہ ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ مقامی لوگوں کے مقابلے میں پاکستانیوں کو، دیگر غیر ملکی کارکنان کی طرح، ہر جگہ امتیاز کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے دنیا بھر میں مسلمانوں کی دوسروں کو الزام دینے کی روش یہاں کے مقامی اخبارات کا بھی معمول ہے۔ چنانچہ وہ غیر ملکیوں کو جرائم کا سبب بھی قرار دیتے ہیں اور مقامی لوگوں کی بیروزگاری کی وجہ بھی۔ کچھ پاکستانیوں کا بھی یہ مسئلہ ہے کہ ان کے غیر تعلیم یافتہ طبقات ایسا رویہ اور حلیہ اختیار کرتے ہیں جو دوسروں کی نگاہ میں خود کو ذلیل کرانے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ مقامی لوگ شلوار قمیص پہننے والوں کو بالعموم بہت حقیر سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے وہ ایک مخصوص لفظ بولتے ہیں۔ یعنی رفیق۔ کسی کو عزت سے مخاطب کرنے کے لیے یہاں صدیق کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ بہت عزت دینے کے لیے خواجہ کا لفظ بولتے ہیں۔ آخرالذکر لفظ یہ لوگ گوروں کے لیے استعمال کرتے ہیں جن سے یہ آخری حد تک ذہناً مرعوب ہیں۔

پاکستانیوں کی کثرت کے باوجود یہاں پاکستانی کمیونٹی نام کی کوئی چیز نہیں۔ یہ پاکستانیوں کا المیہ ہے کہ وہ ملک میں ایک قوم ہیں نہ ملک سے باہر۔ لوگوں کے ذاتی ملنے والوں کا ایک محدود حلقہ ہوتا ہے۔ یہاں سماجی روابط بہت زیادہ نہیں۔ تفریح کی سب سے بڑی جگہ ساحل ہے مگر سال بھر یہاں ایسی گرمی پڑتی ہے کہ کھلی جگہ پر بیٹھنا آسان نہیں ہوتا۔ لے دے کر ایک ہی تفریح بچتی ہے یعنی شاپنگ۔ یہاں کے شاپنگ سنٹرز بہت بڑے، خوبصورت اور آرام دہ ہیں۔ لوگ سب سے زیادہ عام خریداری کے سپر اسٹورز کا رخ کرتے ہیں جو حجم میں امریکا اور کینیڈا کے اسٹورز سے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ دس جگہ گھوم کر خریداری کرنے سے چیزیں بھی اچھی مل جاتی ہیں اور تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ جب سے ڈش اور ڈی کوڈر (Decoder) آیا ہے لوگوں کو ایک

اضافی تفریح میسر آ گئی ہے۔ البتہ اس کی قیمت بہت بھاری ہے۔ان کی اولاد جس کی پہلے ہی کوئی اچھی تربیت نہیں ہوتی اس کے بگاڑ کا پورا مسالہ ان پر دستیاب ہے۔

حال ہی میں ایک دفع پھر پاکستانیوں کا، بغرضِ ملازمت، یہاں آنے کا رجحان ہوا ہے۔ لیکن اس دفعہ یا تو ہنرمند آ رہے ہیں یا پھر آئی ٹی پروفیشنلز۔ ہر چند کہ حکومت باہر سے آنے والوں کو روکنا چاہتی ہے مگر مقامی سرمایہ دار جانتے ہیں کہ جتنی سستی نفری انہیں باہر سے مل سکتی ہے وہ یہاں نہیں ملے گی۔تنخواہ زیادہ مانگنے کے علاوہ سعودی کام بھی نہیں کرتے۔لیکن اس کے باوجود یہاں کام کرنے والوں کے سر پر ایک تلوار لٹکتی رہتی ہے کہ کسی وقت بھی انہیں ملازمت اور نتیجے کے طور پر ملک سے نکالا جاسکتا ہے۔اسی بنا پر بہت سے کینیڈا چلے گئے۔ جو باقی ہیں وہ بے یقینی کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔

شہرِ خوباں کا راستہ

ایک ہفتہ گھر میں آرام کے باوجود تھکن نہیں اتری۔لیکن خواہش تھی کہ جمعہ مدینے میں پڑھوں۔اسی دوران بھاگ دوڑ کر کے ایجنٹ سے دو ہفتے مزید قیام کا لیٹر لے لیا۔جمعرات کی صبح ہم مدینے کے لیے روانہ ہوئے۔صبح کے نو بجے تھے مگر درجۂ حرارت 43 ڈگری پر پہنچ چکا تھا۔ جدہ سے مدینے کا راستہ تقریباً 400 کلومیٹر ہے جو گاڑی کے ذریعے چار گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ مدینہ جانے کا دوسرا معروف طریقہ جہاز کا ہے جس میں صرف 45 منٹ لگتے ہیں۔

جدہ اور مکہ سے مدینہ جانے والی شاہراہ کا نام طریق الھجرہ ہے۔ یہ سڑک اسی راستے پر بنائی گئی ہے جس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی۔ یہ راستہ اس زمانے کی معروف گزرگاہ سے ہٹ کر واقع تھا اور ساحل کے قریب سے گزرتا تھا۔طریق الھجرہ بہت عمدہ سڑک ہے جو آنے جانے والے دو الگ الگ راستوں پر مشتمل ہے جن کے بیچ

میں ایک چوڑا آئی لینڈ ہے۔ ہر راستے پر تین ٹریک ہیں جن پر مختلف رفتار سے گاڑیاں چلتی ہیں۔آئی لینڈ اور سڑک کے اطراف میں باڑھ لگی ہوئی ہے۔ یہ سڑک بہت ہموار ہے جس پر ڈیڑھ دوسو کی رفتار پر بھی پتا نہیں چلتا کہ ہم کس قدر تیز رفتاری سے سفر کر رہے ہیں۔ یہ راستہ زیادہ ترلق ودق صحرا اور پہاڑی علاقوں سے گزرتا ہے۔تاہم سڑک ان پہاڑی سلسلوں سے اس طرح گزرتی ہے کہ محسوس نہیں ہو پاتا کہ ہم پہاڑ پر چڑھ چکے ہیں۔ راستے میں وقفے وقفے سے پٹرول پمپ آتے ہیں۔جن کے ساتھ مسجد، بیت الخلا اور کھانے پینے کی دکانیں موجود ہوتی ہیں۔تاہم چندہی پٹرول پمپ پر صاف ستھرے واش رومز ہیں۔

میں نے اس راستے پرنجانے کتنی دفعہ سفر کیا تھا۔دن کے وقت صحرا میں کوئی ایسا منظر دکھائی نہیں دیتا جو مسافر کی نگاہوں کو متوجہ کرے البتہ رات میں تاروں بھرے آسمان کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔رات کے وقت صحرا کے آسمان کی خوبصورتی بے مثل ہوتی ہے۔ بالخصوص اگر چاند کی تاریخیں اور بادل نہ ہوں تو لگتا ہے کہ سیاہ چادر پر ہیرے جڑے ہوئے ہیں جن کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ میں اکثر اس منظر کو گاڑی سے دیکھا کرتا اور سوچتا کہ موجودہ دور میں سائنس نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے مگر حسنِ فطرت سے بہت دور کر دیا ہے۔ راستے کی ایک نمایاں خصوصیت جگہ جگہ لگے وہ بورڈ ہیں جن پر مختلف اذکار مثلاً اللہ کے ذکر،اس کی حمد، تسبیح، تکبیر اور درود کی بار بار یاددہانی کرائی جاتی ہے۔

صحرا کے سفر میں کچھ اور تجربات بھی پیش آتے ہیں جو اتفاق سے واپسی کے سفر میں ہمیں پیش آئے۔ جاتے وقت تو بے پناہ گرمی تھی مگر واپسی میں مدینے سے نکلتے ہی بارش نے ہمیں گھیر لیا۔صحرا کے تمام موسموں کی طرح بارش بھی بہت شدید ہوتی ہے۔ بارش کے ساتھ اولے بھی برس رہے تھے۔کچھ دیر بعد یہ ژالہ باری تو تھم گئی لیکن آدھے راستے میں ایک دفعہ پھر طوفانِ

بادو باراں نے ہمیں آلیا۔ بجلی کی چمک، بادلوں کی کڑک، طوفانی بارش، اولے اور سیاہ بادلوں نے عجیب ڈراؤنا اور ہیبت ناک سماں پیدا کردیا تھا۔ ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ خدانخواستہ گاڑی خراب ہوگئی تو اور مسئلہ کھڑا ہوجائے گا مگر الحمدللہ ایسا کچھ نہ ہوا۔ بادلوں کا یہ سلسلہ جدہ کے قریب پہنچ کر منقطع ہوا۔ مگر جیسے ہی جدہ کی حدود میں داخل ہوئے تیز آندھی نے ہمیں گھیر لیا۔ ہوا کے ساتھ گرد وغبار کا ایسا طوفان اٹھ رہا تھا کہ چند گز دور کی چیز بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اللہ نے اس سے بھی ساتھ خیریت کے نکال دیا۔

مدینے کی سرزمین

وہ سرزمین جسے خدا نے روزِ ازل سے اسلام کی نصرت وسربلندی کے لیے چن لیا۔ وہ سرزمین جس نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس وقت اپنے دروازے کھولے جب دوسرا ہر دروازہ بند ہوگیا تھا۔ وہ سرزمین جہاں نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی تاریخ کا فیصلہ کن باب رقم ہوا۔ وہ سرزمین جس سے طلوع ہونے والے خورشیدِ ہدایت نے کل عالم سے باطل کی ظلمتوں کو دور کردیا۔ وہ سرزمین جہاں ایثار وقربانی، وفا ومحبت، سمع وطاعت اور شجاعت واستقامت کی لافانی داستانوں نے جنم لیا۔ وہ سرزمین جو آج بھی اہلِ شوق ومحبت کے دل کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ وہ سرزمین خدا نے آج اپنے لطف وکرم سے ایک دفعہ پھر دکھلا دی۔ فالحمدللہ رب العالمین۔

مدینے کی حدود میں داخل ہوتے ہی دور سے مسجد نبوی الشریف علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے بلند وبالا مینار نگاہوں کو تراوٹ اور قلب کو سکون دینا شروع کردیتے ہیں۔ یہ شہر، مکہ کی طرح، مجھے کبھی اجنبی نہیں لگا۔ بلکہ مدینہ تو ہمیشہ ماں کی آغوش کی طرح فراخ اور پرسکون لگا ہے۔ یہاں خدا کبھی خدائے ذوالجلال نہیں لگا، ہمیشہ خدائے کریم محسوس ہوا ہے۔ یہاں اس کی رحمت اس

کے غضب پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس شہر پرستر ماؤں سے بڑھ کر چاہنے والے رب کی ٹھنڈی چھاؤں ہمہ وقت سایہ فگن رہتی ہے۔ خدا نے اس دھرتی پر جس ہستی کو اپنی سب سے بڑی عنایت بنا کر بھیجا، جسے رحمت اللعالمین قرار دیا، اس کی یہاں موجودگی کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے بندوں پر اب بھی مہربان ہے۔ اور اس وقت تک رہے گا جب تک مدینہ موجود ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے

اقبال کے اس مصرعے سے نظری طور پر کس کو اختلاف ہوگا۔ مگر دل کی زمین پر اس کا اطلاق میں نے بہت کم دیکھا ہے۔ اللہ کو ماننے والے تو بہت ہیں مگر صرف اللہ کو کارساز، مشکل کشا اور تنہا مددگار ماننے والے بندے آج بھی کم ہیں۔ خدا جب قانونی حکمران سے بڑھ کر ایک محبوب بن جائے، جب اس کے ذکر سے وجود پر سرشاری کا عالم طاری ہو جائے، جب اس کی یاد سے آنکھیں پرنم اور دامن تر ہو جائے، جب اس کا نام لیتے ہوئے زبان میں شیرینی گھل جائے، جب اسے پکارتے ہوئے انسان کی ہچکیاں بندھ جائیں، جب اس کے شوق میں طائرِ روح پنجرۂ خاکی میں تڑپنے لگے، جب اس کی نشانیاں دیکھ کر دل دہل جائے، جب اس کی کتاب پڑھ کر عقل بے اختیار سجدہ ریز ہو جائے، جب اس کے لطف و عنایات دیکھ کر وجود سرتاسر نیاز بن جائے، جب اس کی عظمت کے مظاہر دیکھ کر زبان گنگ رہ جائے اور جب انسان خدا کو پا کر سراپا حمد، سراپا تسبیح، سراپا تقدیس بن جائے تب کہیں جا کر انسان بندگی کی کوئی خو بو لیتا ہے۔

ایسا نہیں کہ انسانوں میں یہ احساسات نہیں۔ ہیں اور بہت ہیں۔ خود مسلمانوں میں بہت سے ہیں جو ایسے جذبات سے سرشار ہیں۔ لیکن یہ جذبات اگر ہیں تو غیر خدا کے لیے ہیں۔ اللہ الرحمٰن کے لیے نہیں۔ غیرِ خدا کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ کس کس کا نام لکھوں۔ انسانیت تو ابتدا سے ہی ابلیس کے پھندے میں ایسی پھنسی کہ اس کی ہر چاہت، ہر محبت اور ہر مرعوبیت کا

رخ خدا کے غیر کی طرف پھر گیا۔ مملکت و قانون کی سطح پر شرک مر گیا مگر افراد کی سطح پر ابلیس آج بھی اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔

نورِ ہدایت

شرک کی اس لامتناہی تاریکی میں اگر نورِ رسالت کا یہ عظیم مدنی سورج طلوع نہ ہوتا تو شاید آج بھی لوگ یہ کہتے ہوئے مر جاتے کہ اے خدا میں نہیں جانتا تو کون ہے، کیسا ہے اور تجھے کیسے راضی کیا جائے۔ خدا ہمارے آقا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ان گنت درود و سلام بھیجے کہ وہ اگر اپنی جان پر اتنی سختیاں جھیل کر دین حق اور توحید کا علم بلند نہ کرتے تو آج اس دنیا میں کوئی خدا کا عبادت گزار نہ ہوتا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کی لائی ہوئی ہدایت نے انسانوں کو بتایا کہ آقا کون ہے اور غلاموں کو کیسا ہونا چاہیے۔ آپ کی دعاؤں نے بندوں سکھایا کہ خدا اور بندے کا رشتہ کیسا ہونا چاہیے۔ آپ کی سیرت نے مخلوق کو آگاہ کیا کہ عقل و خرد کی طرح دل و نظر کا مسجود بھی وہی ہے۔ آپ کے شب و روز نے دنیا کو دکھایا کہ مطلوب وہی ہے، مقصود وہی ہے اور معبود وہی ہے۔ لا الہ الا اللہ۔

میں جب کبھی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتا ہوں تو خدا کے سامنے یہ گواہی ضرور دیتا ہوں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو اے خدا میرے لیے تو بھی نہ ہوتا۔ اس میں کیا شک ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نہ ہوتی تو ہم قرآن کو جان پاتے نہ ایمان کو۔ نہ خدا کو نہ اسلام کو۔ آج اگر ہم جانتے ہیں کہ خدا حق ہے، آخرت حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے، انبیاء حق ہیں، کتابیں حق ہیں تو یہ صرف آپ کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ ورنہ آج ہم بھی کسی فرشتے کسی بت کو صاحبِ اختیار سمجھ کر نذرانے چڑھاتے، کسی نبی کسی ولی کو پوجتے، چاند سورج کو سجدہ کرتے، بے کس قبر والوں کے آگے گڑگڑاتے، خدا کو، دنیاوی بادشاہوں پر قیاس کر کے اور

بہت دور سمجھ کر، کوئی وسیلہ کوئی شفیع ڈھونڈتے۔ یا پھر خدا اور آخرت کا انکار کر کے ایسی اندھیری راہوں کے مسافر بن جاتے جن کی کوئی منزل نہیں۔ یہ صرف آپ کی ذات تھی جس نے ہمیں ہر اندھیرے سے نکال لیا۔ ہر ظلم ہر گمراہی سے بچالیا۔ خدا آپ پر اپنی شان کے مطابق درود و سلام بھیجے اور پوری انسانیت کی طرف سے آپ کو بہترین بدلہ عطا کرے۔

آگ اور انعام

ہم دوپہر کے وقت مدینہ پاک پہنچے۔ ظہر نکل چکی تھی۔ رضوان بھائی گاڑی پارک کرنے چلے گئے اور میں اپنی اہلیہ، بھابی اور بچوں کے ہمراہ ہوٹل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ خواتین کو ایک طرف بٹھایا اور بہت تلاش کے بعد ایک ہوٹل میں کمرہ لیا۔ اس وقت سعودی عرب میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے بہت زیادہ رش تھا۔ ہمارے ہوٹل سے مسجد کا فاصلہ بہت کم تھا۔ اس لیے اس گرمی میں بھی زیادہ مسئلہ نہ ہوا۔ اس وقت گرمی انتہائی عروج پر تھی۔ مدینے میں گرمی کچھ زیادہ ہی پڑتی ہے۔ اس وقت یہ گرمی لو کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ گرم ہوا کے تھپیڑے جب جسم سے ٹکراتے تو جھلس کر رکھ دیتے تھے۔ ان دنوں روزانہ یہ معمول تھا کہ عصر تک آسمان یونہی آگ برساتا رہتا مگر عصر کے بعد بادل چھا جاتے۔ یہ بادل سورج کے آگے تو پردہ بن جاتے مگر اس وقت تک زمین تندور کی طرح دہک چکی ہوتی۔ پیاسی زمین امید بھری نگاہوں سے ان بادلوں کو تکتی رہتی مگر یہ بادل برس کر نہیں دیتے تھے۔ تاہم یہ ہماری روانگی والے دن برسے اور اس طرح ٹوٹ کر برسے کہ فضا اور زمین کی ساری حدت خنکی میں بدل گئی۔

مجھے اس موسم میں خیال آیا کہ ایسی ہی گرمی ہوگی جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام جنگ تبوک کے موقع پر مدینے سے 700 کلومیٹر دور واقع تبوک کے مقام پر گئے ہوں گے۔ ایک لق و دق صحرا کو اس گرمی میں عبور کر کے اونٹوں اور گھوڑوں پر اتنی دور جانے اور ایک بڑی

فوجی طاقت سے مقابلے کا تصور اتنا دہشتناک تھا کہ کچھ حد نہیں۔ اس پر سال بھر کی محنت پیداوار کی شکل میں تیار کھڑی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا کہ اس دور میں نہیں تھا۔ ورنہ امید یہی تھی کہ شاید پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوتا۔ تاہم جو عظیم ہستیاں اس قابل تھیں کہ انہیں اس عظیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے لیے منتخب کیا جائے، وہ پچھلی آزمائشوں کی طرح، اس امتحان میں بھی پوری اتریں۔ جس کے بعد خدا نے عرب وعجم کی بادشاہت اور خزانے ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔

المسجد النبوی الشریف

مسجد نبوی کی دینی اور روحانی حیثیت سے قطع نظر یہ فنِ تعمیر کا بھی ایسا شاہکار ہے کہ یہ عمارت اگر مسجد نبوی نہ ہوتی تب بھی لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے۔ مسجد اس پورے علاقے پر پھیلی ہوئی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ منورہ کہلاتا تھا۔ میں مسجد کے تعمیری حسن کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ وہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ٹی وی پر ایک دستاویزی فلم کی صورت میں بار بار دکھائی جاتی ہیں۔ تاہم اسے دیکھنے سے دل میں جو تاثیر پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ ٹی وی اسکرین سے نہیں کیا جا سکتا۔ مسجد کے خارجی رنگ کا انتخاب انتہائی خوبصورت ہے۔ مسجد کے نئے تعمیر شدہ حصے میں بڑے بڑے فانوس، خوبصورت روشنیاں، بے گنتی ستون جو سنگ مرمر کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو ملا کر بنائے گئے ہیں اور خوبصورت چھت جس پر مختلف قسم کے ڈیزائن بنے ہیں، یہ سب مل کر ایسا سماں پیدا کرتے ہیں کہ انہیں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہاں ہر طرف اللہ کا نام یا قرآنی آیات لکھی ہوئی ہیں۔ اس حصے میں لوگ صرف جمعے کی نماز میں ہوتے ہیں کیونکہ مسجد اتنی بڑی ہے کہ عام حالات میں لوگ یہاں تک نہیں ہوتے۔ یہیں وہ گنبد ہیں جو بے آواز کھسکتے چلے

جاتے ہیں۔ جب سورج کی روشنی نیچے آتی ہے تب پتا چلتا ہے کہ چھت کھل گئی ہے۔ اندرونی حصہ کی نمایاں خصوصیت وہ صحن ہے جو چھتریوں سے ڈھک جاتا ہے۔ پرانی مسجد کے حصے میں اس قدر رنگ ہیں کہ حد نہیں۔ سارے رنگ بڑے گہرے اور شوخ ہیں۔ لیکن برے نہیں لگتے۔ چھت پر موجود گنبدوں کو قرآنی آیات کی خطاطی سے مزین کیا گیا ہے۔

ہمارے مسجد میں جانے کے بھی وہی اوقات تھے جو مکہ میں تھے۔ یعنی تہجد سے اشراق، پھر ظہر کے لیے اور پھر عصر تا عشا۔ البتہ خواتین کا معاملہ یہاں ذرا مختلف تھا۔ کیونکہ مسجد الحرام کے برعکس یہاں خواتین کی ایک مخصوص جگہ ہے اور روضہ مبارک پر ان کی حاضری کے دو وقت مقرر ہیں۔ صبح سات سے گیارہ تک اور دوپہر دو سے تین۔ اس لیے ہماری خواتین اسی حساب سے جاتیں۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ یہ خواتین سے زیادتی ہے۔ مگر خواتین کی جو حرکتیں اور شور و ہنگامہ دیکھا تو محسوس ہوا کہ یہ رویہ بالکل ٹھیک ہے۔ خواتین کے وقت پر ایک پردہ کھینچ کر رکاوٹ کر دی جاتی ہے۔ اس جگہ سے اتنے شور و غل کی آوازیں آتی ہیں کہ حد نہیں۔ ایک دفعہ میں وہاں بیٹھا تھا۔ خواتین کا وقت ہوا تو وہ باقاعدہ سیٹیاں اور چیخیں مارتی اور بھاگتی ہوئی آئیں۔ یہ ایک مخصوص آواز ہے جو عرب خواتین خوشی کے مواقع مثلاً شادی وغیرہ پر نکالتی ہیں۔ میں نے اس کی کوئی نظیر کہیں اور نہیں دیکھی۔

المسجد النبوی کی چند خاص جگہیں

مسجد نبوی میں تین جگہیں ایسی ہیں جہاں لوگ دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اول ریاض الجنتہ جس کے بارے میں ارشاد گرامی ہے کہ میرے گھر اور منبر کے بیچ کی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ اس جگہ کی نشاندہی کے لیے یہاں سبز رنگ کے قالین بچھے ہوئے ہیں جبکہ باقی جگہ سرخ قالین بچھائے جاتے ہیں۔ لوگ اس جگہ سب سے زیادہ جم کر بیٹھتے ہیں۔ وہ

شاید حصولِ فضیلت کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ مگر میرا اصول ہے کہ مسجد الحرام یا مسجد نبوی کی کسی بھی متبرک جگہ پر میں زیادہ دیر نہیں بیٹھتا۔ میرے نزدیک اس طرح میں اس مسلمان بھائی کا حق ماروں گا جو جگہ کے خالی ہونے کے انتظار میں کھڑا ہوا ہے۔ خدا کے بندوں کا حق مار کر خدا سے کوئی بھلائی نہیں لی جا سکتی۔ لہٰذا میں مختصر وقت کے لیے ایسی جگہوں پر بیٹھتا ہوں۔ ذکر، تلاوت، دعا، نماز جس کا ذہن بنا وہ کیا اور دوسروں کے لیے جگہ چھوڑ دی۔

دوسری جگہ جہاں لوگ ٹوٹتے ہیں وہ مصلیٰ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ نئے آدمی کے لیے اس جگہ کو پہچاننا آسان نہیں کیونکہ مسجد میں تین محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ تاہم اس کی نشانی یہ ہے کہ یہ ریاض الجنتہ کے ساتھ والی محراب میں ہے۔ اس پر عربی میں لکھا بھی ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منبر ہے۔ اس جگہ کھڑے ہو کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی امامت کیا کرتے تھے۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آپ کے سجدے کی جگہ پر محراب تعمیر کرادی تاکہ کسی کے قدم وہاں نہ پڑیں۔ اب جو لوگ یہاں نماز پڑھتے ہیں ان کا سر اس جگہ آتا ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک ہوتے تھے۔ یہاں جگہ حاصل کرنا سب سے مشکل ہے۔ وجہ میں اوپر بیان کر چکا۔ تاہم جو شخص صبح نو دس بجے آئے گا اس کے لیے سب سے زیادہ ممکن ہے کہ وہ یہاں نماز پڑھ سکے۔

تیسری جگہ روضہ مبارک کی سنہری جالیوں کے سامنے والا حصہ ہے جہاں کھڑے ہو کر لوگ سلام پیش کرتے ہیں۔ یہ تین جالیاں ہیں جن میں وسطی جالی پر بنا ہوا پہلا دائرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی نشاندہی کرتا ہے اور اگلے دو دائرے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی۔ اصل قبریں چار دیواری سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اس جگہ لوگ کھڑے ہو کر سلام پڑھتے ہیں اور آگے سے سلام عرض کرتے ہوئے گزرتے بھی رہتے ہیں۔

مدینہ پاک کی زیارتیں

یہاں پہلی دفعہ آنے والا شخص ان جگہوں پر زیارتوں کے لیے ضرور جاتا ہے جنھیں مذہبی یا تاریخی اعتبار سے کوئی اہمیت حاصل ہے۔ مدینہ وہ جگہ ہے جہاں اسلام کی تاریخ بنی۔ یہیں کفارِ مکہ سے مسلمانوں کی عظیم جنگیں پیش آئیں۔ اسلام کے ابتدائی دور کے کئی اہم اور فیصلہ کن واقعات کا ظہور اسی سرزمین پر ہوا۔ اس لیے قابلِ زیارت جگہوں کا ہونا عین فطری ہے۔ ان میں سب سے نمایاں جگہ جنت البقیع کا قبرستان ہے جو مسجد نبوی کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنہری جالیوں کے سامنے سے سلام کرنے کے بعد لوگ جس دروازے سے باہر نکلتے ہیں اسے باب البقیع کہتے ہیں۔ کیونکہ عین اس کے سامنے بقیع کا قبرستان واقع ہے۔ میں جب پہلی دفعہ س 88 میں یہاں آیا تو چھوٹا تھا۔ اپنے آٹھ روزہ قیام کے دوران میں اکثر بقیع چلا جاتا اور ان پیشہ ور لوگوں کے پیچھے ہو لیتا جو بقیع میں موجود تمام اہم شخصیات کی قبروں پر جا کر صاحبِ قبر کا تعارف کراتے تھے۔ اس طرح مجھے تمام اہم صحابہؓ، امہاتؓ المومنین، بناتؓ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آئمہؒ کی قبروں کا علم ہو گیا۔ امہاتؓ المومنین اور بناتؓ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قبریں بالکل سامنے ہیں۔ صحابہ میں اہم ترین شخصیت سیدنا عثمانؓ کی ہے۔ آپ کی شہادت جن حالات میں ہوئی ان کی بنا پر آپ کی قبر کی بے حرمتی کا اندیشہ تھا اس لیے آپ کو بقیع میں بہت دور دفن کیا گیا۔ پہلی دفعہ کے بعد میں دوبارہ اندر نہیں گیا اور اب باہر سے ہی سلام عرض کر دیتا ہوں۔ بقیع کا دروازہ دن میں دو دفعہ کھلتا ہے۔ صبح اشراق کے بعد اور شام میں مغرب سے قبل۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر بقیع آیا کرتے تھے۔

دوسری اہم زیارت مسجدِ قبا ہے۔ یہ اسلام کی پہلی مسجد ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کے وقت قبا میں اپنے قیام کے دوران تعمیر کیا تھا۔ قبا اس زمانے میں مدینے کی

نواحی بستی تھی۔ یہ مسجد طریق الھجرہ کے اختتام پر مدینے کی حدود میں داخلے کے وقت آتی ہے۔ ہم مدینہ آتے ہوئے یا واپسی میں یہاں ضرور آتے تھے۔ کیونکہ ایک روایت میں یہاں دو نفل پڑھنے کا ثواب عمرے کے برابر بیان ہوا ہے۔ خود قرآن میں سورۂ توبہ میں اس مسجد کی تعریف کی گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہاں پیدل یا سوار ہو کر تشریف لاتے۔ ایک اور مسجد جس کی تاریخی اہمیت ہے وہ مسجد قبلتین ہے۔ یہاں روایات کے مطابق تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا۔

مدینہ میں رہ کر کفار کے مقابلے میں مسلمانوں نے دو جنگیں لڑیں۔ ان میں سے پہلی جنگ احد کی تھی۔ یہ سن تین ہجری میں پیش آئی۔ یہ جنگ احد کے اس مشہور پہاڑ کے دامن میں لڑی گئی جس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسے ہم سے اور ہمیں اس سے محبت ہے۔ یہاں آج بھی اس پہاڑی ٹیلے کا کچھ حصہ باقی ہے جس پہ تیر اندازوں کا ایک دستہ خصوصی طور پر تعینات کیا گیا تھا۔ انھی میں سے بعض تیر اندازوں کے اپنی جگہ چھوڑنے سے مسلمانوں کی شکست کا سانحہ وجود میں آیا۔ اس جنگ میں ستر صحابہؓ شہید ہوئے۔ یہاں شہدائے احد کے مزارات موجود ہیں جن میں سب سے نمایاں عم رسول سیدنا حمزہؓ کا مزار ہے۔ دیگر معروف صحابہ میں سے حضرت عبداللہ ابن جحشؓ اور حضرت مصعب بن زبیرؓ بھی یہیں مدفون ہیں۔ یہ مزارات ایک چار دیواری میں بنے ہوئے ہیں۔ دوسری مشہور جنگ خندق یا احزاب کی ہے جو اطرافِ مدینہ میں لڑی گئی۔ اس کے آثار میں صرف اب وہ پانچ مساجد موجود ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ان مقامات پر بعض صحابہ دورانِ محاصرہ خیمہ زن تھے۔ واللہ اعلم۔

یہ ساری جگہیں بالعموم زیارت کہلاتی ہیں اور مسجد النبوی کے باہر کھڑے ڈرائیور کچھ پیسے لے کر لوگوں کو ان سب جگہوں کی زیارت کراتے ہیں۔ میں ان جگہوں کی تاریخی اہمیت کی بنا پر کئی دفعہ وہاں گیا ہوں۔ مگر عام طور پر مدینہ آکر صرف قبا اور بقیع جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی انھی دو

جگہوں پر گیا۔ایک جگہ اور ہے جو تاریخی اہمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ حیثیت رکھتی ہے مگر چونکہ مدینے سے دور ہے اور آج کل کے راستے پر بھی واقع نہیں اس لیے لوگ وہاں نہیں جاتے۔ میری مراد میدانِ بدر سے ہے۔خوش قسمتی سے مجھے وہاں جانے کا بھی موقع ملا۔ میں 1997ء میں اپنے بڑے بھائی عرفان کے ہمراہ مدینے سے واپسی پر وہاں گیا تھا۔ یہاں ایک جگہ شہدائے بدر کے مزارات ہیں۔ جبکہ بدر کے نام سے ایک چھوٹی سی آبادی بھی موجود ہے۔ دیگر تاریخی مقامات کی طرح یہاں بھی کسی قسم کی معلومات پہنچانے کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ سوائے ان صحابہ کرام کے ناموں کے جو اس جنگ میں شہید ہوئے۔

خطاطی اور قرآن

مسجد النبوی میں تین محرابیں ہیں۔ان میں سے دو محرابوں کی پشت اس راستے پر واقع ہے جہاں سے لوگ لائن لگا کر صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کے لیے سنہری جالیوں کے پاس جاتے ہیں۔ایک روز میں وہاں سے گزر رہا تھا کسی بنا پر لوگ رک گئے تو میں اس تحریر کو پڑھنے لگا جو محراب کی پشت پر لکھی تھی۔ یہ عربی میں تھی اور اس میں محراب کی تعمیر کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ ترکی حکومت کے سلطان سلیمان کے زمانے میں اسے بنایا گیا تھا۔سلیمان ترکی ہی نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کا عظیم ترین حکمران تھا جس کے دور میں مسلمان وسطِ یورپ میں آسٹریا کے دارلحکومت ویانا تک جا پہنچے تھے۔ اگلی محراب کے پاس ہم پہنچے تو میں نے اس کی تفصیلات بھی پڑھنی چاہیں۔مگر وہ اس طرح خطاطی کر کے لکھی گئی تھیں کہ بمشکل تمام ہی میرے سمجھ میں کچھ آسکا۔ میں نے ساتھ کھڑے ایک دو عربوں سے پوچھا مگر وہ اتنا بھی نہ پڑھ سکے جتنا میں نے پڑھ لیا تھا۔

اس وقت میرا دھیان اس طرف گیا کہ مجھے اوپر چھت اور گنبدوں پر لکھی قرآنی آیات کو

پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے اس میں بھی مکمل ناکامی ہوئی۔ قدیم زمانے میں شاید عام لوگ خطاطی کو سمجھ لیتے ہوں۔ مگر اب تو اس کی حیثیت ایک آرٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قرآن مجید بہرحال سمجھ کر پڑھنے کی کتاب ہے۔ یہ بات ہمیں ہمیشہ ذہن نشین رکھی چاہیے۔

مدینے کے بازار اور خواتین

مکہ مدینے کا تذکرہ اس وقت تک غیر مکمل رہے گا جب تک کہ یہاں کے بازاروں کا تذکرہ نہ ہو جائے۔ بازار دنیا بھر کی خواتین کی پسندیدہ جگہ ہوتے ہیں۔ مدینے میں لوگ عام طور پر 40 نمازیں پوری کرنے کی غرض سے ہفتہ بھر رکتے ہیں اس لیے یہاں بازاروں کی رونق دوبالا کرنے کے لیے خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ مرد بھی ہوتے ہیں مگر کافی کم۔ پورے سعودی عرب میں معمول ہے کہ نماز کے وقت دکانیں بند ہو جاتی ہیں اس لیے نمازوں کے وقت کو چھوڑ کر باقی اوقات میں اتنی بڑی تعداد میں خواتین یہاں گھومتی ہیں کہ میلے کا سا سماں بندھا رہتا ہے۔ یہاں ہر وہ چیز دستیاب ہے جو لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ خاص طور پر ایک، دو، پانچ اور دس ریال کی اشیا کی دکانیں تو غیر معمولی کشش رکھتی ہیں۔ دو ریال کی دکان پر ہر مال دو ریال کا ہوتا ہے، پانچ ریال کی دکان پر پانچ کا اور دس کی دکان پر دس ریال کا۔ یہ فکس پرائس شاپس سعودی عرب کی خصوصیت ہیں۔ جن میں ہر طرح سستا مگر کارآمد سامان وافر مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ ایسی دکانیں جدہ اور مکہ میں بھی کثرت سے ہیں۔ ٹورنٹو میں بھی میری رہائش کے قریب واقع شاپنگ مال میں ایک دکان ڈالر شاپ کے نام سے تھی جس میں ہر مال ایک ڈالر کا ملتا تھا۔ تاہم اس پر 15 فیصد ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ جبکہ یہاں کوئی ٹیکس نہیں۔

یونیفارم اور کامیابی

مکہ اور مدینہ کے ان بازاروں کا ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اکثر خواتین کا دھیان شاپنگ

میں لگا رہتا ہے۔ ایسی مبارک جگہوں پر آ کر انسان کا اصل کام یہ ہے کہ خدا سے لو لگائے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خود کو جوڑے۔ بازار اس تعلق کا بہت بڑا دشمن ہے۔ ان بازاروں کی شکل میں آنے والوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش پیدا کر دی گئی ہے۔ یہاں ایک طرف خدا کی رحمتیں اپنے بندوں پر ٹوٹ کر برستی ہیں۔ یہ رحمتیں محض فرض نماز پڑھنے سے نہیں ملتیں۔ ان کے حصول کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ انسان خود کو ہر اس چیز سے توڑ لے جو کسی درجے میں اسے خدا اور اس کی یاد سے دور کرتی ہو۔ مگر بدقسمتی سے اس دور میں ظاہری دین داری کا رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے۔ اس طرزِ فکر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان چند ظاہری اعمال کی ادائیگی کے بعد اپنے آپ کو فارغ محسوس کرتا ہے۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور بات کی اہمیت کی وجہ سے پھر دہرا رہا ہوں کہ دین ظاہری اعمال سے شروع ہوتا ہے ان پر ختم نہیں ہوتا۔ اسکول کا یونیفارم پہن کر اور کلاس میں حاضر ہو کر ایک بچہ طالب علم بنتا ہے۔ جبکہ امتحان میں پاس ہونا ایک الگ چیز ہے جس کے اپنے اور بہت سے تقاضے ہیں۔ کامیابی کا سفر تو بڑا مشکل اور دشوار گزار ہے۔ ہر شخص اس بات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ لیکن بات وہی ہے کہ ہم دنیا کے معاملے میں بہت ہوشیار ہیں مگر آخرت اور خدا کے معاملے میں آخری حد تک بے وقوف۔

ہم حج و عمرے میں نہیں تمام عبادتوں میں یہی رویہ اپناتے ہیں۔ مثال کے طور پر روزے کو لے لیں۔ جیسے تیسے روزہ رکھ لیا۔ لیکن اس کے بعد سارا زور ٹائم پاس کرنے پر ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہر جائز و ناجائز تفریح کا انتظام کیا جاتا ہے۔ فلمیں، کہانیاں، گپ بازی تو رمضان کے عام معمولات ہیں۔ کچھ نہیں تو سحر و افطار کی تیاری پر ایسا زور ہوتا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ لگتا ہے کہ لوگ روزے کے لیے سحر و افطار نہیں کرتے بلکہ سحر و افطار کے لیے روزہ رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ رمضان میں اتنا کھا لیتے ہیں کہ رمضان کے علاوہ بھی اتنا نہیں کھاتے ہوں گے۔ رمضان میں

اشیائے صرف کی قیمتیں بڑھنے کا تو بڑا شور ہوتا ہے مگر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ قیمتیں بڑھتی کیوں ہیں۔ چیزوں کی طلب اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تاجر فائدہ اٹھانے کے لیے چیزیں مہنگی کر دیتے ہیں۔لوگ خریدنا چھوڑ دیں تو سب چیزیں سستی ہو جائیں گی۔

ہر ظاہری عبادت اس بنا پر فرض کی گئی ہے کہ اس کا کوئی نتیجہ نکلنا چاہیے۔ یہ نتیجہ محض رسمی خانہ پری سے نہیں نکلتا۔ دین کا پورا ظاہری ڈھانچہ جسم پر اپلائی ہوتا ہے مگر ساتھ ساتھ اپنی روح، اپنے دل اور اپنے دماغ کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ نتیجہ ان کی سطح پر ہی مطلوب ہے۔ یہ اس دور کے پورے دینی کام کا المیہ ہے کہ ظاہر اور باطن کا جو حسین توازن دین نے عطا کیا تھا وہ اس میں بری طرح مجروح ہو چکا ہے۔اس لیے دیندار بڑھتے چلے جا رہے ہیں، دینداری نہیں بڑھ رہی۔

سعودی عرب کا رمضان

رمضان کا ذکر آ گیا ہے تو ذرا سعودی عرب کے رمضان کا بھی حال بیان ہو جائے۔ یہاں رمضان ایسا ہوتا ہے کہ کم از کم ہمارے خطے والے اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے یہ عبادت کا مہینہ ہوتا ہے مگر یہاں یہ تفریح کا سیزن ہوتا ہے۔تفریح خالی پیٹ تو ہو نہیں سکتی۔ اس لیے ساری رات جاگا اور سارا دن سویا جاتا ہے۔ رات بھر سڑکوں، بازاروں اور شاپنگ سنٹرز میں ایسی گہما گہمی ہوتی ہے کہ حد نہیں۔ میرے پاس اعداد و شمار تو نہیں لیکن اندازہ ہے کہ اربوں ریال اس موقع پر خرچ کیے جاتے ہیں۔کھانے پینے، کپڑے اور زیورات پر پانی کی طرح پیسہ بہایا جاتا ہے۔تراویح کے بعد شہر میں ٹریفک کا ایسا رش ہوتا ہے کہ گاڑی چلانا دشوار ہو جاتا ہے۔شاپنگ سنٹرز کے باہر پارکنگ کی جگہ نہیں ملتی۔

ان دنوں ٹی وی پر خصوصی تفریحی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ڈرامے، فلمیں، اسٹیج

پروگرامز، گانے، کامیڈی پروگرامز ہر چینل سے نشر ہوتے ہیں۔نئ انگریزی فلمیں بااہتمام دکھائی جاتی ہیں۔خیال رہے کہ سعودی عرب میں گھر گھر ڈش لگی ہوئی ہے۔سعودی عرب کے اپنے چینلز کا ضابطۂ اخلاق بہت سخت ہے مگر بعض عرب ملکوں کے چینلز مغربی معیارات کے حامل ہوتے ہیں۔ رمضان میں اسکولوں کی چھٹیاں ہوجاتی ہیں۔رات بھر جاگنے کے بعد لوگ دفتروں میں بہت دیر سے جاتے ہیں اور جا کر بھی اونگھتے رہتے ہیں۔عملی طور پر ان دنوں دفتروں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔آخری عشرے میں تو یہ ہنگامہ عروج پر پہنچ جاتا ہے۔علمائے کرام اس صورتحال پر احتجاج کرکر کے تھک گئے مگر لوگوں کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ بہرحال اہلِ شوق کے لیے ان حالات کے باوجود بڑی خیر و برکت کے سامان موجود ہیں۔ مکہ اور مدینہ کا رمضان تو لوٹنے کی جگہ ہے۔زائرین اللہ کی رحمت کو لوٹتے ہیں اور ہوٹل والے زائرین کو۔وہ کمرہ جو عام دنوں میں تیس ریال کا دستیاب ہوتا ہے، آمدِ رمضان پر سو اور آخری عشرے میں تین سو ریال کا ہوجاتا ہے۔تراویح کے وقت تو وہ سماں ہوتا ہے کہ آسمان سے نور اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ستائیسویں اور انتیسویں شب میں بلا مبالغہ لاکھوں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ مکہ، مدینہ دونوں جگہ افطاری کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ بالخصوص مدینے والوں کی شانِ مہمان نوازی اس وقت عروج پر ہوتی ہے۔عام مساجد میں بھی تراویح کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔مگر ہر جگہ آٹھ رکعتیں پڑھائی جاتی ہیں۔ وتر میں اجتماعی دعا ہوتی ہے جو بڑی غیر معمولی اور طویل ہوتی ہے۔آخری عشرے میں اجتماعی تہجد کی نماز بھی شروع ہوجاتی ہے اور وتر و دعا اس کے بعد ہوتے ہیں۔

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی

مدینہ منورہ اور مسجد النبوی الشریف سے مجھے غیر معمولی محبت ہے۔ یہاں آکر مجھے ہمیشہ ایسا سکون ملتا ہے جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔میرے لیے بہت آسان ہے کہ میں گھنٹوں

یہاں بیٹھا رہوں۔ یہاں گھومتا رہوں۔ یہاں کے در و دیوار کو تکتا رہوں۔ یہاں کا ماحول اپنے اندر غیر معمولی سکون رکھتا ہے جو انسان کی روح کو آسودہ کر دیتا ہے۔ وہ آسودگی جو دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مجھے بار بار یہاں حاضری اور طویل قیام کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔لیکن اس دنیا کا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں ہر لمحہ گزر جاتا ہے۔ اچھا ہو یا برا۔ اس دفعہ بھی یہی ہوا۔ یہ پرسکون لمحے بیت گئے۔ ہم تیسرے دن مدینے سے روانہ ہوئے۔ راستے میں مسجد قبا میں نوافل ادا کیے۔ اس وقت دھوپ نے ہر شے کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ مگر کس کو خبر تھی کہ کیسی ٹھنڈی بارش ہونے والی ہے۔ اس بارش اور راستے کے حالات میں پیچھے بیان کر چکا ہوں۔لیکن مغرب سے لے کر مشرق تک، اپنے اس سفر میں، میں نے یہ دیکھا کہ انسانیت کا وجود اسی طرح جھلس رہا ہے جیسے مدینے کی سرزمین تپ رہی تھی۔ انسانیت شرک کے بعد اب الحاد کے ہاتھوں ستائی جا رہی ہے۔ مغرب میں روحِ انسانی منجمد ہو چکی ہے اور مشرق میں جسم سلگ رہے ہیں۔

ساڑھے چودہ سو سال قبل اس سرزمین کے باسیوں کو خدا نے توحید کے عظیم مشن کے لیے چنا تھا۔ آج ایک دفعہ پھر انسانیت اپنے حالات کی خاموش زبان میں چیخ چیخ کر خدا کے نام کی دہائی دے رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا بہترین حصہ اس کے ابتدائی لوگ تھے۔ مگر اس امت کا آخری حصہ بھی اپنی فضیلت کے اعتبار سے کم نہیں۔ مدینے کی برکھا نے، سلگتی زمین نے جس سے آسودگی پائی، مجھے پیغام دیا کہ اب اس امت کے آخری حصے کے برسنے کا وقت آ رہا ہے۔ انسانیت ایک دفعہ پھر آسودہ ہونے کو ہے۔ آج جو آسودگی مدینے میں پھیلی ہے عنقریب پوری انسانیت اس کے حلقے میں سمٹ آئے گی۔

وہ جو چاہے تو......

مدینے سے ہفتے کے دن واپسی ہوئی تھی۔ چار دن بعد جمعرات کو میں اور اہلیہ مکہ کے لیے

صبح ہی صبح نکل گئے۔ جمعرات اور جمعے کو وہاں رکے اور جمعہ پڑھ کر لوٹ آئے۔ اس ہفتے جمعرات کے دن میری روانگی تھی۔ روانگی سے قبل منگل کے دن رضوان بھائی کے ہمراہ ہم سب الوداعی طواف کے لیے مکہ آئے۔ اس روز مکہ بہت بدلا بدلا لگ رہا تھا۔ ہر جگہ نور اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جاب چھوڑ کر جب میں یہاں سے رخصت ہوا تو آخری دفعہ اپنی اہلیہ کے ساتھ حرم آیا تھا۔ اس وقت ہم دونوں بہت غمگین تھے۔ مگر اِس دفعہ ایسا نہ تھا۔ بے قراری تو تھی مگر ساتھ میں قرار بھی تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ انسان خدا کے گھر کو چھوڑ رہا ہو، مگر یہ زیادہ اہم ہے کہ خدا انسان کو نہ چھوڑے۔ رخصتی کے اس صبر آزما لمحے میں میرا احساس تھا کہ خدا نے ہمیں نہیں چھوڑا۔ لیکن کچھ بھی ہو مدینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الوداع کہنا اور یہاں حرم کو آخری دفعہ دیکھنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ دل والوں کا سینہ پھٹ جاتا ہے۔ نہ ہم دل والے تھے نہ ہمارا سینہ پھٹا۔ خاموشی سے چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ بس بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے گئے۔ ہاں خدا سے اتنی دعا ضرور کی کہ ہر بار کی اس جدائی سے دل بہت گھبراتا ہے۔ تو قادرِ مطلق ہے۔ چاہے تو بلا استحقاق جنت کی اس بستی میں بسا دے جہاں کوئی ملاقات آخری نہیں ہوگی۔ جہاں ماضی کی یادیں اداس کریں گی نہ مستقبل کی بے یقینی ستائے گی۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوسیوں کو صبح وشام خدا کے دربار میں حاضری نصیب ہوگی۔ خدا کا ظرف اس کی ذات کی طرح ہی اعلیٰ ہے۔ وہ جو چاہے تو کیا نہیں ممکن۔

حکیمِ سفر

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب ہمیں اس بہشت سے نکلنا تھا۔ میرے ساتھ میری اہلیہ کے علاوہ سالی کو بھی کراچی جانا تھا۔ فلائٹ صبح پونے چار کی تھی اور اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ رات ہم سب نے جاگ کر گزاری۔ دو بجے روانہ ہوئے۔

آخر میں سب لوگوں سے گلے ملے۔ میری ساس، سسر، رضوان بھائی، بھابی، شہیر اور جویریہ سب چھوڑنے آئے تھے۔ پچھلی دفعہ میرے جاب چھوڑ کر یہاں سے جانے پر سب بے حد دل گرفتہ تھے۔ مگر غم کی یہ عجب تاثیر ہے کہ جب بار بار ملتا ہے تو اسے برداشت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس دفعہ ایسی غمگینی کی کیفیت نہ تھی۔ جہاز میں پہنچے تو پتا چلا کہ ہماری سیٹ فرسٹ کلاس میں کی گئی ہے۔ اس نظرِ کرم کی کوئی اور وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی سوائے اس کے کہ یہ اللہ کا احسان تھا۔ جہاز بلند ہوا تو جدہ کی روشنیوں پر الوداعی نظر ڈالی۔ خدا کی دھرتی کو آخری سلام کہا۔ اور سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ سیٹ بے حد آرام دہ تھی۔ تین چار طریقوں سے اپنی سہولت کے حساب سے اسے ایڈجسٹ کیا جا سکتا تھا۔ مگر مجھے یہ سیٹ سکون نہیں دے پا رہی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے سے بار بار مختلف مناظر گزر رہے تھے۔ مدینہ، مکہ اور جدہ میں اپنے مہینے بھر کے قیام کے سارے لمحات ایک فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ میں اسی کیفیت میں تھا کہ حضرتِ اقبال کا دلپذیر کلام میرے کانوں میں گونجنے لگا۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

باغِ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

سفرنامہ جنوب مشرقی ایشیا

سفر اور سقر

اردو زبان کے کلاسیکی دور میں ایک مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور گزرے ہیں۔ وہ مشکل الفاظ سے آراستہ اور نظم کے انداز میں نثر لکھنے کے لیے مشہور تھے۔ انھوں نے کہیں لکھا تھا کہ سفر اور سقر (جہنم) کی صورت ایک ہے، ان سے بچنا نیک ہے۔ ان کا یہ جملہ زمانۂ قدیم کی ان مشکلات کا بہت خوبصورت بیان ہے جو دورانِ سفر لوگوں کو پیش آیا کرتی تھیں۔ مشینی دور سے قبل سفر کا مطلب بے وطنی کا وہ طویل وقفہ تھا جو ہر طرح کی مشکلات اور خطرات سے پر ہوتا تھا۔ دورِ جدید میں سفر بہت آرام دہ ہو چکا ہے، مگر کچھ لوگوں کے لیے آج بھی یہ ایک مشکل کام ہے۔ میرا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ لیکن لگتا ہے کہ میرے ہاتھ میں سفر کی لکیر شاید عام لوگوں سے زیادہ طویل ہے۔ اس لیے بار بار مجھے سفر کے مواقع پیش آجاتے ہیں۔

مئی 2008 میں مجھے جنوب مشرقی ایشیا کے تین ممالک سنگاپور، ملائیشیا اور تھائی لینڈ جانے کا موقع ملا۔ سفر ذاتی نوعیت کا تھا اس لیے اس کی روداد لکھنے کا کوئی جواز میرے پاس نہ تھا۔ لیکن سفر مجھے جس وجہ سے ناپسند ہے وہی وجہ قلم اٹھانے کا سبب بھی بنی ہے۔ مجھے معمول کی زندگی گزارنا پسند ہے۔ جبکہ سفر میں عام روٹین کی لائف اور معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ قیمت دینے کے بعد سفر کے نتیجے میں انسان ایک نئی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس دنیا میں پہنچ کر شعور کی وہ آنکھ کھل جاتی ہے جو معمول کی زندگی میں کم ہی بیدار رہتی ہے۔ یہ آنکھ انسانی ذہن کے

معاملات کو دیکھنے کا ایک نیا انداز دیتی ہے، حقائق اور تصورات کے درمیان تفریق سکھاتی ہے، مسائل کے ادراک اور حل کا ایک نیا زاویہ دیتی ہے، دو چیزوں کے درمیان فرق کرنا سکھاتی ہے اور سب سے بڑھ کر اگر ایمان کی روشنی حاصل ہے تو معرفت کی اُس منزل تک پہنچا دیتی جو ایک مؤمن کے لیے سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔ سفر کے یہی روحانی اور اس کے علاوہ یقیناً بہت سے مادی فوائد بھی ہیں جن کی بنا پر سفر کو وسیلۂ ظفر بھی کہا گیا ہے۔

خوشی اور معرفت

میں روانہ ہونے لگا تو دوست احباب میں سے ہر شخص نے خوشیوں کی دعا دی۔ وہاں پہنچ کر بھی یہ لوگ رابطے میں رہے اور یہی دعا دہراتے رہے۔ مگر میں نے پروردگار سے مستقل یہ دعا کی مجھے معرفت ملے۔ خوشیوں سے کس کافر کو انکار ہوسکتا ہے؟ مگر جس خوشی کے پیچھے معرفت نہ ہو وہ اکثر دل کی سختی کا سبب بن جاتی ہے۔ انسان پر غفلت چھا جاتی ہے۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوتا اور وہ پروردگار کی حضوری سے نکل جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خوشی کی اس حیثیت کو جگہ جگہ اپنے نافرمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے۔ وہاں اگر خوشی مثبت انداز میں بیان ہوئی ہے تو جنت کی کامیابی کے ضمن میں یا اس دنیا میں قرآن پاک کی عظیم نعمت کے حوالے سے جو دراصل سارے حقائق اور معرفت کا بنیادی سرچشمہ ہے۔

خوشی ویسے بھی اپنی ذات میں کسی چیز کا نام نہیں۔ یہ ہمیشہ کسی دوسری چیز کے پانے کا ایک نتیجہ ہوتی ہے۔ اور اس دنیا میں تو انسان جو پائے گا وہ بہت جلد کھو دے گا۔ اس لیے یہاں کی ہر خوشی عارضی اور ہر لذت فانی ہے۔ اصل خوشی کی جگہ تو آگے آ رہی ہے۔ جہاں ہمیشہ اور ہر لمحہ رب کی عنایت کو ایک نئی شان کے ساتھ پانا ہوگا۔ جہاں کا ہر ایک لمحہ، ہر ایک منظر، ہر ایک محفل اور ہر ایک محمل خوشیوں، لذت اور سکون کا وہ خزانہ انسان کو عطا کرے گا کہ انسان اس دنیا کی ہر تکلیف، ہر دکھ اور ہر محرومی کو بھول جائے گا۔

میں اس سفر کی روداد تو خیر یہاں بیان نہیں کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا یہ سفر بالکل ذاتی نوعیت کا تھا، مگر جیسا کہ اوپر میں نے عرض کیا کہ حالتِ سفر میں شعور کی آنکھ خود بخود بیدار ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد نہ ذہن کو روکنا ممکن ہوتا ہے اور نہ قلم کو۔ میں چاہوں تو اپنی ذات کے لیے کچھ لکھ کر اپنے پاس رکھ کر یہ مشاہدات محفوظ کرلوں لیکن میری زندگی کا مقصد اپنے رب کی ذات وصفات سے انسانوں کو متعارف کرانا ہے۔ نیز مجھے اپنی قوم کی تعمیر وترقی سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس لیے میں کم ازکم ان دو حوالوں سے لکھی گئی چیزوں کو اپنے قارئین تک ضرور پہنچانا چاہتا ہوں۔ اور اس لیے بھی کہ میں جانتا ہوں کہ قارئین کی ایک بڑی تعداد ہے جن کے لیے میں گھر کا ایک فرد ہوں۔ ان سے یہ سب شیئر نہ کرنا شاید ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

ائیر پورٹ کا محشر

ہوائی سفر کا پہلا مرحلہ ائیر پورٹ ہوتا ہے۔ ائیر پورٹ مجھے ہمیشہ حشر کے میدان کی یاد دلاتا ہے۔ حشر اس مختصر اور فانی دنیا کے بعد شروع ہونے والی اصلی اور ابدی زندگی کا پہلا مرحلہ ہوگا۔ صور پھونکا جائے گا۔ لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ اعمال کا جائزہ لیا جائے گا۔ اور پھر لوگوں کے اعمال کے مطابق ان کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ ائیر پورٹ بھی کچھ ایسی ہی جگہ ہے۔ یہاں کسٹم پر سامان چیک ہوتا ہے، وہاں بھی کسٹم پر اعمال چیک ہوں گے۔ یہاں کی سیکیورٹی پر جامہ تلاشی ہوتی ہے، وہاں کی سیکیورٹی پر اخلاقی وجود کی جامہ تلاشی ہوگی۔ یہاں کاؤنٹر پر سامان کا وزن کر کے سیٹ دی جاتی ہے، وہاں میزان پر اعمال کا وزن کیا جائے گا اور جنت یا جہنم میں مقام کا فیصلہ کیا جائے گا۔ یہاں امیگریشن پر پاسپورٹ اور ویزا چیک ہوتا ہے اور وہاں حساب کتاب میں ایمان کا پاسپورٹ اور اخلاق کا ویزا چیک کیا جائے گا۔

میں امیگریشن کی لائن میں کھڑا یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا اور ساتھ میں قرآنِ کریم کی یہ

آیت پڑھ رہا تھا: رَبَّنَـا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ، (اے ہمارے رب تو لوگوں کو ایک ایسے دن جمع کرنے والا ہے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ وعدہ خلاف نہیں کیا کرتے) کہ اچانک میری اہلیہ نے مجھ سے پوچھا: آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ میں جس کیفیت میں تھا، اِس میں اُن کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا لیکن میرے دل نے کہا کہ میں اس وقت جو سوچ رہا ہوں وہ ہو کر رہے گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ نہ جانے کتنے لوگ دیکھتے ہوں گے لیکن جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ کم ہی لوگ سوچ پاتے ہوں گے۔ یہ سوچ مجھ میں میرے اساتذہ سے آئی ہے۔ لیکن اس سوچ کا حقیقی ماخذ قرآن مجید ہے جو اہل ایمان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ انفس و آفاق کی نشانیوں میں گم ہونے اور مشاہدات میں کھو جانے کے بجائے انہیں اپنے روح کی غذا بنائیں اور ان کے ذریعے اپنے ایمان میں اضافہ کریں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآنِ مجید کا مصرف اب بس یہی رہ گیا ہے کہ بلاسمجھے پڑھ کر مردے بخشوائے جائیں اور دلہنوں کو اس کے سائے میں رخصت کیا جائے۔ اس رویے کے بعد کون قرآنِ مجید کو سمجھ کر پڑھے گا اور کون اس کی بنیاد پر غور و فکر کو اپنی عادت بنائے گا!

دورِ جدید کے دو پہلو

ہماری فلائٹ ساڑھے گیارہ بجے شب روانہ ہوئی۔ پانچ گھنٹے بعد ہم بنکاک کے ائیر پورٹ پر اترے جہاں سے دو گھنٹے بعد ہمیں سنگاپور کے لیے اگلی فلائٹ لینی تھی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے ہم نے کوئی جگہ تلاش کرنا چاہی تو وہاں ایک بہت اچھی مسجد مل گئی۔ ائیر پورٹ کے اندر بنی ہوئی اتنی بہتر مسجد میں نے کسی اور ائیر پورٹ پر نہیں دیکھی۔ واپسی پر اسی ائیر پورٹ کے اندر بنی ہوئی ایک اور مسجد میں نمازِ مغرب ادا کی۔ اس مسجد میں مرد اور خواتین کے لیے نماز کی الگ الگ جگہ کے ساتھ الگ الگ وضو خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس مسجد کے باہر مجھے ایک عجیب

تجربہ ہوا جس سے دورِ جدید کے دو پہلو مجھ پر واضح ہوئے۔

میں اور میری اہلیہ نماز کے بعد مسجد سے باہر آئے تو دیکھا کہ ایک خاتون مسجد کے شیشوں سے جھانک کر اندر دیکھ رہی ہیں۔ مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید ان خاتون کو کوئی غلطی لگی ہے اور یہ اس جگہ کو ڈیوٹی فری لاؤنج کا کوئی دفتر یا دکان سمجھ رہی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ مسلمانوں کی عبادت کی جگہ ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ میں دراصل اپنے شوہر کو تلاش کر رہی ہوں جو نماز پڑھنے مسجد میں گئے ہیں۔

ان کا یہ جواب میرے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔ کیونکہ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے کوئی مسلمان خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ عربی ہیں، لیکن ہر عربی مسلمان نہیں ہوتا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ حسنِ ظن کر سکا کہ وہ کسی مسلمان کی غیر مسلم بیوی ہیں۔تاہم وہ اگر مسلمان تھیں تو اپنے دین کا کوئی اچھا تعارف نہیں کرا رہی تھیں اور اگر غیر مسلم تھیں تو اپنے شوہر کے دینی ذوق کا کوئی اچھا تعارف نہ تھیں۔

آزادی دورِ جدید کی بنیادی قدر ہے۔اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ مذہبی آزادی عام ہوگئی ہے۔اسی کا نتیجہ تھا کہ جس ملک میں لوگ خدا کو نہیں مانتے وہاں خدا کی عبادت کے لیے مسجد موجود ہے۔مگر آزادی کا ایک دوسرا نتیجہ عریانی ہے۔میڈیا نے اس کو فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور خواتین اس کا سب سے زیادہ نشانہ بنی ہیں۔خوبصورت نظر آنا خواتین کی کمزوری ہے اور میڈیا کے زیرِ اثر وہ اس مقصد کے لیے بلاتکلف عریانی کا سہارا لیتی ہیں۔ دوسری طرف مردوں پر اس کے اثرات یہ ہوئے ہیں کہ وہ حدِ اعتدال سے زیادہ حسن پرست ہو گئے ہیں۔شادی کرتے وقت ان کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے کہ عورت خوبصورت ہو۔عورت کا دین اور اس کی سیرت بڑی حد تک غیر متعلق باتیں ہو گئی ہیں۔اس رویے کا لازمی نتیجہ نئی نسلوں کی بدترین تربیت ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے ہم بھگت رہے ہیں۔

ہمارے سفر کا نقشہ

ہم دو گھنٹوں میں پورا ملائیشیا عبور کر کے سنگاپور پہنچے۔ آگے بڑھنے سے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سفر کے دائرے میں آنے والے تینوں ممالک کا جغرافیہ واضح کر دیا جائے۔

سنگاپور، ملائیشیا اور تھائی لینڈ دنیا کے جس خطے میں واقع ہیں اسے ساؤتھ ایسٹ ایشیا کہتے ہیں یعنی جنوب مشرقی ایشیا۔ پاکستان سے جنوب مشرق کی سمت آگے بڑھنے پر پہلے ہندوستان اور پھر بنگلہ دیش اور میانمار (برما) آتے ہیں۔ برما جس خطے میں واقع ہے وہ ایک جزیرہ نما (Peninsula) ہے یعنی خشکی کا ایک ایسا حصہ ہے جس کے تین اطراف پانی ہے۔ اس خطے میں برما کے علاوہ لاؤس، ویتنام، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ واقع ہیں۔ اس خطے کے مشرق اور مغرب کی طرح جنوب میں بھی سمندر ہے، مگر تھائی لینڈ سے خشکی ایک پٹی کی شکل میں مزید جنوب کی سمت سمندر میں آگے بڑھتی ہے۔ یہ پٹی آگے چل کر قدرے چوڑی ہو جاتی ہے اور پھر بتدریج پتلی ہونے لگتی ہے۔ خشکی کی یہ چوڑی پٹی جس کے تین طرف سمندر اور ایک طرف تھائی لینڈ ہے، ملائیشیا کا مرکزی حصہ ہے جسے جزیرۂ نما ملائیشیا (Peninsular Malaysia) کہتے ہیں۔ اس پٹی کی نوک پر چھوٹا سا سنگاپور واقع ہے۔ گویا اس چوڑی پٹی کے ایک طرف تھائی لینڈ ہے جو ایشیا سے متصل ہے اور دوسری سمت سنگاپور ہے جس سے آگے سمندر اور سمندر کے بعد جزیروں کی شکل میں ملائیشیا کا بقیہ حصہ اور انڈونیشیا آتے ہیں۔

وقت کا خزانہ

سنگاپور پہنچ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم چند گھنٹوں کے اندر تقریباً پانچ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر کے ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وقت کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس کو درست استعمال کر کے انسان کیا کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کے لیے تو بلاشبہ وقت ہی سب کچھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسے جو مہلتِ عمر دی ہے وہ پچاس ساٹھ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بہت کم وقت ہے۔ لیکن انسان کے پاس یہ مواقع موجود ہیں کہ اس وقت کو صراطِ مستقیم پر چل کر گزارے تو قیامت کے بعد قائم ہونے والی دنیا میں وہ عظیم مقامات حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اس مختصر وقت میں ایسے اعمال تخلیق کر سکتا ہے جو نتائج و اثرات کے اعتبار سے کبھی نہ ختم ہوں۔

اپنے وقت کا درست استعمال انسان کو کیسی عظیم بادشاہی سے نواز سکتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سورج زمین سے تقریباً نو کروڑ میل دور ہے۔ جبکہ سورج سے قریب ترین ستارہ Proxima Centauri تقریباً 252 کھرب میل دور ہے۔ یہ وہ فاصلہ ہے جو روشنی 186282 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سوا چار برس میں طے کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ بندۂ مؤمن کے اُن لمحات کا بدلہ جو اِس نے نیک اعمال میں گزارے اس طرح عطا فرمائے کہ ہر ہر لمحے میں کیے گئے عملِ صالح کے عوض وہ اسے ایک ستارے کی بادشاہی انعام میں عطا کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندۂ مؤمن ایک ایک لمحے میں کوئی ایسا عمل کر سکتا ہے جو اسے 252 کھرب میل دور واقع ستارے کی بادشاہی دلوا دے۔ آج یہ ستارے بظاہر آگ کے گولے نظر آتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ ان ستاروں کو آنے والی زندگی میں سرسبز و شاداب باغات بنا دیں اور پھر انعام کے طور پر اپنے صالح بندوں کو عطا کر دیں۔

جدید فلکیات کی ترقی نے یہ بات واضح طور پر بتا دی ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کی زندگیوں کو ملا کر اُن کے مجموعی لمحات گنے جائیں تو جتنے لمحات بنیں گے، کائنات میں موجود ستاروں کی تعداد اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس دنیا میں آج کے دن تک پیدا ہونے والے لوگوں کی تعداد کا غیر حتمی اندازہ تقریباً 100 ارب کے لگ بھگ ہے۔ ہر انسان کی اوسط عمر 63 تصور کر لی جائے تو ایک انسان کی زندگی میں کل دو ارب لمحات آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ

اولین سے آخرین تک آنے والے کل انسانوں کی تعداد یعنی سو ارب کی زندگی کے کل لمحات کو اگر لکھنا ہو تو اس طرح لکھیں گے:

200,000,000,000,000,000,000

مجھے نہیں معلوم کے اردو میں اس عدد کو کیسے بیان کریں گے لیکن یہ عدد 2 کے آگے 20 دفعہ صفر لگا کر لکھا گیا ہے۔ قارئین کو یہ تعداد شاید بہت زیادہ لگے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں ستاروں کی کل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ سائنسدانوں کے مطابق ستاروں کی جو تعداد ابھی تک دیکھی گئی ہے اسے بیان کرنا ہو تو 7 کے آگے 22 دفعہ صفر لگانا ہوگا۔ یعنی ہر انسان کی ہر سانس کے مقابلے میں ستارے 700 گنا زیادہ ہیں۔ یاد رہے کہ ستاروں کی اصل تعداد نہ صرف اس سے کہیں زیادہ ہے بلکہ مزید ستارے ہر لمحہ وجود میں آ رہے ہیں۔

ان اعداد و شمار سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ جس جنت کی تخلیق کی تیاری کر رہے ہیں وہ انسانوں کے اندازوں سے کہیں زیادہ بڑی ہے اور اس میں ملنے والا اجر اس سے کہیں زیادہ ہے کہ انسان کے ہر لمحے کے بدلے میں اسے 252 کھرب میل دور ایک ستارہ دے دیا جائے۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کو زندگی کا ہر لمحہ یہ سوچ کر گزارنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اسے دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اتنا کچھ کہ وہ ایک لمحے میں کم از کم 252 کھرب میل کی ترقی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں میں نے آٹھ گھنٹوں میں کل پانچ ہزار میل طے کیے تھے جو یقیناً بہت کم ہیں۔ لیکن جدید سائنس میں انسان کی ترقی نے اس کو ان امکانات سے ضرور آگاہ کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے وقت میں رکھ دیے ہیں۔ وقت کیسا عظیم خزانہ ہے مگر لوگ کس بے دردی سے اسے ضائع کرتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جنت میں سو ارب انسانوں میں سے بہت کم ہی جا سکیں گے۔

سنگاپور: جدید مغربی دنیا کا مشرقی ایڈیشن

ہم سنگاپور تین دن رہے۔ ان تین دنوں میں اس شہر کے متعلق میرا تاثر یہی قائم ہوا کہ یہ جدید مغربی دنیا کا مشرقی ایڈیشن ہے۔ سیموئل ہنگٹن نے سرد جنگ کے بعد کی دنیا کے حوالے سے یہ بحث اٹھادی تھی کہ آئندہ جنگ نظریات کے مابین نہیں بلکہ تہذیبوں کے مابین ہوگی۔ آنے والی دنیا میں ایک طرف مغربی تہذیب ہوگی جس نے دورِ جدید کو جنم دیا ہے اور دوسری طرف اس کے مدمقابل مسلم اور چینی تہذیبیں ہوں گی۔ ہنگٹن کی پیش گوئی کے مطابق مسلم اور مغربی تہذیب کا ٹکراؤ شروع ہوگیا ہے۔ جبکہ چینی تہذیب کی قیادت چونکہ انتہائی باشعور لیڈر کررہے ہیں اس لیے وہ اپنی تہذیب کو ہر قسم کے ٹکراؤ سے بچا کر معاشی اور فوجی ترقی کی راہ پر گامزن کیے ہوئے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ مسلم مغرب ٹکراؤ میں دونوں تہذیبیں بے حد کمزور ہوجائیں گی اور اس کے بعد چینی تہذیب باآسانی پوری دنیا پر غالب ہوجائے گی۔

خیر بات ایک دوسری طرف نکل گئی۔ اصل بات جسے میں زیرِ بحث لانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہنگٹن کے مطابق دنیا بھر میں تیزی سے پھیلتا ہوا جدید کلچر جو بظاہر مغربی کلچر کے غلبہ کا تاثر دیتا ہے یعنی مغربی لباس، پیپسی، میکڈونلڈ وغیرہ مغربیت کی علامت نہیں، بلکہ جدیدیت کی علامت ہے۔ یہ اثرات کسی عالمی مغربی تہذیب کو پیدا نہیں کرتے بلکہ مختلف تہذیبوں کے جدید ہونے کی علامت ہیں۔

مشرق کے جدید ہونے والی بات مجھے سنگاپور آکر ٹھیک محسوس ہوئی۔ میں نے جتنے جدید اور ترقی یافتہ مغرب کے بڑے شہروں کو دیکھا، اتنا ہی جدید اور ترقی یافتہ سنگاپور محسوس ہوتا تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سنگاپور معیارِ زندگی کے اعتبار سے دنیا کے معیاری ترین ملکوں میں سے ایک اور ایشیا میں جاپان کے بعد دوسرا ملک ہے۔ یہاں کی بلند عمارات، پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام، بڑے

بڑے شاپنگ سنٹر، تہذیبِ جدید کے دیگر مظاہر یعنی تیز زندگی، عورتوں کا بڑی تعداد میں گھر سے باہر نکل کر کام کرنا، کھانا گھر سے باہر کھانا، غرض ہر چیز زبانِ حال سے یہ بتا رہی تھی کہ یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ مکڈونلڈ، پیپسی اور مغربی لباس بہت عام تھا۔ بلکہ جو حبس زدہ اور گرم موسم ہمیں ملا تھا اس میں لباس کچھ کم کم ہی تھا۔ خواتین کی عریانی سے محسوس ہوتا تھا کہ میں جون جولائی میں نیویارک آ گیا ہوں۔ اسی طرح نوجوان جوڑوں کے سرِعام معاملات بھی وہی تھے جو مغرب میں معمول ہیں۔ اس لیے میں سیموئل ہنگٹن کی اس بات سے تو اتفاق کرتا ہوں کہ یہ جدیدیت ہے، مگر یہ درست نہیں کہ یہ مغربیت نہیں ہے۔ میرے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ مغرب کا صرف جدید پہلو (Modernization) ہی نہیں بلکہ مادیت، اعراضِ خدا، عریانی اور اخلاق باختگی کا پہلو بھی تیزی سے مشرق میں پھیلا ہے۔ اسی کو میں نے جدید مغربی دنیا کے مشرقی ایڈیشن سے تعبیر کیا ہے۔

میں پوری دیانت داری سے یہ سمجھتا ہوں کہ دنیا کو صرف مادی آنکھ سے دیکھنے کا دجالی وصف تمام اقوامِ عالم میں عام ہو چکا ہے۔ سنگاپور جہاں اور اعتبار سے مشرق کا جدید مغربی ایڈیشن ہے وہیں مادیت پر مبنی مغربی تہذیب کا ایک مکمل پیرو بھی ہے۔ یہ مغرب سے سیاسی اور ثقافتی طور پر مختلف ہے لیکن اصلاً یہ پیروئ مغرب ہی کی راہ پر گامزن ہے۔

مشینی دور کا انسان

سنگاپور مجھے کئی وجوہ سے زیادہ پسند نہیں آیا۔ ایک یہ کہ ہمیں بہت گرم مرطوب موسم ملا تھا۔ اس خطے میں روزانہ دوپہر تک شدید گرمی اور شام میں بارش ہوتی ہے۔ مگر ان دنوں سنگاپور میں بارشیں نہیں ہو رہی تھیں البتہ گرمی بہت تھی۔ دوسرے اس کی اصل کشش اس کا جدید طرزِ تعمیر ہے جو بعض دیگر لوگوں کے لیے تو شاید بہت پرکشش ہو، مگر میرے پس منظر کی وجہ سے میرے لیے

کوئی نئی چیز نہ تھا۔ شروع شروع میں یہ پر رونق، عالیشان اور چمکدار زندگی انسان کو متاثر کرتی ہے، مگر آہستہ آہستہ انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ مادیت کا وہ سمندر ہے جس میں انسان بھیڑ میں بھی تنہا رہتا ہے۔ پھر یہ کہ سنگاپور بہت مہنگا شہر ہے۔ خاص کر سیاح کا تعلق اگر پاکستان سے ہو تو کرنسی کے فرق کی وجہ سے مہنگائی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔

تاہم میرے ذوق سے قطع نظر کافی تعداد میں سیاح سنگاپور آتے ہیں۔ قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس ملک کی آبادی سے زیادہ سیاح یہاں آتے ہیں۔ ان کے لیے یہاں تفریح کی کئی جگہیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں جگہ سنٹوسا کا جزیرہ ہے۔ اوپر اس علاقے کا جو نقشہ میں نے کھینچا ہے اس میں سنگاپور سے آگے مزید جنوب کی سمت شہر سے بالکل متصل ایک جزیرہ ہے۔ یہی سنٹوسا ہے۔ دراصل دنیا بھر میں دستور ہے کہ ساحل سمندر پر واقع بڑے اور اہم شہروں سے قریب جو جزیرے ہوتے ہیں انھیں بہترین تفریحی مقام میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہی کچھ سنٹوسا کے ساتھ ہوا ہے۔ اس موقع پر قارئین یہ نہ سوچنے لگ جائیں کہ پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ کیوں کراچی کے اردگرد موجود دسیوں جزائر میں سے کسی ایک جزیرے کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کر لیا جاتا؟ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کراچی جیسے عظیم الشان اور گنجان شہر میں ابھی تک ماس ٹرانزٹ پروگرام نہیں بن سکا تو اور کیا ہوگا۔ یہی حال ملک کے دیگر بڑے شہروں کا ہے۔ ہمارے ہاں انسانوں کو جانوروں کی طرح بسوں اور ویگنوں میں ٹھونس کر سفر کا طریقہ رائج ہے اور جب تک عوام نااہل اور کرپٹ سیاسی لیڈرشپ کی اندھی پیروی جاری رکھیں گے، یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا۔

اس جزیرے میں سیاحوں کی تفریح کے لیے ساحل سمندر کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بھی تھیں۔ تاہم یہاں کی سب سے زیادہ منفرد چیز ایک لیزر شو تھا۔ یہ لیزر شو کئی ملین ڈالر کی رقم کا

ایک پروجیکٹ تھا جس میں ساحل سمندر کے ایک حصے پر روزانہ شام کے وقت پریوں کی ایک سادہ سی کہانی سنائی اور دکھائی جاتی ہے۔ مگر اس سادہ کہانی کو آتش بازی، رقص کرتے فواروں اور سب سے بڑھ کر لیزر کی دلکش اور رنگ برنگی روشنیوں کی مدد سے بے حد حسین اور خوبصورت انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس شو میں لیزر کے ذریعے سے سہہ جہتی (Three Dimentional) تصویریں اس قدر خوبصورتی سے بنائی گئیں اور مختلف اسپیشل افیکٹ اس طرح بکھیرے گئے کہ الفاظ شاید اس کا حقیقی بیان نہ کر سکیں۔ ہزاروں لوگ دم سادھے یہ شو دیکھتے رہے۔

یہ انسانوں کی ترقی کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا۔ مگر اس شو سے ذرا قبل سمندر کے اوپر ڈھلتے اور ڈوبتے سورج کے ساتھ آسمان پر شفق کا ایک انتہائی حسین منظر تھا۔ سمندر کا نیلا، سورج کا پیلا، شفق کا گلابی، آسمان کا سرمئی، بادلوں کا سفید اور ان سے منعکس ہوتی سورج کی کرنوں کا سنہری رنگ؛ رنگوں کا ایک گلدستہ تھا جسے فطرت اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے انسان کو پیش کر رہی تھی، مگر انسان اس سے بے پروا ہو کر اپنے ہنگاہوں میں، اپنی باتوں میں مگن تھا۔ یہ معاملہ انھی لوگوں تک خاص نہ تھا آج ہر جگہ یہی معاملہ دیکھا جا سکتا ہے۔ فطرت کوئل کی صورت کوکتی ہے، چڑیوں کی شکل میں چہچہاتی ہے، ہوا کے جھونکوں سے انسانی وجود کا مساج کرتی ہے، شفق کے رنگوں سے آسمان کو مزین کرتی ہے، پھولوں کی خوشبو سے زمین کو معطر کرتی ہے، سمندروں کی وسعت، سورج کی تپش، ہواؤں کی طاقت اور بادلوں کی حرکت کو ملا کر بارش کے قطروں سے دھرتی کی پیاس بجھاتی ہے، مگر انسان...... مشینی دور کا یہ انسان اس سے بے پرواہ ہو کر کیسی غفلت اور محرومی میں جیتا ہے؟

دور جدید نے انسان سے سب سے بڑھ کر فطرت سے تعلق چھینا ہے۔ یہ قطعِ تعلق اگر

فطرت تک رہتا تو پھر بھی غنیمت ہوتا۔ مگر انسان نے توفاطر السموات و الارض سے بھی تعلق توڑ لیا ہے۔ وہ خدا فراموش ہو گیا ہے۔ اسے شاید ایسا ہونا ہی چاہیے۔ جن کے پاس کتاب الٰہی ہے، جب وہ خدا کو بھول چکے ہیں تو پھر دوسرے تو اس غفلت کے زیادہ حقدار ہیں۔ میں نے کہیں لکھا تھا اور پھر دہرا دیتا ہوں۔ خدا آج ہماری دنیا میں مصیبت میں پکارا جانے والا ایک نام ہے اور کچھ نہیں۔ اس کا کلام بے سمجھے پڑھی جانے والی ایک کتاب ہے اور کچھ نہیں۔ اس کا رسول سوا ارب مسلمانوں کا فخر ہے اور کچھ نہیں۔ ایسے میں کسی چینی، یورپی، ہندو اور انگریز سے کیا شکایت کی جائے۔

سنگاپور کے اہم مقامات

ذکر ہو رہا تھا سنگاپور کے اہم مقامات کا۔ سنٹوسا میں اس لیزر شو کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ چیزیں تھیں لیکن لیزر شو بلاشبہ ان میں سب سے بہتر تھا۔ ہمارے لیے سنگاپور کا ایک دوسرا دلچسپ تجربہ سنگاپور ریور کی سیر تھا۔ ہمارا ہوٹل اس دریا کے کنارے واقع تھا۔ کمرے کی کشادہ کھڑکی سے نظر اٹھا کر دیکھتے تو آسمان کو چھوتی سنگاپور شہر کی خوش رنگ اور خوبصورت عمارتیں نظر آتیں اور نظر جھکانے پر دھیمے انداز میں بہتے دریا کا نظارہ سامنے آجاتا۔ اس کے ساتھ ہی ہوٹل کا انتہائی خوبصورت سوئمنگ پول تھا۔ یہ ایک انتہائی حسین منظر تھا جو کمرے کی کھڑکی سے کسی scenery کی طرح مستقل نظر آتا۔ میں سنگاپور کے حبس زدہ اور گرم موسم کی وجہ سے اس شہر میں زیادہ محظوظ نہیں ہو سکا تھا۔ مگر ہوٹل کے خنک کمرے میں بیٹھ کر جب میں اس منظر کو دیکھتا تو ساری کلفت دور ہو جاتی۔ اس منظر کو دیکھ کر یوں لگتا کہ گویا وقت ٹھہر گیا ہے، زندگی کی نبض چلتے چلتے دم لینے کو رک گئی ہے اور گردشِ زمانہ اپنی تکان اتارنے کے لیے کچھ دیر کو ساکن ہو گئی ہے۔

ہمارے ہوٹل کے قریب ہی وہ جگہ تھی جہاں سے دریا کی سیر کے لیے لوگ کشتی میں بیٹھ کر

روانہ ہوتے تھے۔اس کشتی میں سنگاپور اور اس دریا کی تاریخ اور اہم مقامات کا تعارف بھی کروایا جاتا تھا۔ یہ کشتی سٹی سنٹر کے علاقے کے قریب تک جاتی تھی جہاں مارلین (Merlion) اسٹیچو نصب تھا۔ یہ اسٹیچو سنگاپور کی پہچان ہے جو اپنے سر سے شیر کی طرح اور دھڑ کے نیچے سے مچھلی کی طرح نظر آتا ہے۔اس کے منہ سے فوارے کی طرح مستقل پانی نکلتا رہتا ہے۔اس کی ایک بڑی سی نقل سنٹوسا جزیرے میں بھی نصب کی گئی ہے۔

ہم سنگاپور کے لٹل انڈیا کے علاقے میں بھی گئے جو ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں کی آبادی کا علاقہ ہے۔ یہاں ایک بڑی مسجد بھی تھی۔لٹل انڈیا میں واقع مصطفیٰ سنٹر بہت مشہور ہے۔تاہم شاپنگ کے لیے اصل شہرت آرچرڈ روڈ کی ہے جو اپنے بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز کے لیے معروف ہے۔ مجھے البتہ ان سے کہیں زیادہ بہتر جیٹی پر بنا ہوا ویوو (Vivo) شاپنگ سنٹر لگا جہاں سے ہم منی ٹرین میں بیٹھ کر سنٹوسا کے لیے گئے تھے۔میرے اس مشاہدے کی تائید بعد میں اس وقت ہوگئی جب وہاں یہ لکھا ہوا دیکھا کہ اس شاپنگ سنٹر نے پچھلے برس سیاحوں کے سب سے پسندیدہ شاپنگ سنٹر کا ایوارڈ حاصل کیا ہے۔

اس کے علاوہ سنگاپور کا چڑیا گھر، بوٹانیکل گارڈن، نائٹ سفاری، برڈ پارک وغیرہ بھی سیاحوں کے پسندیدہ مقامات ہیں،مگر میں گرمی کی وجہ سے ان میں سے کسی جگہ جانے کی ہمت نہ کرسکا۔البتہ سنگاپور میں نئے متعارف ہونے والے اس بلند پہیے میں بیٹھنے ضرور گیا جو ایشیا کا سب سے بلند پہیہ ہے کیونکہ مجھے بلند مقامات پر چڑھنا بہت پسند ہے۔مگر جس وقت ہم وہاں پہنچے وہ بند ہو چکا تھا۔اگلے دن ہماری روانگی تھی اس لیے یہ حسرت دل میں لیے ہم ملائیشیا روانہ ہوئے۔

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

سنگاپور میں ہم تین دن رہے۔ ان تین دنوں میں ہمارا واسطہ ایک گرمی برساتے سورج سے رہا، لیکن یہ سورج مشرق سے ابھر رہا تھا اس لیے علامہ اقبال کے حکم کی تعمیل میں شعور کی آنکھ جھپکنے نہ دی۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

گو اس شہر کی بلند و بالا عمارات میں فلک اور فضا کم ہی نظر آتے تھے۔ جو نظر آتا تھا وہ مادیت کی بہار تھی یا عریانی کی یلغار۔ باقی جس انسان کو اقبال نے آنکھیں کھولنے کا مشورہ دیا تھا اس کی روح شاید خدا بیزار ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ اقبال کی اس نصیحت پر عمل کرنے کے قابل ہی نہ تھی جو انھوں نے اسی معرکۃ الآرا نظم میں اس طرح کی تھی:

اُس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ

خدا نے انسان کو اس دنیا میں بھیج کر اپنے آپ کو فطرت کے پردوں میں اس لیے چھپا لیا کہ اس کے مشتاق اس جلوۂ بے پردہ کو لاکھ پردوں میں بھی پہچان لیں اور پیشانی کے بل اس کے سامنے گر پڑیں۔ لیکن مادیت کے اس دھویں نے آج کے انسان کے لیے خدا کے ہر منظر کو دھندلا دیا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ قیامت سے قبل ایک دفعہ یہ دھند ضرور چھٹے گی۔ ایسے لوگ اٹھیں گے جو اپنے خونِ جگر سے تخلیق کیے گئے الفاظ میں خدا کی حمد، اس کی پاکی، اس کی کبریائی اور اس کی توحید کے وہ نغمے بکھیریں گے کہ ہر سلیم الفطرت شخص شک و شبہ کی دھند کا سینہ چاک کر کے اپنے پروردگار تک جا پہنچے گا۔ پھر اس کے بعد بہت جلد وہ وقت آئے گا جب خدا کی روشنی کا سورج طلوع ہوگا اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ اور اس کے ساتھ ظلم، ناانصافی، گمراہی اور شیطانیت کا ہر تاریک سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائے گا۔

سنگا پور میں مادیت کی دھند کے باجود دنیا کے نئے سیاسی منظر نامے کو مشرق کی اس سرزمین سے طلوع ہوتے سورج کے ذریعے سے ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ کچھ عرصے قبل تک انتہائی پستی اور بدحالی کا شکار چینی نسل انسانیت کی امامت مغرب سے لے کر مشرق کو منتقل کرنے کے لیے تیار ہو چکی ہے۔ دور جدید کی امامت کا سورج آج ہر معنی میں مشرق سے طلوع ہو رہا ہے۔

معاشی میدان میں چینی اقوام کی پیش قدمی سے تو دنیا واقف ہے ہی لیکن فوجی اور سائنسی میدان میں بھی وہ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اسی سفر میں پاکستان واپس لوٹتے ہوئے معروف امریکی جریدے نیوز ویک کی ایک رپورٹ پڑھنے کا موقع ملا۔ جس میں بیان کیا گیا تھا کہ چین نے امریکہ کی مشرق وسطیٰ اور افغانستان میں توجہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خاموشی سے بحیرۂ چین میں واقع (Hainan) جزیرے پر ایک فوجی اڈہ قائم کرلیا ہے۔ اس اڈے پر بلاسٹک میزائلوں سے لیس ایٹمی آبدوزیں، بحری جنگی جہاز اور طیارہ بردار جہاز تعینات ہوں گے۔ اس اڈے کے اردگرد پہاڑیوں کو کاٹ کر سرنگیں بنائی گئی ہیں تاکہ کسی سیٹلائٹ سے اڈے پر آبدوزوں کی آمد و رفت کا علم امریکہ کو نہ ہو سکے۔ اس طرح چین صرف بحیرۂ چین ہی نہیں بلکہ بحر ہند کے اطراف میں واقع ممالک اور تجارتی شاہراہوں کی ناکہ بندی کے قابل ہو گیا ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے اس خطے میں امریکی بحریہ کی برتری قائم تھی جسے چین اب چیلنج کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔

سنگا پور اس اعتبار سے چینی اقوام کا امام ہے کہ مشرق کی ترقی کا عمل سب سے پہلے اسی سرزمین پر شروع ہوا۔ 250 مربع میل کے رقبے اور پچاس لاکھ سے کم آبادی کی یہ شہری ریاست تاریخی طور پر ملائیشیا کا ایک حصہ تھی۔ انیسویں صدی میں یہ جنگلات پر مشتمل ایک دلدلی علاقہ

تھا۔اس علاقے کی حالت اس وقت بدلنا شروع ہوئی جب 1819 میں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر انتظام آیا۔کمپنی کا مقصد مشرق بعید،انڈیا اور یورپ کے درمیان پھیلی ہوئی اپنی تجارت کے لیے اسے ایک بحری اڈے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ 1959 تک یہ برطانیہ کے زیر انتظام ایک فری پورٹ کے طور پر کام کرتا رہا۔1963 میں ملائیشیا کے ساتھ شامل ہوا مگر دو برس بعد سیاسی اختلافات کی بنیاد پر اس نے مکمل آزادی حاصل کرلی۔ملک کی مدبر اور مخلص قیادت نے (قارئین کو پاکستانی تناظر میں یہ الفاظ شاید کچھ نامانوس لگیں،جس کے لیے معذرت،لیکن جب تک قوم اپنے لیڈروں کا احتساب نہیں کرے گی نااہل قیادت ہمارا مقدر رہے گی) فری پورٹ سے آگے بڑھ کر جلد ہی ملک کو ایک صنعتی پیداواری ملک بنادیا اور یوں سنگاپور ایشیا کے ٹائیگرز میں شامل ہوگیا۔

ایشیا کے اس ٹائیگر کی ترقی کی عکاس صرف فلک بوس عمارتیں ہی نہیں بلکہ ان کا ٹرانسپورٹیشن سسٹم بھی ہے جو کہ MRT کہلاتا ہے۔یہ کسی اعتبار سے مغربی ممالک سے کم نہیں بلکہ کئی اعتبار سے ان سے بہتر ہے۔ظاہر ہے یہ سب کچھ دیکھ کر اور اپنے وطن سے اس کا موازنہ کرکے میرا دل دکھا۔خاص کر اس موقع پر جب MRT کی ٹرین میں بیٹھ کر دہشت گردی کے خلاف لوگوں کو ہوشیار رکھنے کے لیے بار بار نشر کی جانے والی وڈیو دیکھی۔لندن اور میڈرڈ میں ٹرین بم دھماکوں کے بعد دنیا بھر میں پبلک ٹرانسپورٹ نظام کے حوالے سے بہت احتیاط برتی جاتی ہے۔ان دونوں جگہوں پر دھماکوں میں مسلمانوں ہی کا نام لیا گیا تھا۔اس لیے جب جب یہ وڈیو چلی مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور ہر شخص مجھے ہی دہشت گرد سمجھ رہا ہے۔

یہ صورتحال ہماری اس لیڈرشپ کا تحفہ ہے جو صرف نفرت اور جنگ کو ہر مسئلے کا حل سمجھتی ہے۔جو صبر،حکمت اور دعوت کو بے معنی باتیں سمجھتی ہے۔جو طاقت کے بغیر دشمن سے ٹکرا جانے کو

بہادری سمجھتی ہے۔اس کے برعکس وہ چینی قیادت ہے جوٹکراؤ سے ہٹ کرتعمیر کے راستے پر چل رہی ہے۔ جوصرف اس میدان میں اتری ہے جہاں اس کی فتح یقینی ہو۔اس مقصد کے لیے ان کا پہلا میدان معاشی ترقی تھی۔ دوسرا میدان تعلیم وتربیت ہے جس میں وہ مستقل آگے بڑھ رہے ہیں۔فوجی میدان میں بھی ان کی دانشمندی اس واقعے سے عیاں ہوتی ہے جسے میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ جو میدان انہیں خالی ملا اس میں انہوں نے خاموشی سے اپنا غلبہ قائم کرلیا۔ وہ جانتے ہیں کہ امریکہ مشرق وسطیٰ اور وسط ایشیا میں ان کی مداخلت گوارانہیں کرسکتا اور نہ وہ امریکہ کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔اس لیے انہوں نے ایک بہت بڑے اور مستقبل کے انتہائی اہم میدان یعنی بحر ہند پر اپنی برتری قائم کرلی جو بالکل خالی پڑا تھا۔

اس دنیا میں کامیابی کسی خوش قسمتی کا نتیجہ نہیں ہوتی۔کامیابی اپنے امکانات سمجھنے اورانہیں استعمال کرنے کا نام ہے۔چینی قوم نے اس فن کوسیکھ لیا ہےاور یہی ان کی ترقی کا راز ہے۔

ملائیشیا کا سفر

ہم ہفتے کی صبح بذریعہ بس ملائیشیا روانہ ہوئے۔ یہ سفرتقریباً چھ گھنٹے کا تھا۔ ہموار اور کشادہ سڑک پر ایک آرام دہ بس میں یہ سفر بہت سہولت کے ساتھ طے ہوا۔راستے میں دونوں ممالک کا باڈر آیا۔بس میں موجود سنگاپور اور ملائیشیا کے شہری باآسانی دوسری طرف چلے گئے۔مگر ہمیں ویزہ لینے ایک دوسرے کمرے میں جانا پڑا۔میرا خیال یہ تھا کہ ہمارے پاسپورٹ پر ایک انٹری ہوگی،جیسا کہ سری لنکا وغیرہ میں پاکستانیوں کے لیے ہوتی ہے مگر یہاں پہنچ کرمعلوم ہوا کہ ہمیں ویزہ لینا ہوگا۔ویزے کے لیے وہاں موجودافسروں نے ہماری واپسی کے ٹکٹ،ہوٹل ریزرویشن وغیرہ چیک کیے۔اس کے بعد ویزہ فیس کا مطالبہ کردیا۔میرے پاس مطلوبہ تعداد میں رنگٹ (ملائیشیا کی کرنسی) نہ تھی۔باڈر پر ڈالرایکسچینج کرنے کی کوئی جگہ اورانتظام نہ تھا۔دوسری طرف

مجھے یہ اندیشہ تھا کہ بس والا ہمیں چھوڑ کر نہ چلا جائے کیونکہ ہمارے سوا سب لوگ انٹری کروا کر بس میں بیٹھ چکے تھے۔ میں نے ویزہ افسر کو یہ مسئلہ بتایا۔ آخر کار اس نے ایک آدمی سے بات کی اور ہمیں منہ مانگی قیمت پر مطلوبہ تعداد میں رنگٹ خریدنے پڑے۔ کچھ دیر میں ہمیں ویزا مل گیا اور ہم آگے روانہ ہوئے۔

اس واقعے کے بعد بس کے پرسکون ماحول میں بیٹھ کر میں سوچنے لگا کہ یہ کیسی غیر متوقع اور پریشان کن صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے انٹری ویزا اور اس کی فیس کا معلوم ہوتا تو سنگاپور سے رنگٹ لے کر آتا۔ میں نے تو راستے کی ضروریات کے لیے رنگٹ خریدے تھے اور باقی ملائیشیا میں لینے کا ارادہ تھا۔ معلوم ہوتا تو ڈرائیور کو بھی بتا دیتا کہ میرا انتظار کرنا اور پھر سکون سے سارا معاملہ ہوتا۔

بے اختیار اللہ تعالیٰ سے روزِ حشر کی پریشانی سے پناہ مانگی۔ وہاں کچھ لوگ میری طرح بڑے اطمینان اور اعتماد سے پہنچیں گے کہ سب ٹھیک ملے گا۔ فرشتے ہر مسلمان سے بس کلمہ سنیں گے اور جنت کی انٹری کا ٹھپا لگا کر کہیں گے کہ مزے کرو۔ کوئی اور مسئلہ ہوا تو شفاعت تو ہو ہی جانی ہے۔ مگر قرآن تو بتاتا ہے کہ سچے ایمان اور عملِ صالح کے بغیر جو شخص آئے گا اس کے لیے اس روز پریشانی ہی پریشانی ہوگی۔ ان کا سارا اعتماد اور یقین بھاپ کی طرح اڑ جائے گا۔ اول تو کسی کے پاس کوئی مال و متاع ہوگا نہیں پھر اگر ہوا بھی تو دنیا کے ڈالرز کو جنت میں قابلِ قبول رنگٹ میں بدلنے والا کوئی شخص نہ ہوگا۔ جنھوں نے انسانوں کے حقوق مارے اور ظاہری عبادات ادا کرتے رہے، ان کے درمیان البتہ ضرور لین دین ہوگا۔ اس طرح کہ جس کا مال کھایا، اپنی نیکیوں کو بدلے میں اسے دینا ہوگا اور آخر کار ساری نیکیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ پھر اس کے گناہ اپنے سر لینے ہوں گے۔ کیسا برا اعتماد ہے جو آدمی کو اس انجام تک پہنچا دے گا۔

زمین کے دو زیور

ملائیشیا میں داخل ہوتے ہی دو تاثر قائم ہوئے جو آخری وقت تک رہے۔ ایک یہ کہ درخت زمین کا زیور ہیں اور ملائیشیا کا چپہ چپہ اس زیور سے سجا ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ حیا عورت کا اصلی زیور ہے۔ یہ زیور سنگاپور میں جتنا کمیاب تھا یہاں اتنا ہی وافر موجود تھا۔ ملائیشیا میں ہر چھوٹی بڑی جگہ خواتین کام کرتی ہوئی نظر آئیں مگر چینی نسل کی خواتین کے برعکس ہاتھ اور چہرے کو چھوڑ کر وہ مکمل طور پر ڈھکی ہوئی ہوتی تھیں۔

لباس کسی خاتون کی حیا کا معیار تو نہیں ہوتا لیکن اس کا ایک اظہار ضرور ہوتا ہے۔ ملائیشیا کی خواتین نے اگلے ایک ہفتے میں ہمیں یہ بتایا کہ انتہائی گرمی کے موسم میں جب باریک، چست اور کم لباس کو دنیا بھر کی خواتین اپنی مجبوری بنا لیتی ہیں، باحیا خواتین نہ صرف گھر سے باہر انتہائی سخت موسم میں کام کرسکتی ہیں بلکہ لباس میں بھی اپنی حیا اور عفت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ سکتی ہیں۔ خدا کی نظر میں زمین کا اصل زیور یہی باحیا خواتین ہیں۔ کل قیامت کے دن خدا ان کو جنت کے زیور پہناتے وقت بہت سخاوت سے کام لے گا۔

اس سفر میں کئی پاکستانی خواتین نظر آئیں۔ کاش وہ بھی مقامی خواتین سے کچھ سبق سیکھ لیتیں۔ وگرنہ لگتا یہی تھا کہ انہوں نے یہی سبق سیکھا ہے کہ ملک میں رہتے ہوئے جو رہی سہی پابندی ہوتی ہے اسے ائیر پورٹ پر چھوڑ کر آنا چاہیے اور جینز کی پینٹ اور بنیان پہن کر اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دینا چاہیے۔ میری اہلیہ کے معاملے میں اس حوالے سے ایک دلچسپ چیز سامنے آئی۔ ملائیشیا میں ان سے کئی جگہ لوگ ملائی زبان میں مخاطب ہوئے۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ ان کے اور مقامی خواتین کے حیادار لباس کی مماثلت کی وجہ سے ہوا ہے۔

حبس زدہ کولالمپور

میری بہن پروین سلطانہ حنا کا شعر ہے جو مجھے کولالمپور پہنچ کر بار بار یاد آتا رہا:

جہاں بھی جائیں تماشہ نیا دکھاتا ہے
ہمارے ساتھ ہمارا نصیب جاتا ہے

اس شعر کے یاد آنے کا سبب یہاں کا موسم تھا۔ بچپن میں پڑھا تھا کہ اس خطے کا موسم ایسا ہے کہ روز دوپہر تک سخت گرمی اور حبس ہوتا ہے اور سہ پہر کے وقت بارش ہوتی ہے۔ سنگاپور کے بعد کولالمپور میں بھی ہمیں صرف حبس اور گرمی ملی، بارش ناراض بیوی کی طرح روٹھی رہی۔ سنگاپور میں بادلوں کے آثار بھی نہ تھے تو دل کو کچھ قرار تھا۔ مگر یہاں تو امنڈتے بادلوں کی بہار بھی بارش کے دل کی کلی نہ کھلا سکی اور وہ بدستور ہم سے خفا رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملائیشیا بلکہ عالمِ اسلام کے ایک ترقی یافتہ شہر میں ہم بہت بے مزہ رہے۔

دراصل سیاح کا سفر موسم کی ہمراہی میں طے ہوتا اور ان کی نظرِ کرم پر منحصر ہوتا ہے۔ باہر کے موسم کی ایک ایک ادا اندر کے موسم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ باہر ہی اگر سوکھا پڑا ہو تو دل کی زمین خوشی کی پھوار سے محروم رہتی ہے، منظر ہی اگر صحرا کی طرح تپ رہا ہو تو نگاہوں کو تراوٹ نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن ہم سیاح تھے اور موسم کی ہر رُت کے ساتھ ہمیں گزارا کرنا تھا اس لیے حبس اور گرمی کے باوجود ہوٹل سے نکل جاتے اور گھومتے۔ مگر اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ تھکان بہت زیادہ ہونے لگی۔

بکٹ بنٹانگ (Bukit Bintang)

ہمارا ہوٹل جس علاقے میں تھا وہ بکٹ بنٹا نگ کہلاتا ہے۔ یہ یہاں کا معروف سیاحتی علاقہ ہے جہاں بہت سے ہوٹل، شاپنگ سنٹرز اور سیاحوں کی دلچسپی کی دیگر چیزیں موجود تھیں۔ ہم دن

رات میں کئی دفعہ یہ جگہ دیکھنے نکل جاتے۔ یہ پورا علاقہ دیکھنے کے قابل تھا۔ رات کے وقت یہاں کی روشنیاں اور رونق دونوں عروج پر ہوتیں۔ جبکہ دن کے وقت رونق تو ایسی ہی رہتی لیکن گرمی کی وجہ سے ہم زیادہ تر شاپنگ سنٹرز تک ہی محدود رہتے۔ یہاں ہر قدم پر مقامی ملائی لوگوں کے ساتھ چینی نسل کے لوگ نظر آئے۔ مذہب، ثقافت، زبان، لباس اور دیگر اختلافات کے باوجود دونوں بقائے باہمی کے اصول پر زندگی گزار رہے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات پہلے سے تھی کہ چینیوں کو ملائی لوگوں سے کچھ شکایات ہیں، مگر معاملات افہام وتفہیم کے اصول پر چل رہے ہیں۔ ہمارے ہاں جیسے نسلی اور لسانی فساد کی نوبت نہیں آتی۔

گرچہ ملائیشیا کے لوگ مذہبی رجحانات کے حامل ہیں، مگر اس کے باوجود یہاں نائٹ کلب اور شراب کی دکانیں عام ہیں۔ فحبہ گری پر گرچہ پابندی ہے مگر یہ علانیہ یہاں جاری ہے۔ ایک روز میں اور میری اہلیہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ دو کال گرلز نے ہمارے آگے جانے والے نوجوانوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی لیکن شاید ان کا معاملہ طے نہ ہو سکا۔ اسی طرح یہاں موجود بین الاقوامی شہرت کے حامل پلانٹ ہالی وڈ سے ایک سرنگ وہاں موجود ایک فائیو اسٹار ہوٹل تک جاتی ہے، اسے Love Tunnel کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کال گرلز سے معاملہ کرنے کے بعد لوگ انہیں سامنے سے لانے کے بجائے اسی راستے سے لے کر ہوٹل لوٹتے ہیں۔ یہ دورِ جدید کی وہ خرابیاں ہیں جنھوں نے ایک مسلم ملک کو بری طرح آلودہ کر رکھا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ جب تک تہذیبِ جدید کو الحاد، آخرت فراموشی اور دنیا پرستی سے نکال کر توحید پر استوار نہیں کیا جائے گا یہ مسائل باقی رہیں گے چاہے معاملہ پاکستان کا ہو یا کسی اور مسلم ملک کا۔

اس علاقے کی ایک اور خاص بات چینیوں کے قائم کردہ مساج سنٹر تھے۔ خاص کر بیروں

کے مساج کے لیے یہ لوگ بہت اہتمام سے بلاتے تھے۔اس کا سبب بالکل واضح تھا کہ سیاحوں کے قدم چلتے چلتے تھک جاتے تھے اور ایسے وقت میں مساج بہت راحت پہنچاتا ہے۔میرے پیروں میں بھی گرمی میں گھوم گھوم کر شدید درد ہو گیا تھا۔راستے میں یہ لوگ روک روک کر پیروں کے مساج کے لیے بلاتے تو اس تصور ہی سے سرور آتا،مگر ذہن میں مساج سنٹر کا ایک ایسا منفی تصور راسخ تھا (اور آگے چل کر بینکاک میں یہ سارے تصورات سچائی کے تلخ روپ میں سامنے آ گئے) کہ میں چاہنے کے باوجود پیروں کا مساج نہیں کروا سکا۔

کولالمپور کی دو بلند عمارات

کولالمپور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں دنیا کی دو بڑی عمارات موجود ہیں۔ایک پیٹروناس ٹاور (Petronas Tower) اور دوسری کے ایل ٹاور (KL Tower)۔ پیٹروناس ٹاور امریکہ کے آنجہانی ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی طرح جڑواں عمارتیں ہیں جسے 1998 سے 2004 تک دنیا کی بلند ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ 452 میٹر بلند یہ تعمیر آج بھی جڑواں عمارتوں کی حیثیت سے دنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔ جبکہ KL ٹاور جس کا اصل نام مینارہ کولالمپور ہے،ایک کمیونیکشن ٹاور ہے۔اس کی اونچائی 421 میٹر ہے۔

ہم ان دونوں عمارتوں پر گئے اور وہاں سے شہر کا نظارہ کیا۔KL ٹاور پر ایک مشاہداتی عرشہ (Observatory Deck) بنا ہوا تھا جس سے شہر کا دلفریب نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ہم وہاں شام کے وقت گئے جب دن اور رات دونوں میں شہر کو دیکھنا ممکن تھا۔ وہاں ٹاور پر ایک ریسٹورنٹ بھی تھا۔ میں نے وہاں جانے کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ پہلے سے ریزرویشن کرانی ہوتی ہے۔ تاہم آنے والے دنوں میں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک کے جمہوری وزیر اعظم اپنے وزرا اور امرا کا لشکر جرار لے کر جب کولالمپور تشریف لائے تو پاکستانی سفارت

خانے نے ان کے اعزاز میں یہاں ایک ڈنر دیا۔ یقیناً اس سے ملائیشیا کے لوگوں کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ پاکستان کوئی غریب ملک نہیں ہے بلکہ ایک 'ترقی یافتہ' ملک ہے۔ اس ملک کے پاس اتنا فالتو پیسہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کو بلند ترین جگہ ڈنر کروا کے اقوامِ عالم میں ان کا قد بے دھڑک بلند کر سکتا ہے۔

پیٹروناس ٹاور دیکھنے کے لیے ہم صبح کے وقت گئے۔ پیٹروناس دراصل ملائیشیا کی تیل اور گیس کی کمپنی ہے اور زیادہ تر اسی کے دفاتر ان دونوں عمارتوں میں موجود ہیں۔ ان جڑواں عمارتوں کو اکتالیسویں فلور پر آپس میں ایک پل کے ذریعے سے ملایا گیا ہے جسے اسکائی برج کہتے ہیں۔ چاروں طرف سے بند اور ہوا میں معلق یہ پل عام لوگوں کے لیے روزانہ کھولا جاتا ہے۔ یہاں سے شہر کا نظارہ کرنا ممکن ہے۔ KL ٹاور کے برعکس یہاں کا داخلہ مفت تھا۔ اس کا ٹکٹ منگل سے اتوار تک پہلے آنے والے سترہ سو افراد کو دیا جاتا ہے۔ ٹکٹ سات بجے صبح سے ملنا شروع ہوتے ہیں اور تقریباً نو بجے صبح تک سارے ٹکٹ تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد لوگ دن بھر اپنی سہولت کے اعتبار سے یہاں آتے رہتے ہیں اور اس دوران میں عمارت کی ابتدائی منزلوں پر واقع ایک انتہائی شاندار اور بڑے شاپنگ ہال میں خریداری کرتے یا گھومتے ہوئے وقت گزارتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ملائیشیا آنے سے قبل میں نے انٹرنیٹ پر حاصل کر لی تھیں۔

سیاہ چہرے

پیٹروناس ٹاور پر ایک بہت غیر معمولی واقعہ پیش آیا جو شاید عمر بھر یاد رہے۔ ہوا یہ کہ ہم اتوار کے دن دوپہر کے وقت یہاں آئے۔ ٹکٹ ملنے کا کوئی سوال اس لیے نہیں تھا کہ عام روایت کے مطابق سارے ٹکٹ صبح نو بجے تک لوگ لے جا چکے ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں صرف

شاپنگ سنٹر دیکھنے پر گزارا کرنا ہوگا۔ تاہم وہاں پہنچ کر نجانے کیا دل میں آیا کہ لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اس جگہ چلا آیا جہاں اسکائی برج کی لفٹ میں جانے کا راستہ تھا۔ وہیں ٹکٹ ملنے کا کاؤنٹر تھا۔ میں نے وہاں متعین نوجوان سے پوچھ لیا کہ کیا کوئی ٹکٹ دستیاب ہے۔ اس نے وہی جواب دیا جس کی مجھے توقع تھی کہ سارے ٹکٹ تقسیم ہو چکے ہیں۔

میں اپنی وائف کے ہمراہ وہیں کھڑا ہو کر ٹاور کی تصویریں دیکھنے لگا کہ اتنے میں اس نوجوان نے مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ ہمارے پاس دو ٹکٹ کینسل ہوئے ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو ٹکٹ دے سکتا ہوں۔ ہمارے لیے تو یہ اندھے کو دو آنکھیں مل جانے والی بات تھی۔ اس وقت ایک انڈین جوڑا ابھی وہاں موجود تھا۔ انڈین لڑکے نے ٹکٹ والے سے کہا کہ یہ ٹکٹ مجھے دے دیں۔ میں شام کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں اور یوں اس منظر کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ مگر ٹکٹ والے نے اس کے بار بار اصرار کے باوجود یہی جواب دیا کہ جو پہلے آیا ہے اس کو پہلے ٹکٹ دیا جائے گا۔ آخر کار اس نے ٹکٹ مجھے دے دیا۔

اس وقت میں نے ان دونوں انڈین لڑکے اور لڑکی کی جو شکل دیکھی اس میں مجھے قرآن کے ان الفاظ کی تصویر زندگی میں پہلی دفعہ نظر آئی جو اس نے جنت کی بادشاہی کے حصول میں ناکام لوگوں کی منظر کشی کرتے ہوئے کہے ہیں۔ قرآن ان مقامات پر ان لوگوں کے لیے ''سیاہ چہرے'' کی ایک ترکیب استعمال کرتا ہے۔ اس روز ان دونوں کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ ناکامی، امید کا ٹوٹ جانا، کسی انتہائی مطلوب نعمت کا نہ ملنا کس طرح چہرے پر حسرت، غم اور مایوسی کی سیاہی مل دیتا ہے۔ اس کے بعد انتظار گاہ میں بیٹھ کر میں بہت دیر تک یہ سوچتا رہا کہ قیامت کے دن کی حسرت کیسی ہوگی۔ اس وقت میرے دل سے یہ دعا نکلی کہ پروردگار روزِ قیامت حسرت کی اس روسیاہی سے مجھے محفوظ فرما۔ تو نے اگر یہ دیکھ لیا ہے کہ قیامت کے دن میرے ناقص اعمال کی بنا

پر فرشتے مجھے جنت میں جانے سے روک دیں گے تب بھی تو محض اپنے فضل سے جنت میں بلا استحقاق داخلے کا فیصلہ کر دے۔

Malaysia Truely Asia

نوے کی دہائی کے آخر میں جب میں سعودی عرب میں مقیم تھا، مجھے جگہ جگہ بڑے بڑے بل بورڈ (Billboard) نظر آتے تھے جن میں ملائیشیا میں سیاحتی مقصد سے آنے کی دعوت دی جاتی۔ان پر نمایاں طور پر یہ سلوگن درج ہوتا تھا۔

Malaysia Truely Asia

یعنی ملائیشیا ہی اصل ایشیا ہے۔اپنی ترقی کے اعتبار سے ملائیشیا واقعی چینی اقوام کے ہم پلہ نظر آتا ہے۔مگر سیاحت کے فروغ کے لیے جو نعرہ انھوں نے لگایا ہے اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اہل ملائیشیا نے سیاحوں کے لیے اپنے ملک کو واقعتاً انتہائی پر کشش اور باسہولت بنا دیا ہے۔اس کا اندازہ ہمیں ملائیشیا میں اپنی اگلی دو منزلوں پر ہوا۔یعنی گینٹنگ اور لنکاوی۔

گینٹنگ ہائی لینڈ

گینٹنگ ہائی لینڈ (Genting Highlands) کوالالمپور سے 50 کلو میٹر کی مسافت پر واقع ایک خوبصورت اور دلکش پہاڑی مقام ہے۔اس مقام کی خوبی یہ ہے کہ 2000 میٹر کی بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں موسم انتہائی خوشگوار رہتا ہے۔یعنی 20 ڈگری کے قریب۔موسم خنک ہے، مگر ایسا نہیں کہ برا لگے۔بارش اکثر ہوتی ہے اور بیشتر وقت یہ علاقہ بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے۔یہاں کے ہوٹلوں میں کمرے کے اندر بادلوں کا آنا معمول کی بات ہے۔ہمیں بھی اس کا تجربہ ہوا۔ملائیشیا کے بارشوں سے بھرپور موسم کی بنا پر ہر جگہ درختوں کی بہار اپنا بھرپور رنگ جمائے رہتی ہے۔

قدرت کے اس فطری حسن کو یہاں کی حکومت نے اپنی فراہم کردہ سہولیات سے جب آراستہ کیا تو ملائیشیا اور دنیا بھر سے آنے والوں کے لیے سیاحت اور تفریح کا ایک بہت اعلیٰ مقام وجود میں آ گیا۔ کولالمپور سے گینٹنگ تک کا راستہ بہت ہموار اور کشادہ بنا ہوا ہے۔ بسیں انتہائی صاف ستھری اور آرام دہ جن کا کرایہ بہت کم ہے۔ یہاں دو کیبل کار لوگوں کی تفریح کے لیے ہیں جن میں 'Genting Skyway' دنیا کی سب زیادہ تیز رفتار اور جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے طویل (3.8 کلومیٹر لمبی) کیبل کار ہے۔ یہ سرسبز جنگلات اور گہری کھائیوں سے ہوتی ہوئی کافی نشیب میں واقع قصبے 'Gohtong Jaya' تک جاتی ہیں۔ گینٹنگ کی اصل کشش یہاں بنا ہوا تھیم پارک ہے جہاں بچوں اور بڑوں کے لیے متعدد اقسام کے جھولے، رائڈز اور تفریحی چیزیں ہیں۔ ایک دفعہ کرایہ دے کر سارے دن جتنی دفعہ چاہیں ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بعض نئے جھولے جن میں لوگوں کی بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، ان کا ٹکٹ ہر دفعہ لینا ہوتا ہے۔

یہاں بہت سے اعلیٰ درجے کے ہوٹل ہیں۔ ویک اینڈ اور تعطیلات میں تو یہ بھرے رہتے ہیں، لیکن عام دنوں میں جب رش نہیں ہوتا تو یہ کرائے اتنے کم کر دیتے ہیں کہ وہ لوگ بھی یہاں آ جاتے ہیں جو سیزن میں آنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ ہوٹل بارش اور موسم کے مسائل سے محفوظ راستوں کے ذریعے آپس میں منسلک ہیں۔ یہاں ایک ان ڈور تھیم پارک، کھانے پینے اور خریداری کی بہت سی دکانیں بھی ہیں۔ یہاں ایک کیسینو بھی بنا ہوا ہے جہاں مقامی مسلم ملائیشین لوگوں کے داخلے پر پابندی ہے البتہ دوسرے لوگ وہاں جا سکتے ہیں۔

فطرت کے حسن کے ساتھ انسانی ضروریات، آرام اور تفریح کا خیال رکھتے ہوئے بنائی گئی یہ جگہ سالانہ تقریباً دو کروڑ لوگوں کو اپنے ہاں آنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ جگہ جو ساٹھ کی دہائی تک

پہاڑی جنگل کی حیثیت رکھتی تھی ملائیشیا کے ایک چینی ارب پتی سرمایہ دار Lim Goh Tong نے تعمیر کی۔ یہاں بنیادی خیال سے لے کر سرمایہ تک ہر چیز اس کی محنت کا نتیجہ تھی۔ آخر کئی برس کی تعمیر اور محنت کے بعد 1971 میں اس کا افتتاح ہوا اور بتدریج یہ ملائیشیا اور پھر دنیا کے معروف تفریحی مقامات میں شامل ہوگیا۔

خیال کی یہ بلند پروازی، ان تھک محنت، آگے بڑھنے کا جذبہ، حال میں رہ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کرلینا، یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے ملائیشیا کو حقیقی ایشیا بنادیا ہے۔ اور رہے ہم تو ہماری کیا بات ہے۔ دنیا کے عظیم ترین پہاڑی سلسلے، بلندترین چوٹیاں، حسین ترین وادیاں، ان میں بہتے حیات آفریں دریا، وسیع وعریض صحرا، طویل اورخوبصورت ساحلی پٹیاں، قدیم ترین تہذیوں کے آثار، مغلیہ عہد کے شاندار تاریخی مقامات کے حامل ہمارے ملک میں سیاحوں کو راغب کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ نہ اپنے لوگوں کے لیے ہی کسی تفریحی مقام کو تعمیر کرنے یا قدرت کے عطا کردہ تحفوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بلکہ ان مقامات پر سہولیات کی کمی کا یہ حال ہے کہ چند مقامات کو چھوڑ کر فیملی کے ساتھ ساتھ جانا بھی مشکل ہے۔

مچھلیاں لائن نہیں بناتیں

ہم کیا ہیں اور ہماری فکری اور مذہبی قیادت نے قوم کی تربیت کتنی غلط بنیادوں پر کردی ہے، اس کی ایک مناسبت مجھے گینٹنگ تھیم پارک میں نظر آئی۔ میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ ڈائناسور کے حوالے سے بنے ہوئے ایک حصے میں جانے کے لے لائن میں کھڑا تھا۔ یہاں مصنوعی پہاڑوں اور غاروں میں ڈائناسور کے زمانے کی منظر کشی کی گئی تھی اور ان کے حوالے سے معلومات بیان کی گئی تھیں۔ اس پورے حصے کا سفر ایک مصنوعی نہر کے ذریعے سے کشتی میں بیٹھ کر کیا جاتا تھا۔ ہم سے آگے قطار میں ایک عرب جوڑا کھڑا تھا جو نہر میں وقفے وقفے سے

مچھلیوں کا چارہ پھینکتے تھے۔ یہ چارہ چھوٹے چھوٹے دانوں کی شکل میں تھا۔ جب جب یہ لوگ دانہ پھینکتے رنگ برنگی چھوٹی بڑی مچھلیاں اس جگہ ٹوٹ پڑتیں۔ اس وقت ایک عجیب منظر وجود میں آجاتا۔

مجھے یہ منظر دیکھ کر احساس ہوا کہ ہم انسانوں نے ایک قطار بنا رکھی ہے اور بہت تحمل سے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر مچھلیوں میں کوئی قطار نہ تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جس کا زور چلتا اور جس کا داؤ لگتا وہی مچھلی دانہ نگل لیتی۔ مچھلیوں کا ایسا کرنا ان کا کوئی عیب نہ تھا۔ ان کی دنیا کا قانون ہی یہی ہے۔ مگر انسانوں کی دنیا میں ہر جگہ قطار بنائی جاتی ہے۔ قطار عدل وانصاف کی علامت اور اس بات کی یقین دہانی ہے کہ طاقتور اور کمزور، امیر وغریب اور مرد وعورت سب کو یکساں حقوق میسر ہیں۔ مگر بدقسمتی سے پاکستانی معاشرہ پچھلے کئی عشروں سے جس اصول پر تربیت پایا ہے وہ مچھلیوں والا اصول ہے کہ جس کا زور چلتا اور جس کا داؤ لگتا ہے وہی مچھلی دانہ نگل لیتی ہے۔ یہاں میرٹ کا چلن عام نہیں۔

ہماری مذہبی اور فکری قیادت اس صورتحال کی اصلاح کے لیے پریشان نہیں۔ وہ پریشان ہے تو امریکہ کو نیچا دکھانے کے لیے، افغانستان، فلسطین اور کشمیر سے غیروں کو بے دخل کرنے کے لیے۔ یہ لوگ قوم کو اس کام کے لیے اٹھاتے ہیں جسے کرنے کی اُس میں طاقت نہیں اور اگر کر بھی دے تو دوسروں کی تباہی سے زیادہ اپنی تباہی بڑھتی ہے۔ اور اس کام کی طرف توجہ نہیں دیتے جو کچھ عرصے کی تربیت کے بعد باآسانی ہوسکتا ہے۔ جس کے بعد ہم پر باہر سے کوئی ظلم کر سکے گا اور نہ اندر سے۔ ہم کہتے ہیں دنیا ہمارے ساتھ عدل نہیں کرتی۔ مگر اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ کیا ہم نے اپنی قوم میں عدل نافذ کر دیا ہے۔ جب تک ہم اپنی قوم میں عدل نافذ نہیں کرتے، دنیا کبھی ہمیں عدل نہیں دے گی۔

لنکاوی کا جزیرہ

گینٹنگ ہائی لینڈ میں زیادہ تر مقامی لوگ آتے ہیں یا پھر جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے لوگ۔اس لیے کہ گرم مرطوب علاقے کےلوگوں کے لیے یہاں کا موسم انتہائی خوشگوار اور یہاں کا تھیم پارک اور کیبل کار کا تجربہ بالکل منفرد ہوتا ہے۔ اہل مغرب کے لیے ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں میں کوئی خاص کشش نہیں۔اس لیے وہ گینٹنگ میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی منزل ملائیشیا کے شمال مغربی حصے کے قریب بحرِ اینڈامن (Andaman Sea) میں واقع لنکاوی کا جزیرہ ہوتا ہے۔

لنکاوی کا جزیرہ بلاشبہ دنیا کے حسین ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ایک زمانے میں یہ علاقہ اپنے عقابوں اور ماربل کے لیے مشہور تھا۔اسی مناسبت سے اس کا نام لنکاوی وجود میں آیا جس میں دونوں الفاظ کا مفہوم شامل ہے۔اس کو حسن بخشنے والی اصل شے یہاں کے جنگل ہیں جو لاکھوں برس سے یہاں موجود ہیں۔اصطلاحاً یہ جنگل rainforest کہلاتے ہیں۔یہ اصطلاح ان جنگلوں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو بارہ مہینے بارشوں کی زد میں رہتے ہیں۔سارا سال مسلسل بارش صرف انھی علاقوں میں ہوتی ہے جو خط استوا پر واقع ہیں۔ان میں برازیل، وسطی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے شامل ہیں۔یہ جنگلات زمین کا صرف چھ فیصد حصہ ہیں مگر دنیا کے نصف نباتات وحیوانات ان میں پائے جاتے ہیں۔

لنکاوی کا جزیرہ بھی ایسے ہی جنگلات کا حامل ہے جس کو نامعلوم زمانے سے برسنے والی مسلسل بارشوں نے اتنا گھنا بنادیا تھا کہ یہاں تک رسائی آسان کام نہ تھی، نہ دنیا کے لیے یہ کوئی اہم مقام تھا۔تاہم اسّی کی دہائی میں ملائیشیا کی حکومت نے اسے ایک سیاحتی مقام بنانے کے لیے یہاں بڑے پیمانے پر ترقیاتی کام شروع کیا۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ دنیا اور خاص کر مغربی

دنیا کے لیے ایک بہت پرکشش سیاحتی مقام ہے۔

خدائی صفات کا ایک دوسرا پہلو

ہمارا ہوٹل عام عمارتوں کی طرح نہیں بنا ہوا تھا بلکہ گھنے جنگل میں کچھ فاصلے پر ہٹ (Hut) بنے ہوئے تھے۔ کچھ ہٹ سمندر کے اوپر بھی بنائے گئے تھے مگر وہ بہت مہنگے تھے۔ ہمارا قیام گھنے جنگل میں تھا۔ ہم شام کے وقت جہاز کے ذریعے سے لنکاوی پہنچے تھے۔ ہوٹل پہنچے تو گھنے جنگل میں تن تنہا ایک ایسے ہٹ میں ہم ٹھہرے جس کے اردگرد دور دور تک کوئی اور آباد نہ تھا۔ میری اہلیہ اس تصور سے کچھ وحشت زدہ ہوگئیں کہ یہاں تنہائی میں ٹھہرنا ہوگا۔ اس پر مستزاد یہ کہ کمرے میں جاتے ہی ایک گرگٹ نما بڑا جانور نکل آیا۔ خیر ہوٹل کا عملہ اسے مار کر لے گیا مگر اس کے بعد میری اہلیہ کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ پھر اگلی رات اس قدر طوفانی بارش ہوئی کہ کچھ حد نہیں جس سے کئی درخت اور ان کی شاخیں زمین بوس ہوگئیں۔ بارش اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ، شاخیں اور درخت گرنے کی آواز اور پھر مختلف جانوروں اور حشرات کی آوازوں نے رات کے وقت ایک عجیب سماں قائم کیے رکھا۔

لنکاوی کی خوبصورتی کا احساس ہمیں بعد میں ہوا۔ مگر اس سے قبل ہی جن چیزوں سے سابقہ پڑا اس نے طبیعت پر ایک خاص اثر ڈالا۔ میں ایسی چیزوں اور معاملات کو خدا کی خلاقیت کا وہ چہرہ کہتا ہوں جس کی تاب کوئی انسان نہیں لا سکتا۔ پروردگار بڑا رحیم و کریم ہے۔ مگر اس کی طاقت اتنی زیادہ اور انسان اس کے مقابلے میں اتنا کمزور ہے کہ انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ خدا کو ناراض کر کے اپنے لیے عافیت کی کوئی راہ ڈھونڈ سکے۔ آج خدا غیب میں رہ کر اپنا تعارف کرا رہا ہے۔ کل قیامت کے دن جب وہ سامنے آئے گا تو مجرموں کے لیے وہ دن بدترین دن ہوگا۔ قیامت کے دن پروردگار عالم آگ کا ناقابل برداشت عذاب جو ہر طرح کے نباتات اور

حیوانات کو جلا ڈالنے کے لیے بہت ہے، صرف سرکشوں، متکبرین اور ظالموں کو دے گا، باقی لوگوں کو وہ اگر تپتے صحراؤں اور وحشت خیز جنگلوں میں بے آسرا بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے، تب بھی یہ عذاب ان کے لیے بہت ہے۔

حسنِ فطرت کا شاہکار

بلاشبہ یہ جزیرہ حسن فطرت کا ایک پوشیدہ خزانہ ہے جہاں روزانہ درجنوں ہوائی جہاز ہزاروں لوگوں کو لے کر اترتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی جیٹی پر کشتی کے ذریعے سے بھی سیاحوں کی بڑی تعداد آتی ہے۔ 478 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا یہ چھوٹا سا جزیرہ اپنے اندر وسیع جنگلات اور جنگلی حیات کی ان گنت اقسام لیے ہوئے ہے۔ اس کا ساحل انتہائی خوبصورت اور پرسکون ہے۔ پورے جزیرے پر ساحلی پٹی کے ساتھ ہر طرح کے ہوٹل بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا ہوٹل جزیرے کے سب سے آخری سرے پر واقع تھا جس کے بعد پہاڑ آجاتے ہیں۔ ان پہاڑوں تک لے جانے کے لیے ایک کیبل کار ہے۔ پہاڑ کی چوٹی سے جزیرے کا انتہائی حسین منظر سامنے آتا ہے۔ ایک طرف تاحد نظر پھیلا ہوا سمندر ہے اور دوسری طرف سرسبز درختوں سے آراستہ دلکش پہاڑی مناظر۔ پہاڑ کی چوٹی سے غروب آفتاب کا نظارہ بے حد متاثر کن ہے۔

مجھے یہاں سب سے بڑی سہولت یہ لگی کہ گاڑی بہت ارزاں نرخ پر کرائے پر مل جاتی ہے اور پورے جزیرے پر عملاً ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے۔ روڈ بہت کشادہ اور ہموار ہیں۔ راستے بھی پیچیدہ نہیں۔ اس لیے ایک نیا آدمی باآسانی ان نقشوں کی مدد سے گاڑی چلاسکتا ہے جو ہر جگہ باآسانی مل جاتے ہیں۔ زیادہ تر راستے ساحل کے ساتھ ساتھ یا ساحل پر موجود پہاڑوں پر بنے ہوئے ہیں۔ میں اس جزیرے کے ہر حصے پر گاڑی کے ذریعے سے گیا۔ تاہم مجھے یہ اندازہ ہوا کہ جہاں میرا ہوٹل واقع تھا وہی علاقہ ہر اعتبار سے سب سے زیادہ بہتر اور دلکش

تھا۔اس جزیرے کا مرکزی قصبہ 'Kuah' اس جگہ واقع ہے جہاں جیٹی بنی ہوئی ہے۔اس جیٹی کی نشانی عقاب کا وہ بڑا سا مجسمہ ہے جو ایک پلیٹ فارم پر ایستادہ ہے۔یہیں سے وہ بوٹس ملتی ہیں جو island hopping کے لیے لے جاتی ہیں۔آئی لینڈ ہاپنگ میں ایک تیز رفتار اسپیڈ بوٹ میں بٹھا کر قریب واقع دو تین جزیروں میں لے جایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ قریبی جزائر میں عقاب اور دیگر جنگلی حیات کے مشاہدے کے لیے بھی بہت سے ٹور ملتے ہیں۔میرے خیال میں جو لوگ زندگی کے ہنگاموں سے دور رہ کر کچھ وقت سکون کے ساتھ فطرت کی نیرنگیوں میں گزارنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ جگہ بہترین ہے۔یہاں آ کر زندگی اور وقت دونوں کی رفتار تھمی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔البتہ ہر لمحہ بدلتے موسم کی آہٹیں شام و سحر کے وجود کا احساس ضرور دلا دیتی ہیں۔

سرِ بازار می رقصم

لنکاوی کا جزیرہ وہ جگہ ہے جہاں فطرت بلا مبالغہ پچھلے کئی کروڑ برسوں سے اپنے رنگ اور اپنے جلوے وقت کی رم جھم کے ساتھ برسا رہی ہے۔اس بات سے بے پروا کہ اس کے حسن کی دید کے لیے کوئی دیدہ ور یہاں آتا بھی ہے یا نہیں۔حسنِ فطرت کی یہ عجیب ادا ہے کہ وہ اپنے جلوے بکھیرنے کے لیے کبھی عشاق کی محفل کا انتظار نہیں کرتی۔اسے اپنی بے حجابی کے لیے انسانی دید سے زیادہ سورج کی نگاہِ روشن اور تاروں کی جگمگاتی نظر کا انتظار رہتا ہے۔اسے رونق سے زیادہ ویرانی اور شہرت سے زیادہ گمنامی پسند ہے۔

حسنِ بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
شہر سے ہوں بن جو پیارے تو شہر اچھے کہ بن

مجھے چار سو پھیلے اس حسن کو دیکھ کر بار بار یہ احساس ہوا کہ یہ حسن تو خودکسی اور حسین کی زلفوں کا

اسیر ہے۔ اُس حسنِ ازل کی ایک نظر کے لیے کروڑوں سال سے یہ بے خودی کے عالم میں رقص کیے جا رہا ہے۔ مگر اس قاتل ادا نے ابھی تک پلٹ کر حسن فطرت کو نہیں دیکھا۔ وہ تو کسی اور کے رقص کا منتظر ہے۔ کسی صاحبِ شعور، صاحبِ اختیار، صاحبِ اقتدار کے رقصِ بندگی کا۔ جس کی آنکھوں سے نکلنے والا ایک قطرۂ ناچیز اسے فطرت کی ہزار بارشوں سے زیادہ عزیز ہے۔ جس کی تسبیح و تمجید کا ایک گیت فطرت کے ہزار سُروں سے زیادہ سریلا ہے، جس کی عبدیت کا ایک رنگ فطرت کے ہزار رنگوں سے زیادہ خوش نما ہے۔ جس کی اٹھی ہوئی خدا آشنا نظر ہر پہاڑ کی بلندی سے بلند تر ہے اور جس کی جھکی ہوئی پیشانی زمین اور سمندر کی ہر وسعت سے زیادہ عریض ہے۔ اس لیے کہ وہ صاحبِ شعور ہو کر رقصِ بندگی کرتا اور صاحبِ جنوں ہو کر حدودِ آشنائی میں جیتا ہے۔ فطرت کا رقص بہت حسین ہے۔ مگر بندگی کا رقص حسین تر ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک بادشاہ کا رقصِ عبدیت ہے۔ یہ رقص ایمان سے شروع ہوتا اور معرفت کی روشنی پا کر اپنے جوبن پر آتا ہے۔ یہ رقص جو دل کی محفل کو آباد کرتا ہے، سانسوں کی مالا میں یادِ الٰہی کے موتی پروتا، آنسوؤں کی لڑی بنتا اور آخر کار عبد کو معبود سے ہم کلام کر دیتا ہے:

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم
مگر نازم با ایں ذوقے کہ پیش یار می رقصم
بیا جاناں تماشا کن کہ درانبوہ جانبازاں
بصد سامان رسوائی سرِ بازار می رقصم

(مجھے نہیں معلوم کہ میں (اپنے دوست کے) دیدار کے وقت رقص کیوں کرنے لگتا ہوں۔ مگر مجھے اس پر فخر ہے کہ میرا رقص صرف اپنے دوست کے سامنے ہی ہوتا ہے۔

میرے محبوب آؤ اور یہ تماشہ تو دیکھو کہ تمھارے جانبازوں کے گروہ میں سے میں ہوں

جو اپنی رسوائی کا ہزار سامان کیے سر بازار رقص کر رہا ہوں)

انگریز خاتون اور ملائیشیا میں فروغِ اسلام

لنکاوی میں قیام کے دوران میں ایک روز ہم ''Seven Wells'' گئے۔ یہ پہاڑی ندی سی تھی جہاں پہاڑوں سے آنے والا پانی سات چھوٹے چھوٹے تالابوں کی شکل میں جمع ہوتا اور پھر ایک آبشار کی شکل میں بلندی سے نیچے گرتا ہے۔ اسے دیکھنے کے لیے کافی بلندی پر سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا ہے۔ یہ راستہ ایک جنگل سے گزرتا ہے اور اس وقت وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہم جیسے ہی وہاں پہنچے انتہائی تیز بارش شروع ہوگئی۔ مقامی انتظامیہ نے وہاں ایسے ہی حالات کے لیے چند جگہیں بنا رکھی تھیں جن پر چھت ڈلی ہوئی تھی۔ ہم نے جس جگہ پناہ لی وہاں ایک انگریز خاتون بھی موجود تھیں۔ کچھ دیر میں ان سے گفتگو کا آغاز ہو گیا جو کافی دیر تک جاری رہا۔

ان کا تعلق لندن سے تھا اور یہ ملائیشیا میں بغرضِ ملازمت مقیم تھیں۔ یہ ایک برطانوی یونیورسٹی سے وابستہ تھیں اور داخلے کے خواہشمند، اس خطے کے طلبا کا انٹرویو کرتی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے یہ پاکستان بھی آ چکی تھیں۔ ایسی ملاقاتوں میں میرا مقصد ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ غیر محسوس طریقے پر اسلام کا تعارف لوگوں تک پہنچاؤں۔ اس لیے کافی دیر مقامی، مغربی اور پاکستانی حالات پر گفتگو کرنے کے بعد میں انھیں مذہب کے موضوع پر لے آیا۔

وہ خاندانی اعتبار سے کیتھولک تھیں۔ مگر مغرب کے عام پڑھے لکھے افراد کی طرح مذہب سے بالکل غیر متعلق۔ بس خدا کا نام سن رکھا تھا۔ اسلام کا تعارف بس دہشت گردی کے حوالے ہی سے تھا۔ زیادہ دلچسپی بدھ مت سے تھی جس کا ظاہری دھوم دھڑکا (اس کی کچھ جھلکیاں بینکاک میں دیکھیں اور اس سے قبل سری لنکا کے سفر میں میں دیکھ چکا تھا) انھیں بہت پسند تھا۔ انھیں

مذہبی لوگوں کے اس تصور سے سخت وحشت تھی کہ تمام انسان جہنم میں جائیں گے سوائے اپنے لوگوں کے۔ مجھے یہی دروازہ نظر آیا جس کے ذریعے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف ان تک کروایا جاسکتا تھا۔ میں نے اس حوالے سے ان کے سامنے قرآن کی آیت رکھ دی جس میں نجات کا پیمانہ کسی خاص گروہ سے وابستگی نہیں بلکہ توحید اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح کو قرار دیا گیا تھا۔ پھر اسلام سے متعلق کچھ اور چیزیں بھی ان کے سامنے رکھ دیں۔ اس طرح کی ابتدائی گفتگو میں صرف اسلام کا مختصر تعارف ہی کروایا جاسکتا ہے جو میں نے کروانے کی کوشش کی اور میری باتیں انہوں نے توجہ سے سنیں۔

دو گھنٹے بعد بارش ختم ہوئی تو وہ رخصت ہوگئیں۔ مگر اپنے پیچھے یہ سوال چھوڑ گئیں کہ آخر کب مسلمان اپنی دعوتی غفلت سے بیدار ہو کر توحید و آخرت پر مبنی لائی ہوئی خاتم النبیین کی دعوت انسانیت کے سامنے پیش کریں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب تک مسلمان یہ نہیں کریں گے اسی طرح غیر مسلموں سے پٹتے رہیں گے۔ ملائیشیا وہ جگہ ہے جو اسلام کی دعوتی قوت کا زندہ ثبوت ہے اور جہاں مسلمان تاجروں نے بغیر جنگ و فتح کے اس علاقے کو مفتوح کیا تھا۔

ملائیشیا سے رخصتی

ملائیشیا میں ہم دس دن رہے جن میں سے آخری چار دن لنکاوی میں ایسے گزرے کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اور آخر کار وہ وقت آیا کہ ہم کوالالمپور کے انتہائی جدید اور شاندار ائیر پورٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ہر اعتبار سے ایک ترقی یافتہ ملک کا ائیر پورٹ لگ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ ملائیشیا نے ایک مسلم ملک ہوتے ہوئے اتنی ترقی کرلی۔ حالانکہ یہ وہ خطہ ہے جہاں مقامی ملائی نسل کے مسلمانوں کے علاوہ جن کا آبادی میں تناسب 58 فیصد ہے، چینی اور انڈین بھی موجود ہیں جن کا تناسب بالترتیب 24 اور 8 فیصد ہے۔ باقی دس فیصد دیگر لوگ ہیں۔

چینی نسل کے لوگ زیادہ دولتمند اور خوشحال ہیں اور ان میں اور مقامی مسلمانوں میں کچھ اختلافات بھی ہیں تاہم اس کے باوجود اس ملک نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس کا اندازہ بلندو بالا تعمیرات سے بھی ہوتا ہے اور اس کوالالمپور کی مونوٹرین میں بیٹھ کر بھی جو بلند ستونوں پر بنے فضائی ٹریک پر جب چلتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ ان کی یہ ترقی عالمِ اسلام کے لیے ایک لائقِ تقلید چیز ہے۔ اس لیے کہ ان کی اس ترقی کے باوجود انھوں نے اپنے مذہب، تہذیب اور روایات سے رشتہ نہیں توڑا۔ جن بعض اخلاقی مفاسد کا پیچھے میں نے ذکر کیا ہے، میرا خیال ہے، اس کا ایک سبب یہاں غیر مسلموں اور چینی تہذیب کے لوگوں کا بہت بڑی تعداد میں ہونا ہے۔

میں ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ کبھی وہ وقت بھی آئے گا جب ہمارا ملک ترقی کے اس سفر کا آغاز کر سکے گا؟ میرے دل نے جواب دیا وہ وقت ضرور آئے گا۔ لیکن اس سے قبل ہمارے لوگوں کو اپنی قیادت کو بدلنا ہوگا۔ یا کم از کم اسے یہ بتانا ہوگا کہ اب کسی مفاد پرست شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جذباتی باتیں کر کے لوگوں کو بیوقوف بنا سکے۔

عظیم امکان اور ہماری کوتاہی

ہمارے سفر کی اگلی منزل تھائی لینڈ کا شہر بینکاک تھا۔ تھائی لینڈ کا ملک فطری حسن سے مالا مال ہے۔ تھائی لینڈ کی آمدنی کا ایک بڑا انحصار سیاحت کے ذریعے کمایا جانے والا پیسہ ہے۔ سیاحت یہاں کتنی زیادہ اہم ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تھائی لینڈ کی کل آبادی چھ کروڑ سے کچھ اوپر ہے جبکہ یہاں آنے والے سیاحوں کی تعداد 2007 میں آٹھ کروڑ سے اوپر تھی۔ جبکہ سیاحت کے شعبہ سے ہونے والی آمدنی سولہ ارب ڈالر ہے۔ جو کہ اس کی اہم ترین برآمدات یعنی کمپیوٹر، گارمنٹ وغیرہ کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ ہے۔

معاملہ صرف تھائی لینڈ کا نہیں بلکہ سنگاپور اور ملائیشیا کا بھی یہی معاملہ ہے۔ سنگاپور کی آبادی 50 لاکھ سے بھی کم ہے، مگر 2007 میں آنے والے سیاحوں کی کل تعداد 97 لاکھ اور اس شعبے سے ہونے والی آمدنی 13.8 بلین ڈالر رہی۔ جبکہ ملائیشیا کی آبادی دو کروڑ چالیس لاکھ ہے اور سن 2007 میں آنے والے سیاحوں کی تعداد دو کروڑ دس لاکھ رہی اور ان سے ہونے والی آمدنی 15 بلین رہی۔

ان اعداد و شمار کو دیکھیے اور پاکستان کی ان خصوصیات کو ذرا ذہن میں رکھیے جن کا تذکرہ میں پیچھے کر چکا ہوں۔ پاکستان بلا مبالغہ سالانہ کروڑوں سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جس سے اربوں ڈالر کی سالانہ آمدنی ہوسکتی ہے۔ مگر ہم اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس امکان سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

ریڈ لائٹ سٹی

بینکاک ایک کڑور کی آبادی کا شہر ہے۔ یہ سیاحوں کے لیے دنیا کے مقبول ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اس کا ایک سبب تھائی لینڈ کے قدرتی حسن کے علاوہ یہ ہے کہ بینکاک شاپنگ کا ایک بہت بڑا عالمی مرکز ہے۔ یہاں بڑے بڑے اور خوبصورت شاپنگ سینٹرز ہیں جن میں دنیا بھر کی چیزیں کثرت سے ملتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے اس ملک کی اصل وجہ شہرت کچھ اور ہے۔ تھائی لینڈ فحبہ گری کے لیے ایک بدنام ملک ہے اور بہت سے سیاح صرف اسی مقصد کے لیے اس ملک میں آتے ہیں۔

فحبہ گری دنیا بھر میں عام ہے۔ عالم اسلام کے ممالک بشمول پاکستان کا بھی اس میں کوئی استثنا نہیں۔ ملائیشیا میں دو کال گرل کے سرِ راہ نظر آنے کا قصہ میں پیچھے بیان کر چکا ہوں۔ سنگاپور میں ایک پورا علاقہ ریڈ لائٹ ایریا کے طور پر وقف ہے۔ مگر بدقسمتی سے بینکاک کا پورا شہر ریڈ

لائٹ سٹی ہے اور یہ اعزاز دنیا کے کم ہی شہروں کو حاصل ہوگا۔ یہ بات اس پس منظر میں بڑی عجیب لگے گی کہ تھائی لینڈ میں سرکاری طور پر قحبہ گری پر پابندی ہے۔تاہم عملاً اس پابندی کا کوئی وجود نہیں۔ حکام جان بوجھ کر اس دھندے سے آنکھیں بند کیے رکھتے ہیں۔ غالباً انہیں خود بھی احساس ہے کہ زرمبادلہ کمانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔اس پیشے کے فروغ کا سبب بھی تھائی لینڈ کی غربت ہے،غریب طبقے کی دیہاتی لڑکیوں کے لیے پیسہ کمانے کا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔

ہوٹل اور مختلف جگہوں پر ملنے والے بروشرز سے اندازہ ہوا کہ انفرادی طور پر اور اداروں کی شکل میں یہ بیماری ہر ممکنہ طریقے سے یہاں پھیلی ہوئی ہے۔ نائٹ کلب،شراب خانے اور خاص کر مساج سینٹر میں دراصل یہی کام ہورہا ہوتا ہے۔شاید انسانی فطرت میں بدکاری کے خلاف جو ایک فطری رکاوٹ ہے، اسے توڑنے کے لیے یہ ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ مذہب سدِ ذریعہ کے اصول پر ہر اس چیز سے روکتا ہے جو برائی کے قریب لے جانے کا سبب بنے اور یہاں ہر وہ ممکن ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے جس کے ذریعے سے لوگ اس برائی کے قریب آسکیں۔ ملائیشیا کے ذکر میں لکھ چکا ہوں کہ سیاحوں کے پیروں میں پیدل چل کر درد ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہاں قدموں کے مساج کرنے والے ہر جگہ نظر آئے۔لیکن پیروں کا یہ مساج جسم کا مساج کروانے کی خواہش تک پہنچتا ہے اور یہاں سے بدکاری کی منزل فاصلوں کی مسافت پر نہیں بلکہ خواہش کے چند کمزور لمحوں کی مسافت پر رہ جاتی ہے۔ وہ کمزور لمحے جو انسان کو ابدی ذلت اور رسوائی میں مبتلا کرسکتے ہیں۔

مجھے سب سے زیادہ دکھ ان لڑکیوں کو دیکھ کر ہوا جو اپنا گریبان چاک کیے دوسرے کا دامن چاک کرنے کے ارادے سے سرراہ کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ میں نے ان کے چہرے کو غور سے

دیکھا۔ اس پر کسی خوشی، سکون اور اطمینانیت کا نشان تک نہیں تھا۔ بارہا ایسی لڑکیاں غیرملکی سیاحوں کے ساتھ جاتی ہوئی نظر آئیں اور یہ حسن ظن رکھنے کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان کی بیویاں تھیں۔ کئی جگہ راستے میں ایجنٹ تصاویر کے البم لیے سیاحوں کو روکتے ہوئے نظر آئے۔ ان ساری چیزوں کی وجہ سے بینکاک میں میرا دل بجھا بجھا سا رہا۔ جوان لڑکیوں کو سر بازاریوں بکنے کے لیے کھڑا دیکھ کر مجھ پر تاسف کی غیر معمولی کیفیت طاری ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری اولاد کو بازار میں لاکر اس طرح کھڑا کر دیا گیا ہے۔ میں سوائے اللہ تعالیٰ سے دعا کے اور کچھ بھی نہیں کرسکا۔

زنااورایمان

کہا جاتا ہے کہ زنا اور بدکاری دنیا میں اتنے ہی قدیم ہیں جتنا انسان، مگر دورِ جدید میں بدکاری اور عریانی کا چلن اتنا عام ہوگیا ہے کہ تاریخ میں جس کی مثال نہیں ملتی۔ میرے نزدیک یہ ایمان کی بنیاد پر قائم تہذیب کی شکست کا براہ راست نتیجہ ہے۔ دراصل سیدنا ابرھیم کے زمانے یعنی پچھلے چار ہزار برسوں سے دنیا پر وہ اقدار حکمران تھیں جو اہل کتاب نے قائم کی تھیں۔ ان اقدار میں زنا کو کسی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مگر ایمان اور مذہب کے خاتمے کے بعد اب زنا کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

آج عریانی کو ایک تہذیبی قدر اور زنا کو آزادی کا فطری نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ آزادی کے متوالے انسان سب سے پہلے جنسی آزادی چاہتے ہیں۔ سود پر مبنی جدید معیشت جس میں ہر چیز فروختنی ہے، عورتوں کی سب سے بڑی خریدار ہے۔ دوسری طرف اقدار کی موت کے بعد عورتیں بھی جان چکی ہیں کہ ان کا سب سے بڑا اثاثہ ان کا جسم ہے اور جس کی نقد قیمت جب چاہیں جہاں چاہیں وہ وصول کرسکتی ہیں۔ چناچہ بدکاری کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔ مگر چونکہ یہ فطرت

کے قانون کی خلاف ورزی ہے اس لیے انسانیت اس کی سزا کبھی Sexually Transmitted Dieseases اور ایڈز کی شکل میں بھگتتی ہے اور کبھی خاندانی نظام کے ٹوٹنے، ناجائز بچوں اور سنگل پیرنٹ فیملی جیسے مسائل کی شکل میں پاتی ہے۔ رہے تھائی لینڈ جیسے غریب ملک تو اس کنزیومر ایج میں جب خواہش پوری کرنا انسانی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہے، ان کا مقدر یہی ہے کہ ان کی خواتین سر بازار بکیں اور دنیا بھر سے گاہک آ آ کر ان کی بولی لگائیں۔

میرے نزدیک آج کرنے کا اصل کام لوگوں کو زنا چھوڑنے کی دعوت دینا نہیں، دعوتِ ایمان دینا ہے۔ مجھے بینکاک میں گھومتے ہوئے بدھ مت کے ان ماننے والوں کے درمیان بار بار یہ خیال آیا کہ ان لوگوں نے خدا کو کھونے کے بعد گوتم بدھ اور بکھشوؤں کو اپنا معبود بنالیا۔ مذہب کے نام پر ظاہری دھوم دھڑکے کا سہارا لیا۔ روحانی سکون کے لیے بت پرستی کو اختیار کرلیا۔ مگران کے ہر مرض کی اصل دوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔ حضور کو دوبارہ آنا نہیں ہے۔ کام تو سارا امتیوں کو کرنا ہے۔ مگر امتی کیا کر رہے ہیں وہ سب جانتے ہیں۔ یہی کچھ یہودیوں نے کیا اور اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کیں تو اس کی سزا رومی حکومت کے ہاتھوں بھگت لی۔ یہی کچھ مسلمان سوچ رہے ہیں اور اپنے حصے کی سزا بھگت رہے ہیں اور اندیشہ یہ ہے کہ آئندہ آنے والے دنوں میں زیادہ بھگتیں گے۔

لوٹ کر جانا ہے

بینکاک شہر اور اس ملک میں بہت سی جگہیں ہیں جو قابل دید ہیں۔ لیکن بینکاک آ کر طبیعت میں ایک نوع کا انقباض پیدا ہو گیا۔ میری طبیعت ہوٹل سے باہر نکلنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس لیے میں زیادہ تر اہلیہ کا ساتھ دینے کے لیے باہر گیا۔ یہاں کے شاپنگ سنٹر دیکھے، بدھ مت کی رسومات

دیکھیں، بنت حوا کو بکتا دیکھا۔ یہاں کے اس ماحول نے میرے شعور کی اس آنکھ پر شدید اثر ڈالا تھا جو دوران سفر بیدار ہو جاتی تھی۔ خدا کی دنیا بلا شبہ بہت حسین ہے، مگر اس دنیا کے اندر انسانوں نے اپنی جو دنیا تخلیق کی ہے اس میں مادیت، حیوانیت، شرک اور خدا فراموشی نے مل کر وہ آلودگی پیدا کر دی ہے جس میں کسی خدا پرست کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مگر بینکاک کیا یہ تو اب عالمی کلچر بنتا جا رہا ہے۔ لیکن یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ اس چیز کا اعلان ہے کہ خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے توحید اور انسانیت پر مبنی جو عالمی انقلاب برپا کیا تھا وہ ختم ہو رہا ہے۔ اس لیے اب وہ وقت آ رہا ہے کہ دنیا کو ختم کر دیا جائے۔ اس زمین کا انتظام انسانوں کے ہاتھوں سے لے کر فرشتوں کو دے دیا جائے۔

یہ ہونے جا رہا ہے۔ یہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ البتہ اس روز عدل کے آنے سے پہلے خدا اپنے عدل کے تقاضوں کے تحت انسانیت کو آخری دفعہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ مسلمانوں نے یہ کام نہیں کیا۔ وہ قومی لڑائیوں میں لگ گئے۔ لیکن خدا ان کا محتاج نہیں۔ اس نے انفارمیشن ایج کا آغاز کر دیا۔ فاصلوں کو سمیٹ دیا۔ علم کی تجدید کر دی۔ دینِ خالص کو واضح کر دیا۔ اس کے ابلاغ کے ذرائع جنم دے دیے۔ اپنا کام کرنے والے پیدا کر دیے۔ آج فیصلہ کن ابلاغ کا کام شروع ہو گیا ہے۔ خدا کا تعارف عام ہو رہا ہے۔ اس سے ملاقات کی تنبیہ کی جا رہی ہے۔ اس کے رسول اور آخرت کی حجت پوری کی جا رہی ہے۔ جس روز یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے گا اسرافیل اللہ اکبر کہہ کر صور پھونکیں گے۔ زلزلۂ قیامت برپا کر دیا جائے گا۔ سمندر ابل پڑیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا۔ ستارے بکھیر دیے جائیں گے۔ سورج تاریک ہو جائے گا۔ پہاڑ کوٹ کوٹ کر برابر کر دیے جائیں گے۔ شہر برباد ہو جائیں گے۔ بستیاں ویران ہو جائیں گی۔ انسانیت پر موت طاری ہو جائے گی۔ زندگی ختم ہو جائے گی......زندگی ختم ہو جائے گی۔

پھر صور پھونکا جائے گا۔ زندگی شروع ہو جائے گی۔ زمین کو دلہن کی طرح سجایا جائے گا۔ جہنم کو دہکایا جائے گا۔ شعلوں کو بھڑکایا جائے گا۔ انسانوں کو جمع کیا جائے گا۔ حشر کا دربار سجا دیا جائے گا۔ میزان عدل نصب کیا جائے گا۔ حساب کتاب شروع ہوگا۔ فرد فرد کو بلایا جائے گا۔ لمحے لمحے کا حساب ہوگا۔ حکمرانوں کی پکڑ ہوگی۔ دولتمندوں کا حساب ہوگا۔ متکبروں کو گھسیٹ کر ذلیل کیا جائے گا۔ سرکشوں کو جہنم رسید کیا جائے گا۔ مفسدوں اور غافلوں کو ان کے انجام تک پہنچایا جائے گا۔ عمل کرنے والوں کو عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔ صبر کرنے والوں کو صبر کا بدلہ دیا جائے گا۔ خدا والوں کو خدا کا قرب دیا جائے گا۔ ابدی بادشاہی شروع ہوگی۔ جنت کے محل آباد ہوں گے۔ حوروں کے خیمے شاداب ہوں گے۔ جنت کے بازاروں میں رونق ہوگی۔ فردوس کی بستی رنگ و نور کی بارش میں ڈوب جائے گی۔ اندھیرے ختم ہو جائیں گے۔ روشنی پھیل جائے گی۔ خواب ختم ہو جائیں گے۔ تعبیر سامنے آجائے گی۔ زندگی سامنے آجائے گی۔ زندگی شروع ہو جائے گی......زندگی شروع ہو جائے گی۔

بینکاک میں میں چار دن مردہ دلی کے عالم میں رہا۔ خواب دیکھتا رہا۔ اس لیے کہ خواب زندگی کی علامت ہے۔ انھی خوابوں کے ساتھ بینکاک سے زندگی کی امید لیے واپس اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا۔ اس امید پر کہ کبھی اپنے حقیقی وطن کی طرف بھی زندگی کی امید پر لوٹ کر جانا ہوگا۔

جب زندگی شروع ہوگی

مصنف: ابو یحییٰ
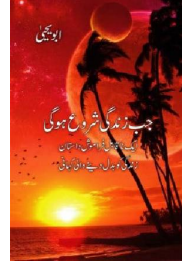
☆ ایک ایسی کتاب جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا

☆ ایک ایسی تحریر جسے لاکھوں لوگوں نے پڑھا

☆ ایک ایسی تحریر جس نے بہت سی زندگیاں بدل دیں

☆ ایک ایسی تحریر جو اب ایک تحریک بن چکی ہے

☆ آنے والی دنیا اور نئی زندگی کا جامع نقشہ ایک دلچسپ ناول کی شکل میں

☆ ایک ایسی تحریر جو اللہ اور اس کی ملاقات پر آپ کا یقین تازہ کر دے گی

☆ علم و ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

قسم اُس وقت کی

مصنف: ابو یحییٰ
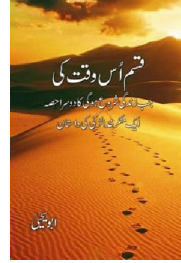
”جب زندگی شروع ہوگی“ سے شروع ہوئی کہانی کا دوسرا حصہ

☆ ایک ایسی کتاب جس نے کفر کی طرف بڑھتے کئی قدموں کو تھام لیا

☆ ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر جو سچ تلاش کرنے نکلی تھی

☆ ایک خدا پرست کی کہانی جس کی زندگی سراپا بندگی تھی

☆ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور روز قیامت کا ناقابل تردید ثبوت

☆ رسولوں کی صداقت کا نشان دور رسالت کی زندہ داستان

☆ کفر والحاد کے ہر سوال کا جواب ہر شبہے کا ازالہ

☆ ایک ایسی کتاب جو آپ کے ایمان کو یقین میں بدل دے گی

☆ ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ”جب زندگی شروع ہوگی“ کا دوسرا حصہ

آخری جنگ

مصنف: ابو یحییٰ
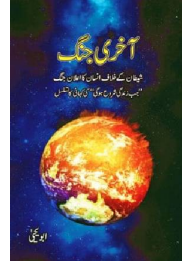
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا تیسرا حصہ

- ☆ جب زندگی شروع ہوگی کی کہانی کا دلچسپ تسلسل
- ☆ شیطان اور انسان کی ازلی جنگ کا آخری معرکہ
- ☆ شیطانی طاقتوں کے طریقہ واردات کا دلچسپ بیان
- ☆ شیطان کے حملوں کو ناکام بنانے کے موثر طریقے
- ☆ مسلمانوں کے عروج کا وہ راستہ جو قرآن مجید بتاتا ہے
- ☆ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کا حقیقی راستہ
- ☆ تاریخ کے وہ اسباق جو مسلمان بھول چکے ہیں
- ☆ یہ سب کچھ عبداللہ اور ناعمہ کی داستان کی شکل میں پڑھیے

خدا بول رہا ہے

مصنف: ابویحییٰ
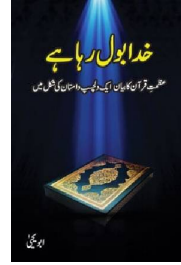
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا چوتھا حصہ

☆ ''جب زندگی شروع ہوگی'' کی کہانی کا ایک نیا پہلو

☆ جنت میں عبداللہ کی اپنے والدین سے ملاقات کی روداد

☆ عظمتِ قرآن کا بیان، ایک منفرد ناول کی شکل میں

☆ ایک باوفا شخص کے اوراق حیات جس کی دنیا لٹ گئی تھی

☆ ایک نوعمر لڑکی کی داستان جو دنیا کو اپنی جنت بنانا چاہتی تھی

☆ قرآن کی تاثیر کا بیان جس نے ان دونوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں

☆ قرآن کی دعوت کو سمجھنے اور سمجھانے کا انوکھا انداز

☆ وہ کہانی جس کا اختتام جانتے ہوئے بھی آپ اسے ختم کیے بنا نہیں رہ سکتے

☆ ایک اچھوتے اور منفرد انداز میں قرآن مجید کا تعارف

قرآن کا مطلوب انسان

مصنف: ابو یحییٰ
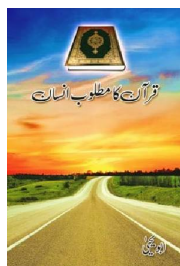
☆ قرآن مجید پر مبنی اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام

☆ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں

☆ وہ کن لوگوں کو جنت عطا کریں گے

☆ کون سے اعمال انہیں ناراض کر دیتے ہیں

☆ ان کی پسند اور ناپسند کا راستہ کیا ہے

☆ اللہ تعالیٰ کی مرضی ان کے اپنے الفاظ میں جاننے کا منفرد ذریعہ

☆ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین اخلاق نبوی کا قرآنی نمونہ

☆ ابو یحییٰ کی ایک منفرد تصنیف

www.inzaar.pk

تیسری روشنی

مصنف: ابو یحییٰ
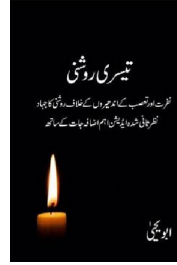
☆ ابو یحییٰ کی داستان حیات ۔ تلاش حق کی سچی کہانی

☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب

☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان

☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف

☆ ابو یحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

بس یہی دل

مصنف: ابو یحییٰ
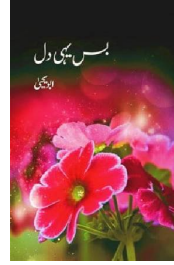
☆ دل کو چھو لینے والے مضامین

☆ ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

☆ آنکھوں کو نم کر دینے والے الفاظ

☆ ابو یحییٰ کے قلم سے نکلے ہوئے وہ مضامین جو ایمان و اخلاق کی اسلامی دعوت کا بھرپور اور موثر بیان ہیں۔

☆ دلنشین اسلوب میں لکھی گئی ایسی تحریریں جنھیں پڑھ کر آپ دل کے دروازے پر ایمان کی دستک سن سکیں گے۔

حدیثِ دل

مصنف: ابو یحییٰ
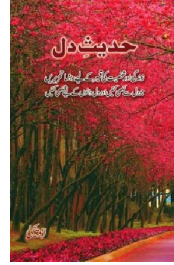
مجموعہ مضامین جس میں آپ پائیں گے اپنی

☆ شخصیت کی تعمیر

☆ اخلاق کی اصلاح

☆ ایمان کی تازگی

☆ اقدار کی زندگی اور

☆ افکار کی تشکیل نو

☆ ہمیشہ کی طرح ابو یحییٰ کے الفاظ کی دستک آپ اپنے دل کے دروازے پر محسوس کریں گے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ

مصنف: ابو یحییٰ

☆ مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

☆ کینیڈا، امریکہ کی زندگی کا تفصیلی جائزہ

☆ مکہ، مدینہ کی مقدس سرزمین اور سعودی عرب کا احوال

☆ سری لنکا، تھائی لینڈ، ملائیشا اور سنگاپور کی زندگی کا نقشہ

☆ مغرب اور مشرق کے ممالک کا تقابل اور اسلام کی علمی برتری کا بیان

☆ مغربی تہذیب کی کمزوریوں نظام کی خوبیوں کا بے لاگ جائزہ

☆ سات ممالک کے اہم قابل دید مقامات کی دلچسپ منظر کشی

☆ سفرنامے کے اسلوب میں لکھی گئی ایک اہم فکری کتاب

سیرِ ناتمام

مصنف: ابویحییٰ
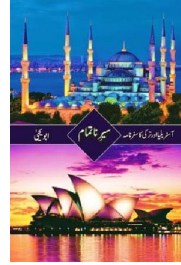
☆ آسٹریلیا کی نئی دنیا کے تمام اہم شہروں کے دعوتی سفر کی روداد

☆ مغرب اور مشرق کے سنگم ترکی کا آنکھوں دیکھا حال

☆ جدید اور قدیم دنیا کے تفریحی مقامات کی دلچسپ سیر

☆ سترہ صدیوں تک دنیا کا مرکز رہنے والے استنبول کی کہانی

☆ احوال سفر کے دلچسپ مشاہدات، معلومات اور نئی چیزوں کا تعارف

☆ ابویحییٰ کے دلچسپ اور پرمغز تجزیے، تنقید اور تبصرے

☆ ہر قدم پر تاریخ کے اسباق اور جدید و قدیم دنیا کا تعارف

☆ آپ کے وژن اور طرز فکر کو نیا انداز عطا کرنے والی کتاب

☆ ایک داستان سفر جو سفر سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے

ملاقات

مصنف: ابو یحییٰ
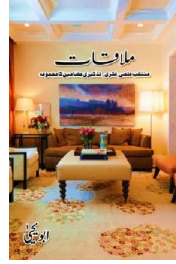
- ☆ اہم علمی، اصلاحی اور اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب
- ☆ کریم اور رحیم کا خطاب پانے والے انبیا کی دلنواز سیرت کا بیان
- ☆ دین کی حقانیت اور دعوت دین کے اہم پہلوؤں کی وضاحت
- ☆ قیامت اور قرب قیامت کے اہم احوال کی تفصیل
- ☆ اہم معاشرتی اور خاندانی مسائل کے حل کے لیے رہنما تحریریں
- ☆ لونڈیوں سے تعلقات کے ضمن میں اسلام کے موقف کی وضاحت
- ☆ مسائل زندگی کے حل کے لیے رہنما تحریریں
- ☆ ہم جنسی تعلقات اور ارتقا جیسی عملی اور فکری گمراہیوں کی موثر تردید

When Life Begins

English Translation of Abu Yahya's Famous book **Jab Zindagi Shuru Ho Gee**
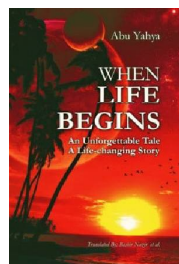
A Book that created ripples through out the world

A Writing that was read by Millions

A Book that changed many Lives

A Writing that has become a Movement

A Comprehensive sketch of the World and Life in Hereafter in the form of an interesting Novel

A Book that will strengthen your Faith in God and Hereafter

The first book of its kind in the world of Literature